

فہرست

۹	تارڑ صاحب اکو بخارے
۱۳	گھوڑے جنگ نہیں کرتے
۱۷	لنڈن کی کاٹ اور موچی دروازے کی تنگ
۲۱	تارڑ صاحب سبحان اللہ
۲۸	میں ایک میاؤں ہوں
۳۳	ہور سناؤ کی حال چال اسے؟
۳۹	ماسٹر اور ٹیچر میں فرق ہوتا ہے
۴۶	چلو چلو پہاڑوں پر چلو
۵۳	لاہوری عمارت سے... اوہ آئے!
۵۹	ملک ملک کے نانی... سوری بار بار
۶۹	آسان نادل نویسی عرف ڈبوندہ اور
	شمشیر بھائی جان
۷۴	ہمیرے حاصل کرنے کا آسان طریقہ
۷۹	مردہ کاروبار
۸۷	چند بوڑھے لڑکے
۹۳	ہینڈ اینڈ لیگزان امریکہ

۲۰۵	مرغ مسٹر ٹوپی
۲۰۹	گیوگی
۲۱۳	کالے کبوتر سفید کبوتر
۲۱۷	بائی پاس کے آس پاس
۲۲۱	گیشیر پھلانے کا صحیح طریقہ
۲۲۴	یہ گدھوں کے میلے کم نہ ہوں گے
۲۲۷	تم نور جہاں ہو؟
۲۳۱	یہ کیا ہے؟ کتنے کا ہے؟
۲۳۶	پینڈک خوری اور بیگ صاحب
۲۴۰	بکرا بخار
۲۴۳	لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟
۲۵۰	ابن کبیر فروشان کی حلفت برداری
۲۵۳	اوٹ بھائی جان کا چالان ہوگا
۲۵۷	بہتہ گز میں
۲۶۱	گنا اخلاقیات
۲۶۵	خوشگوار، شادی شدہ زندگی اور تاریخی ہویاں
۲۷۰	لنچ کھیلیں
۲۷۶	ازن اٹ لولی
۲۷۹	سانپوں کا ادبی حل
۲۸۷	آکٹوپس کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟
۲۹۱	میرا بہترین دوست غلام رسول

۱۰۰	لاہور کی تاریخی خوراکیں
۱۰۶	”پھیڑ“ کرلے سے چلی جائے اسد
۱۱۳	خدا گننے سے خود پوچھے
۱۱۸	میں لوٹا نہیں ہوں
۱۲۲	میں بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں
۱۲۶	آستینوں کے بت
۱۳۰	پلنگ شرتوڑ اور چور بیگمات
۱۳۷	ہیجرے اور شہزادے
۱۴۱	بوسنے والا گھوڑا
۱۴۵	تھرو اوے
۱۴۹	ٹریفک جیم
۱۵۳	مجھے کھینچ کر لمبا کر دو
۱۵۷	کوفتوں والی بجا بھی
۱۶۱	شوٹہ ایک سفید چوہا
۱۶۵	ایک حالیہ سروے کے مطابق
۱۶۸	انشورنس کی گدھا سیکم
۱۷۳	بچے بھوں گے تو طوطے بھوں گے
۱۷۶	چوہا نیت اور انسانیت
۱۸۵	منے کی سالگرہ مبارک
۱۹۱	آئی بسنت
۱۹۹	تازہ ترین ماڈل کے شتر مرغ

کا باڈی کا باڈی
میں ادنیٰ اللہ ہو گیا ہوں
دس ہزار کی کال
گزارا نہیں ہوتا

۲۹۵

۲۹۶

۳۰۰

۳۰۵

تارڑ صاحب آلو بخارے

”تارڑ صاحب آلو بخارے“ کسی راہگیر نے آواز اٹھایا۔
میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا کہ پتہ نہیں کون نا بخارے ہے جو دن
دباڑے مجھے آلو بخارے کے لقب سے نوازا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کر
سکتا تھا کہ موٹر سائیکل روکتا اور فنٹ پاتھ پر چلتے لوگوں سے دریافت کرتا کہ صاحبو
آپ میں سے وہ کون بدتمیز شخص ہے جس نے راہ چلتے مجھے آلو بخارہ کہا ہے اول
تو سب لوگ مسکراتے اور ان میں وہ شخص بھی شامل ہوتا جس نے مجھے اس القاب
سے نوازا تھا اور ظاہر ہے مسکراتے ہی چلے جاتے اور اگر بفرض محال وہ شخص اپنے
جرم کا اقرار کر بھی لیتا تو میں اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا، یہی کہہ سکتا تھا کہ بھئی آپ
کو شرم نہیں آتی ایک شریف آدمی کو آلو بخارہ کہتے ہوئے اور آپ خود آلو بخارے
ہوں گے..... چنانچہ میں پیچھے مڑے بغیر اپنے کان لپیٹ کر مائل سفر رہا۔
اصل مسئلہ گولمنڈی سے گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچنا تھا کیونکہ راستے میں ٹریفک
کی بھرمار تھا۔ ابدتہ گورنمنٹ ہاؤس کے بعد راستہ نسبتاً صاف ہو گیا اور میں اپنے
موٹر سائیکل کے پچھے ہوئے سائلنڈر اور شاٹ پلگ سے بے نیاز مزے سے
مال روڈ کی ہریاد کی باس محسوس کرتا ہوا چلتا گیا۔ ایکسپریس کا بج کے قریب پیدل
کا ایک سانحہ درخت مال روڈ کے عین درمیان میں بکھرا ہوا تھا پولیس کی کاریں
ٹریفک سارجنٹ اور دوسرا عملہ بے حد مستعد دکھائی دے رہا تھا اور درخت کو

سڑک سے ہٹانے کی کوششیں جاری تھیں۔ ایک وین اور سکوٹر کے سوار بد رخت
گرنے سے شدید زخمی ہو گئے تھے ہسپتال پہنچائے جا رہے تھے.... حسب عادت
لاہور کے جرات مند شہری کاریں اور موٹر سائیکل.... روک کر اس حادثے سے
لطف اندوز ہو رہے تھے اور وہاں ایک میلے کا سماں تھا۔ میں اس میلے میں
سے گزر رہا تھا کہ کار میں سوار دو بچوں نے غرہ لگایا "تارڑ آؤ بخارے" وہ میری
طرف اشارے کرتے ہوئے بار بار اپنے والدین سے بہ آواز بلند "تارڑ آؤ بخارے"
کہہ رہے تھے.... آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ یہ بچے اخلاقی حدود
پہنچاؤ کی بد تمیزی کی حد تک آگئے تھے۔ میں ان کے والد کی عمر کا تھا اور اس لحاظ
سے ان کا بزرگ ٹھہرتا تھا۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بہر حال میں جو ہمیشہ بچوں
کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا ہوں اور انہیں "ہیلو کنڈو" وغیرہ کہتا ہوں بے حد
سنجیدہ ہو گیا اور اپنے چہرے پر رعونت اور شہوت (اس لفظ کو میں اب بھی غرضت
پڑھ جاتا ہوں) وغیرہ سجا کر آگے بڑھ گیا مال روڈ سے نہر کی طرف مڑتے ہوئے میں
نے اطمینان کا ایک طویل سانس اپنے پیپھڑوں میں کھینچا کیونکہ ٹریفک کا ہجوم اب
ختم ہو چکا تھا اور میرے دونوں طرف صرف درخت تھے.... درخت؟....
یہ گر بھی سکتے ہیں جیسے کہ مال روڈ پر پیل کا ایک درخت گر گیا تھا اور میرے جیسے
کسی گھر جاتے ہوئے شخص کو ہسپتال بھیج دیا تھا چنانچہ میں نے اپنے تیش ان گرنے
والے درختوں سے بچاؤ کی خاطر رفتار اتنی تیز کر دی کہ میرا شارٹ پلگ پھٹ پھٹ
آپھٹ "کرنے لگا بہر حال درختوں سے بچنے کے لئے میں یہ صدمے احتجاج برداشت
کرتا رہا۔

نہر کے کنارے سے جب میں ایف سی کالج کی جانب مڑا تو پٹرول پمپ کے
نزدیک کھڑے ایک باریش اور مدبر بزرگ نے ہوا چکن اور جناح کیپ میں ملبوس

تھے مجھے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا اور غرہ لگانے کے انداز میں کہا "تارڑ آؤ بخارے"
اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ بچے تو خیر بچے ہوتے ہیں۔ لیکن ایک نستعلیق
قسم کے بزرگ جو میرے والد صاحب کے ہم عمر ہوں گے یوں سڑک پر کھڑے ہو کر
اگر "تارڑ آؤ بخارے" کی غرہ بازی کرنے لگیں تو انہیں کون سمجھائے بہت جی چاہا کہ
موٹر سائیکل وہیں روک دوں اور اسی طرح ہاتھ بٹاتا ہوا ان کے قریب جا کر کہوں
کہ جناب قبلہ بزرگوار آپ آؤ بخارے، آپ کے والد آؤ بخارے.... بس خون
کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور غصے سے کھولتا ہوا اپنے گھر کی جانب سفر کرتا رہا۔
بالآخر جب گھر سامنے آیا تو میں نے اپنے ایک سیلر کو زور زور سے گھایا تاکہ
ابنہ کی گھون گھون کی آواز سن کر بچوں میں سے کوئی باہر آئے اور گیٹ کھولے ہارن
اس لئے مدد بھایا کہ وہ بھتہ تھا بیڑی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ خاصی دیر بعد میری
بیٹی قرۃ العین باہر آئی اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی "ابو آؤ بخارے" چنانچہ میں نے
جلدی سے موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑا کیا اور عینی پر برس پڑا "اگر آؤ صبح کے گئے ہوئے
شام کو خیر سے آجائیں تو انہیں آؤ بخارہ کہتے ہیں؟ کتنی بُری بات ہے۔ میں آج
سے پاری بند ٹافیاں بند اور خبردار جو میرے ساتھ بات کی تو میں بے حد ناراض
ہوں اور غصے میں ہوں اور.... اتنی دیر میں میری بیگم باہر آ گئیں اور چرچی ہوئی
ٹیوڑی کو مزید چرچا کر بولیں "خواہ مخواہ کیوں ڈانٹ رہے عینی کو؟"
"خواہ مخواہ؟ میں نے ہاتھ لہرا کر بولا "اس نے مجھے آؤ بخارہ کہا ہے"

"کیوں عینی؟ اس نے حیرت سے بچی کی طرف دیکھا
عینی نے اس قسم کی شکل بنا رکھی تھی جس قسم کی شکل پکار پکار کر رہی ہوتی
ہے کہ مجھے ڈانٹتے ہو، شرم نہیں آتی چھوٹی سی بچی کو ڈانٹتے ہوئے اور میں ابھی
رونے والی ہوں۔

گھوڑے جنگ نہیں کرتے

پچھلے دنوں مجھے اپنی پرانی لینڈ لیڈی مسز کارٹر بہت یاد آئیں۔ میں انگلستان کے ساحلی قصبے ساؤتھ اینڈ میں بالکل نژاد تھا۔ چنانچہ رہائش کی تلاش کی جاسی سلسلے میں مسز کارٹر سے آشنا سامنا ہو گیا۔ یہ آشنا سامنا کالج کے پرنسپل کے توسط سے ہوا تھا جنہوں نے مجھے مسز کارٹر کا پتہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ خاتون نہایت ہمدرد اور رقیق القلب واقع ہوئی ہیں اور تم شکل سے خاصے مسکین لگتے ہو اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے قیام و طعام کا مناسب بندوبست کر دیں گی۔

”کیا تم جانوروں سے محبت کرتے ہو؟ یہ تھا پہلا سوال جو مسز کارٹر نے اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہی مجھ پر داغ دیا۔ میں نے فوراً دماغ پر زور دے کر سوچا کہ کیا ماضی میں میری زندگی میں کوئی ایسا کتا، لومڑ، بلی یا ریچھ وغیرہ داخل ہوا تھا جس کے ساتھ مجھے والہانہ محبت وغیرہ ہو گئی ہو۔ لیکن میسر ماضی میں جاندار تو بہت تھے جن سے محبت ہوئی تھی لیکن جانور کوئی نہ تھا۔ بہر حال میں نے ان کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا اور نہایت ادب سے عرض کیا کہ بندے کو تو جانوروں سے عشق ہے۔ بلیلی ہونہ ہو اس کا کتا ہی کافی ہے۔ مسز کارٹر پہلے تو مسکرائی اور پھر زار و قطار رونے لگیں۔ میں نے گہرا کر پوچھا کہ میڈم کیا ہوا؟ کہنے لگیں مجھے روزی بہت یاد آرہی ہے میں بت بنا کھڑا رہا کیونکہ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ روزی کون ہے اور انہیں کیوں یاد آرہی ہے پھر انہوں نے آنسو پھپھتے ہوئے اطلاع دی کہ بے چاری روزی فوت ہو چکی ہے۔ اس پر میں نے قدرے تاسف کا اظہار

یعنی آپ نے کیا کہا تھا ابو کو؟ میری بیگم نے پھر پوچھا۔

”امی“ یعنی منہ ہورتے ہوئے بولی۔ میں نے آج صبح جب ابو جا رہے تھے تو ان سے کہا تھا کہ واپسی پر میرے لئے آکو بخار لے کر آنا..... اب آنے ہیں تو میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ابو آکو بخار لے..... بس امی یہی کہا تھا؟

”اوہو“ میں جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ یعنی درست کہہ رہی تھی اس نے آج صبح مجھ سے آکو بخار لے لانے کی فرمائش کی تھی..... اور میں نے بطور خاص گولمنڈی سے ایک کھوا آکو بخار خرید کر لفافے میں ڈال کر کیرٹر کے پیچھے پڑے اہتمام سے باندھا تھا۔

”بالکل آکو بخار سے عینی۔ ابھی دیتا ہوں“ میں نے کیرٹر کی طرف دیکھا تو وہاں ایک پھٹا ہوا لفافہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ ہوا یہ کہ آکو بخاروں کے پکپکنے سے لفافہ راستے میں پھٹ گیا اور وہ ایک ایک کر کے مال روڈ اور نہر کے کنارے گرتے چلے گئے۔ کوئی یہاں گر کوئی وہاں گرا۔ اور وہ تمام حضرات جو ”تارڑ صاحب آکو بخار سے“ کے نمبرے لگا رہے تھے دراصل مجھے خبردار کر رہے تھے کہ تمہارے آکو بخار سے گر رہے ہیں اور میں ان کی آوازوں پر کان دھرے بغیر سفر کرتا رہا۔ اور اب اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ کھڑا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پرچ مچ ہی ایک آکو بخارا محسوس کیا۔ میں ایک ایسی قوم کی طرح تھا جو اپنا رخت سفر باندھتی ہے۔ سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس دوران اپنے آس پاس سے لاپرواہ ہو کر چلتی جاتی ہے۔ اس کا رخت سفر..... اس کی تہذیب، اخلاقی اقدار نظریات ایک ایک کر کے گرتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ آواز دیتے ہیں کہ دیکھو تم بہت کچھ کھو رہے ہو لیکن وہ ان آوازوں پر کان نہیں دھرتی اور بالآخر جب منزل پر پہنچتی ہے تو اس کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں..... بالکل میری طرح۔



کیا اور روزی کی موت کا سبب دریافت کیا مسز کارٹر نے ایک لمبی "شوں" کر کے ناک پونجی اور بتایا کہ غریب روزی مونیہ میں مبتلا ہو کر ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئی تھی۔ میں ابھی انگلستان کے موسم سرما کی شدت کے بارے میں اظہار خیال کر رہا تھا کہ مسز کارٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیا تم روزی کی قبر دیکھنا پسند کرو گے؟"

"قبر؟ میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں" انہوں نے سر ہلایا "وہ یہیں میرے گارڈن میں ہی دفن ہے۔"

اب یہ اطلاع میرے لئے قطعی طور پر خوشگوار نہ تھی کہ جس گھر میں میرا قیام کا ارادہ تھا اس کے گھر میں مردے دفن کئے جاتے ہیں چنانچہ میں اجازت لے کر رخصت ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے میرا ہاتھ تھاما اور اسی طور پر روتی ہوئی پچھواڑے میں لے گئیں۔

"یہ سب میری ڈارلنگ روزی کی قبر" انہوں نے ایک ۴x۸ کے سیمنٹ کے بلاک کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت ہی بچپن میں فوت ہو گئی تھیں جو اتنی چھوٹی قبر ہے۔"

"نہیں آٹھ ماہ کی عمر میں فوت ہوئی تھی۔ روزی میری رنگین چڑیا کا نام تھا۔"

اکلی صبح میری ناشتے کی میز پر بھی مسز کارٹر جانوروں کا تذکرہ کرتی رہیں ریکیم ان کا اداس چہرہ کھل اٹھا، اور وہ دروازے کی طرف دیکھ کر کہنے لگیں۔ "آجاؤ جارج ان سے ملو، یہ ہیں ہمارے نئے کرائے دار تار صاحب..... میں اس مسز جارج سے دست پنہ لینے کے لئے اٹھنے کو تھا کہ ہلکی سی "وف" کی آواز آئی۔ جارج صاحب لمبے چوڑے بالوں والا ایک پستہ قد کا تھا۔ جس نے مجھ پر ایک

"تنقیدی نگاہ ڈالی، پہلے میرے بوٹوں کو سونگھا اور پھر اچھل کر میری گود میں آ بیٹھا۔"

"اوہ! مسز تارٹر تم کتنے خوش قسمت ہو کہ یہ پہلی ملاقات میں ہی تمہاری گود میں آ بیٹھا ہے۔ ورنہ جارج تو ہر کسی کو پسند ہی نہیں کرتا۔"

میں ابھی اس محضے میں تھا کہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں کس طرح ہوا جائے کہ جارج نے اپنی رال چپکاتی لمبی زبان باہر نکالی اور میری تازہ شیو شدہ گال کو شہر شہر کر کے چاٹنے لگا۔

"اوہ اسے تو تم سے محبت ہو گئی ہے۔" مسز کارٹر نے خوشی کی ہلکی سی چیخ ماری قصہ مختصر میں کسی بہانے سے اٹھا اور باتھ روم میں جا کر دوبارہ شیو کی اور پھر اپنے آپ کو سونگھتا ہوا کالچ چلا گیا۔

سہ پہر واپسی ہوئی تو جارج صاحب میرے استقبال کو موجود تھے۔ انہوں نے میری نئی پتلون کا پانچ دانٹوں میں دبا کر اپنے والہانہ جذبات کا اظہار کیا۔ چونکہ مسز کارٹر بڑی محبت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے میں ایک زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مسز کارٹر کا گھر آرام دہ تھا اور کرایہ بھی مناسب اس لئے میں جارج کے گیلے بوسوں اور اس کی وحشی محبت کے باوجود وہیں ٹکا رہا۔ ایک روز کالچ سے واپسی ہوئی تو مسز کارٹر شاپنگ کے لئے باہر گئی ہوئی تھیں اور ان کا جارج میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی عینی گواہ تو موجود نہیں اور پھر ایک چھری کے ساتھ مسز جارج کی پٹائی شروع کر دی۔ جارج صاحب قدیمے دکھائے اور پھر "چوڑوں چوڑوں" وہاں سے فرار ہو گئے۔ اس وقت سے بعد جارج نے مجھ میں اور اپنے آپ میں ایک فاصلہ رکھنا شروع کر دیا۔ مسز کارٹر بہت حیران اس کتنے کو کیا ہو گیا ہے، تمہارے نزدیک ہی نہیں آتا۔ اور میں مسز جارج کو گھورتے

ہوئے چمکا کر تاکہ آجاؤ کتے، ہیلو جارج..... مگر جارج صاحب سیانے تھے پاس نہ آتے تھے۔ دو درہیتھے دم ہلاتے رہتے۔

ایک شام ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے مسٹر کارٹر بہت اپ سیٹ ہوئیں کیونکہ جنگ کے دوران ایک منظر میں کسی گھوڑے کو گولی لگ گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ مسٹر کارٹر صرف گھوڑے ہی نہیں انسان بھی تو مر رہے ہیں پر آپ کو افسوس نہیں ہوتا؟ کہنے لگیں انسان تو جنگ کرتے ہیں انہیں مرنا چاہیئے۔ گھوڑے تو جنگ نہیں کرتے.... تم مشرقی لوگ دراصل اب بھی نیم وحشی ہو۔ اور جانوروں سے پیار نہیں کرتے۔

ایک روز کالج سے واپسی پر جارج کو اکیلا پا کر میں حسب معمول اسے پھینٹی لگا رہا تھا کہ مسٹر کارٹر وارد ہو گئیں۔

”وحشی مشرقی“ وہ پھینٹیں ”تم جانوروں سے محبت نہیں کرتے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔“

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور ان کے گھر سے نکل گیا اور پچھلے دنوں مجھے مسٹر کارٹر کیوں یاد آئیں!

میرے گھر کے ساتھ ایک وسیع کوٹھی کا بیک یارڈ ہے۔ کوٹھی کے مالک سر گونگا کے ایک لینڈ لارڈ ہیں جو سال میں ایک دو مرتبہ ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ملازم کوٹھی کی رکھوالی کرتے ہیں اور کوئی چھ سات ریکچوں کی جہات والے گرانڈیل کتے لان میں لوٹتے رہتے ہیں۔ میں ٹیلی ویژن کے ایریل کی سمت درست کرنے کی خاطر کونٹے پر گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک میل سا ملازم کتوں کے آگے گوشت کے ٹکڑے ڈال رہا ہے اور وہ آپس میں گتھم گتھا ہوتے اسے ہڑپ کر رہے ہیں۔ آٹھ دس گھنٹے کم مقدار نہ تھی جو کتوں کے پیٹ میں گئی.... اس کام سے فارغ ہو کر ملازم نے ایک چھٹیڑے میں سے ایک سوکھی ہوئی روٹی نکالی اور اسے نگلنے لگا میرے پاس مسٹر کارٹر کا پتہ نہیں تھا اور نہ میں انہیں لکھتا کہ ہم مشرقی لوگ اب وحشی نہیں رہے اور جانوروں سے بہت پیار کرتے ہیں۔

لندن کی کانٹ اور موچی دروازے کی پتنگ

انگلستان میں ہسنت کے دن قریب آئے تو اقبال عرف جمی جٹ جو خالص لاہوریاتھا کہنے لگا۔ یار تارڑ اس وقت ہمارے شہر لاہور میں کیا کیا بہائیں ہوں گی۔ ہر طرف گڈیاں ہی گڈیاں اور پتنگیں اور پیچھے ہی پیچھے..... اور یہاں انگلستان میں انگریز قوم کو پتہ ہی نہیں کہ رُت بدلنے والی ہے اور ہسنت آ رہی ہے۔

میں نے کہا کہ بھائی جمی ہر ملک کے تہوار لوگوں کے مزاج اور موسموں کے مطابق ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے مزاج میں تو کچھ سی شامل ہے! انہیں کیا پتہ کہ کروڑوں روپے کی پتنگیں اور ڈور اڑا دینے میں کیا مزے ہیں..... اور پھر یہاں کا موسم..... پتنگ چڑھانے کے لئے تو ایک مخلص چھت، سنہری دھوپ، دنیا جہاں سے فراغت اور مال بھان سے لاپرواہی درکار ہے۔ یہاں ڈھلوان چھتیں ہیں۔ ہر وقت سرد اور بریلی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لوگ کمپیوٹر کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہاں پتنگ بازی کے لئے حالات سازگار نہیں.... لیکن جمی جٹ کی تسلی نہ ہوئی۔ جوں جوں ہسنت کا دن قریب آ رہا تھا اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک ویک اینڈ پر وہ غائب ہو گیا۔ اتوار کی شام کو واپس آیا تو اس کے تھیلے میں سرخ ڈور کا ایک پٹا تھا۔ اور پلاسٹک میں لپیٹی ہوئی دو پتنگیں.....

”تم پاکستان گئے تھے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں میں بریڈ فورڈ گیا تھا اسے بھی پاکستان ہی سمجھو وہاں ایک دو پٹیاں

ہیں جو بسنت کے موقع پر مچھی دروازے اور لوہاری کی پتنگیں امپورٹ کرتی ہیں۔ وہاں سے لایا جوں؟

اب جتنی جٹ روزانہ صبح اُٹھتے ہی کھڑکی پر سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکتا اور رونی شکل بنا کر کہتا "بیڑہ غرق آج بھی بارش ہو رہی ہے ریا تار ڈو دعا کرو بسنت والے دن بارش نہ ہو۔ چار دن رہ گئے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا کہ اگر اس روز بارش نہ بھی ہو تو ان پتنگوں کو اڑاؤ گے کہاں پر؟

کہنے لگا سمندر کے کنارے چلے جائیں گے، ہوا بھی ٹھیک ہوگی؟ اگلے روز ہمارے ایک کلاس شیپر مسٹر جان ملر لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے دوران انہوں نے کسی گتھی کو سلجھانے کے لئے تمام طالب علموں سے پوچھا کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ جتنی جٹ کی باری آئی تو وہ کہنے لگا سربارہ فوری کو بارش نہیں ہونی چاہیئے؟ مسٹر جان ملر نے حیران ہو کر اس عجیب و غریب خواہش کا سبب پوچھا تو جتنی جٹ نے اپنی شاندار انگریزی میں انہیں بتایا کہ جناب ہمارے ملک میں اور خاص طور پر ہمارے شہر لاہور میں اس روز بسنت فیسٹول منایا جائے گا جس میں گڈیاں اور پتنگیں اڑائی جائیں گی۔ گڈیاں کا انگریزی ترجمہ اس نے وہ وہ کیا اور پتنگوں کو پانگنز بنا دیا۔ ظاہر ہے مسٹر ملر تک بسنت کی روح نہ پہنچ سکی اور وہ کہنے لگے کہ مسٹر جی آپ ڈونر کو ہوا میں کس طرح اڑا لیتے ہیں۔ شاید آپ ایسی کاٹ بناتے ہیں جس کی شکل ڈول سے ملتی ہو؟ جی نے اس کو غنیمت جانا اور کہنے لگا "بالکل سُر" اس پر مسٹر ملر نے اپنے ذہن میں کچھ حساب لگاتے ہوئے کہا مسٹر جی.... میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہو جاؤں؟

جی نے جب یہ سنا کہ مسٹر ملر بھی ایک گڈی باز ہیں تو وہ فوراً جذبات

سے منسوب ہو کر اٹھا اور استاد شاگرد کے رشتے کو بھول کر مسٹر ملر کو لگے لگا لیا اس کی آواز نہ سی ہوئی تھی اور وہ بار بار "تھینک یو مسٹر ملر.... تھینک یو مسٹر ملر" کہہ رہا تھا.... مسٹر ملر نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے علیحدہ کیا کیونکہ انگریز حضرات مردوں کے آپس میں بغل گیر ہونے کو خاصا معیوب سمجھتے ہیں۔

بالآخر بسنت آگئی۔ اور جی کی قسمت کہ اس روز آسمان بالکل صاف تھا۔ جی نے ڈور اور پتنگیں مجھے تنہا دیں۔ لینڈ لیڈی کے سرخ و سرخ خاندن کا ایک بگل جو ڈرائنگ روم میں آتش دان کے اوپر ٹنگا ہوا تھا اتار کر دور کوٹ کی جیب میں رکھا اور پھر ٹیپ ریکارڈ اٹھا کر ہم دونوں باہر آگئے۔ باہر بارش تو نہ تھی، مگر ایک ایسی بریلی ہوا چل رہی تھی کہ سمندر کے کنارے پہنچتے پہنچتے ہم بالکل سوج ہو چکے تھے اور ہمارے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہم چونکہ حسب معمول پورے وقت پر نہیں پہنچتے تھے اس لئے ہماری آمد سے پیشتر مسٹر ملر تشریف لا چکے تھے اور اپنی کاٹ اڑا رہے تھے۔ جی نے کاٹ کو دیکھا تو سخت مایوس ہوا کہنے لگا "یار اسے یہ لوگ پتنگ کہتے ہیں۔ پلاسٹک کا باوا سا ہے اور ایک لمبی ساری دم ہے۔ اور اس کی ڈور دیکھو۔ پارسل باندھنے والا دھاگہ ہے؟" جی نے اپنی پتنگ نکالی۔ بڑے اہتمام سے اس میں تناویں ڈالیں اور اسے ہوا میں بند کر دیا۔ اب مسٹر ملر کے حیران ہونے کی باری تھی "مائی گاڈیو کال اٹ اے کاٹ.... دس اڑا لے ڈرک آف آرٹ.... ہوا تیز تھی اور سمندر کی نمی نے چند ہی لمحوں میں پتنگ کو پھاڑ دیا جی نے دوسری پتنگ نکالی اور اسے اڑاتے ہوئے کہنے لگا اس سے پہلے کہ یہ بھی پھٹ جائے میں مسٹر ملر سے پچا لگانے لگا ہوں۔ تم بگل تیار رکھو اور پاکستانی گانوں کی کیٹ بھی لگا دو، ذرا بسنت کا ماحول تو پیدا ہو.... اس سے پیشتر کہ مسٹر ملر کو ہماری سازش کا علم ہو جی نے اپنی پتنگ کو ان کی کاٹ کے نیچے رکھا اور ڈھیل دے دی۔ کاٹ

تار صاحب سبحان اللہ

ایک عجیب و غریب کردار ہے جو میرے بازار میں سے روزانہ گزرتا ہے۔
 لگتا ہے کہ اس کا خلیفہ سا تعلق فنون لطیفہ کے ساتھ ہے کیونکہ رنگ اس
 کا قدرے مشکلی ہے اور چمکیلا ہے بلکہ فن موسیقی سے تعلق ہے کیونکہ بال اس
 کے چپٹے ہوئے ہیں اور مونچھیں تلوار تکیہ ہیں اور چلنے میں ایک ہلکا سا سوانی
 انداز ہے اور بے حد فرمانبردار اور ڈرپوک اور ”بسم اللہ“.....
 ”آبا با“ اس کا تکیہ کلام ہے۔ تعارف کچھ یوں ہوا کہ ایک روز وہ میرے
 ہاں آیا اور میرے بالکل سامنے کھڑے ہو کر مسکرانے لگا میں نے پوچھا کیا بات ہے؟
 وہ مسکراتا رہا۔

میں نے جھلک کر پوچھا کیا بات ہے؟

اس نے ہاتھ لہرا کر کہا ”آبا با“

میں نے پوچھا ”آبا با؟“

کہنے لگا ”جی سبحان اللہ“..... میں نے کہا تار صاحب سبحان اللہ.....؟

میں نے کہا ”بیٹھ جائیں“

وہ کرسی پر بیٹھا ہوا بولا ”بسم اللہ“

میں نے پھر پوچھا ”فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

وہ پھر کھڑا ہو گیا ”جی سبحان اللہ“..... تار صاحب سبحان اللہ“

نے کچھ دیر تو حیرت سے مقابلہ جاری رکھا لیکن کہاں لندن کی کاسٹ اور کہاں موچی
 دروازے کی پیننگ..... مسٹر ملر نے بھی شور مچا دیا کہ یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو اتنی دیر
 میں کاسٹ کئی اور سمندر میں جاگرمی میں نے ”با بو کاٹا“ کا نعرہ لگایا اور بگل بجانے لگا
 جی نے بھنگڑہ ڈالنا شروع کر دیا اور مسٹر ملر کا نام لے لے کر بڑکیں لگانے لگا.....
 مسٹر ملر اس دوران بے حد حیرت سے ہم نیم پاگل پاکستانیوں کو شور مچاتے ہوئے
 دیکھتے رہے..... ہم نے اپنے تین پہلی مرتبہ برطانیہ عظمیٰ کی آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی
 پیننگ کاٹ دی تھی..... کم از کم اس معاملے میں موچی دروازے کو لندن پر فتح حاصل
 ہو چکی تھی۔

میں نے سوچا یہ کوئی ماڈرن فقیر ہے مجھے تنگ کرے گا چنانچہ میں تیوری چڑھا کر کہا "میں فی الحال بے حد مصروف ہوں پھر کسی وقت تشریف لائیے گا" وہ اسی طور مسکراتا رہا اور پھر کہنے لگا "صدتے جاسیے تارڑ صاحب میں تورات کے ڈرامے کی مہارخ دے رہا تھا..... سبحان اللہ جی کیا اداکاری کی ہے آپ نے..... آہا ہا"

یہ نواز علی تھا جو میرے قریب ایک ٹکٹے میں رہتا ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد جب بھی ٹیلی ویژن پر میرا کوئی ڈرامہ چلتا وہ رکنا اور خاموش کھڑا مسکراتا رہتا اور بالآخر آہا ہا..... سبحان اللہ..... میں نے کہا تارڑ صاحب سبحان اللہ"

میں بھی اس کی اس بے جا تعریف اور انداز تعریف سے لطف اندوز ہوتا اور اسے چائے کا ایک کپ پلا کر فارغ کر دیتا نواز علی بالکل فارغ ہی تھا مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کرتا تھا اور اس کا حال کچھ اتنا اچھا نہیں ہوتا تھا ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ نواز علی تم کرتے کیا ہو تو وہ کہنے لگا "مولا کا کرم ہے تارڑ صاحب.....؟" ایک سگریٹ اس کے پاس ضرور ہوتا اور ماچس مجھ سے مانگ کر وہ جلاتا اور پیتا اور پھر چلا جاتا وہ صرف ان دنوں میں میرے پاس ٹھہرتا جب میرا کوئی ڈرامہ چلتا ورنہ سیدھا ٹکٹے کی طرف چلا جاتا۔

ایک روز وہ میرے ہاں آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ تھا جو اس نے میرے سامنے رکھا اس میں سے ایک لڈو نکالا اور میرے منہ کی طرف بڑھایا میں نے پوچھا "نواز یہ کاسے کی مٹھائی ہے بھئی؟"

نواز مسکرایا اور کہنے لگا "آہا ہا تارڑ صاحب..... واہ واہ..... میں نے کہا سبحان اللہ"

پچھلی شب میرا ایک ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا تھا جس میں میں نے نہایت بے ہودہ قسم کی اداکاری کی تھی اور اب نواز اس کے حوالے سے آہا ہا کر رہا تھا بہر حال میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ یہ لڈو کس سلسلہ میں کھلایا جا رہا ہے۔

"لوجی آپ کمال کرو ایکٹنگ میں تو نواز علی منہ نہ دیکھا کرانے آپ کا..... آپ توجی استاد ہو گئے ہو لو کھاؤ لڈو..... بسم اللہ میں نے لڈو کھالیا۔"

وہ باہر جانے لگا تو مٹھائی کا ڈبہ میز پر چھوڑ گیا میں نے واپس بلایا اور ڈبہ لے جانے کو کہا۔

"نہ جی تارڑ صاحب..... آہا ہا یہ تو آپ کے لئے ہے آپ استاد ہو جی..... نہ جی نہ مجھے مجبور نہ کرو..... میری خوشی ہے..... اللہ خوش رکھے..... سلاما علیکم" اور وہ چلا گیا۔

ٹیلی ویژن اور ادب کے حوالے سے تجھے شگافت وصول کرنا میرے لئے ہمیشہ ایک چھوٹا سا عذاب رہا ہے۔ کچھ لوگ صدق دل سے اپنی پسندیدگی کے اظہار کے طور پر آپ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور مجھے ایک ہال پوائنٹ کا تحفہ وصول کرتے ہوئے بھی یوں لگتا ہے جیسے میں کوئی مداری ہوں جس کے تماشے سے متاثر ہو کر لوگ اسے پیسے دے رہے ہیں یہ ابھی پچھلے برس کی بات ہے کہ ایک بالکل اجنبی صاحب میرے ہاں آئے سانس پھولا ہوا اور قدرے شرمندہ میرا ہاتھ پکڑا اور اس میں کچھ نوٹ نکال کر بولے بس جی ہم تو آپ کے چاہنے والے ہیں بس یہی خدمت کر سکتے ہیں۔

میں نے وہ نوٹ جس طرح واپس کئے وہ میں جانتا ہوں کیونکہ ایک تو وہ صاحب مانتے نہیں تھے اور دوسرے نوٹ بھی کافی تھے بہر حال نواز علی مجھے

مٹھائی کا ڈبہ دے گیا۔
دو تین ہفتوں کے بعد وہ پھر آیا اور کہنے لگا ”سبحان اللہ.... آبا ہا تار صاحب“
میں نے کہا ”نوازان دنوں تو میں ٹیلی ویژن کے گیت کے اندر بھی نہیں گیا
تم کس سلسلہ میں آبا ہا کر رہے ہو؟“
کہنے لگا ”بس آج ویسے ہی میرا جی چاہا کہ تار صاحب کو مٹھائی کھلاؤں
اس نے قلاقند کا ایک ٹکڑا نکالا اور ”بسم اللہ“
اس مرتبہ وہ ایک کی بجائے دو ڈبے مٹھائی چھوڑ گیا میں اس صورت حال
سے بے حد پریشان تھا اور شرمندہ بھی تھا کہ یہ غریب آدمی ہے پتہ نہیں کس
طرح پیٹ کاٹ کر میسر لئے مٹھائی خریدتا ہوگا۔
اگلی مرتبہ نواز آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سنہری بار بھی تھا جو اس نے
آتے ہی میرے گلے میں زبردستی ڈالا اور سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا ”آبا ہا اور پھر
صاحب سابق مٹھائی کے ڈبے میں سے ایک لڈو نکال کر میرے منہ کی طرف بڑھا
دیا“ بسم اللہ“

میں نے ہار اتار کر میز پر رکھا اور نواز علی کو گھورا ”دیکھو بہت ہو چکی....
یہ تم خواہ مخواہ مٹھائی کس لئے آتے ہو ہر دوسرے دن اور یہ ہار وغیرہ پہنانے
کا کیا تمک ہے.... مجھے ایسی حرکتیں بالکل پسند نہیں.... سمجھے تم؟“
نواز علی یکدم بھج گیا اور اس کا منہ تنک گیا ”سرکار.... میں تو خادم ہوں..
... بس جی میری خوشی ہوتی ہے آپ دل کو اچھے لگتے ہو مجھ سے اچھا بولتے ہو تو
چلا آتا ہوں.... میرا دل نہ توڑا کریں“ وہ سر جھکائے باہر چلا گیا لیکن ڈبہ وہیں
چھوڑ گیا۔
تقریباً دو ہفتے بعد وہ پھر میرے سامنے کھڑا تھا ہاتھ میں لڈو اور آبا ہا.... بسم اللہ“

میں اس شخص کا کیا کرتا چنانچہ میں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مٹھائی کا ڈبہ پہلی
مرتبہ گھر لے گیا میں نے بیگم کو تفصیل بتائی تو کہنے لگی ”بچے اور میں تو ہرگز یہ مٹھائی
نہیں کھائیں گے پتہ نہیں کس قسم کی ہے تم بے شک کھا لینا یا جمعہ رنی کو دے
دیں گے.... لیکن“ اس نے ڈبے کو غور سے دیکھا ”یہ پتو کی کی مٹھائی لاہور میں کیسے
وہ درست کہتی تھی ڈبے پر مون سویت ہاؤس پتو کی چھپا ہوا تھا اگلی مرتبہ جو
مٹھائی آئی اس پر گجرات کی کسی دکان کا پتہ تھا.... سا جیوال، ٹوبہ ٹیک سنگھ
گوگرد، کاموکی اور کلا شاہ کا کو کے علویوں کی مٹھائیاں کھانے کے بعد میں نے ایک
روز نواز سے پوچھ ہی لیا کہ ان ڈبوں پر مختلف شہروں اور قصبوں کے نام کس سلسلہ میں
ہوتے ہیں نواز کچھ نروس ہوا اور پھر کہنے لگا ”بسم اللہ تار صاحب میرے یاد تیلی ہیں
ان علاقوں میں ان سے منگواتا ہوں آپ کے لئے“ اس جواب سے میری تسلی تو نہ
ہوئی لیکن میں چپ ہو گیا۔
ایک روز ایک بڑا سا راڈبہ تھا اور اس پر ابھی گڈی کا غزلپٹا ہوا تھا میں
اسے گھر لایا اور کھولا تو اندر ایک چٹ تھی....
”پیارے یار علی احمد کے لئے مہر خدا بخش کی طرف سے“ اگلے روز میں نے
نواز علی کا انتظار کیا اور سو نہی وہ بازار میں سے گزار میں نے آواز دے کر اسے بلا
لیا ”یار علی احمد کون ہے؟ میں نے پوچھا۔
”بسم اللہ تار صاحب کو شاعلی احمد؟“
”اور مہر خدا بخش تمہارا واقف ہے؟“
”کیا کہتے ہو مہربان.... کس کی بات کرتے ہو؟“
میں نے جیب میں سے چٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی یہ کل والے
ڈبے میں تھی.... شاہ کوٹ والی مٹھائی کے ڈبے میں“

نواز علی نے آنکھیں جھپکیں اور پریشان ہو کر بولا "بسم اللہ تارڑ صاحب"
میں نے کہا "بسم اللہ بعد میں پہلے یہ بتاؤ کہ یہ چکر کیا ہے؟"
اس نے ہاتھ جوڑ دیئے کوئی چکر نہیں مانی باپ.....
"چکر تو ہے نواز علی..... جو ڈبر آتا ہے کسی مختلف شہر کا ہوتا ہے.....
سچ سچ بتا دو ورنہ آئندہ میں تم سے بات نہیں کروں گا"
"بسم اللہ جی..... بس جی..... آپ یوں سمجھ لیں کہ یہ دوہی کی کمائی
ہے تارڑ صاحب"

"تم دوہی گئے تھے"

"نہیں جی..... وہ دراصل آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"ناراض میں تب ہوں گا اگر تم بتاؤ گے نہیں؟"

"یہ جی کاروبار تو تھا شاید سے بلا کی کا..... اس نے مجھے بھی ساتھ ملا لیا
بے کار تھا اس لئے شامل ہو گیا..... پہلے تو جی پتہ کرتے ہیں کہ دوہی اور لنڈن
کی فلیٹ کس دن ہے اور کس وقت ہے اس دن وہاں ایئر پورٹ پر پہنچ جاتے
ہیں وہاں کسی ایک آسامی کو تاڑ لیتے ہیں جی..... دیکھیں نا اب ایک بندہ
گجرات سے دوہی جا رہا ہے تو لاہور ایئر پورٹ پر اس کو کم سے کم بیس پچیس
رشتے دار یا دوست تو چھوڑنے آئیں گے..... تو ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے
تھے اور ہر ایک کو سلام بھائی جان..... ماسی جی سلام اسے..... سلام چاچا
کہہ کر سب کو یقین دلا دیتے کہ ہم بھی ان میں سے کوئی ہیں دوہی جانے والا
تو اس وقت پریشان ہوتا ہے اسے کون پوچھتا ہے کہ یہ کون ہیں جو تمہیں چھوڑنے
آئے ہیں..... اچھا تو جناب بھنے یا دوست یا رشتے دار آتے ہیں وہ سب
کے سب یا تو بارے کر آتے ہیں یا مٹھائی کے ڈبے..... جس وقت سامان

کا وزن ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ زیادہ نکلتا ہے چنانچہ مٹھائی کا ایک آدھ ڈبر رکھ
کر باقی ڈبرے وہ واپس کر دیتے ہیں..... اس وقت ہم آگے بڑھتے ہیں اور
وہ ڈبرے جو لوگوں کو تنگ کر رہے ہوتے ہیں کہ انہیں کہاں رکھیں اور کیسے
اٹھائے پھر ان کے ہاتھوں سے لے لیتے ہیں کہ..... اسے میں اٹھا لیتا
ہوں ماسی..... بھائی جان اسے میں رکھ آتا ہوں..... اس طرح پندوہیں
ڈبرے جمع ہو جاتے ہیں اور بعد میں کوئی بھی نہیں مانگتا..... بس جی تارڑ صاحب
اگے دن ہم اس مٹھائی کو چھابڑی میں رکھ کر بیچ دیتے ہیں بس اتنی سی بات ہے
چونکہ لاہور ایئر پورٹ پر آنے والے مسافر مختلف قصوں اور شہروں سے آتے
ہیں اس لئے مٹھائی بھی وہیں کی ہوگی.....
"اور وہ ڈبرے جو مجھے دیئے جاتے تھے"

"مانی باپ" نواز نے ہاتھ جوڑ دیئے "جو بچ جاتی تھی بکیتی نہیں تھی وہ
پیک کر کے آپ کو دے جاتا تھا..... پر جی ہوتی تازہ تھی..... میری خوشی
تھی..... اور وہ بار جو آپ کے گلے میں ڈالا تھا وہ بھی دوہی کا مال تھا.....
واہ واہ تارڑ صاحب..... آہا ہا..... میں نے کہا سبحان..... اللہ..... آہا ہا"

اچھا اچھا..... آپ بھی مجھے ملی سمجھتے ہیں۔ بھائی میں ملی تو نہیں ہوں میں تو
ایک میاؤں ہوں۔“

”جی جی بالکل..... اچھا آپ یہ فرمائیں کہ آپ میاؤں کیسے بن گئے؟“
”کیسے بن گئے؟ بھئی جس طرح سب لوگ شادی کرتے ہیں اور میاؤں دیے
ہم بھی بن گئے..... بات سنئے۔ ادھر کان میں.... کیا آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں
ملی ہوں؟“

”بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔“
”لیکن میرے گھر والے یہی سمجھتے ہیں.....“
”کب سے سمجھتے ہیں؟“

”آج صبح سے..... تبھی تو انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا۔“
”ذرا تفصیل سے بتائیے کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟“

”دیکھئے بھائی رپورٹر صاحب میں درمیانے درجے کا ایک درمیانہ سا ملازم ہوں
اور اللہ کے فضل سے شکر کرتا ہوں اور صبر کرتا ہوں اور چل جاتا ہے اس پر سر جھکا تا ہوں
ہوا یہ کہ جب عید قریب آئی تو بچوں نے کہا کہ ہمیں نئے کپڑے اور نئے جوتے
درکار ہیں.....“

”وہ تو بچے کہتے ہی ہیں.....“

”درمیان میں کیوں بولتے ہیں اچھے صحافی ہیں..... اب مت ٹوکنے گا۔“

چنانچہ جناب میں نے کچھ رقم کا بندوبست کیا اور انہیں بازارے گیا۔ اور وہاں
میرے بچے کچھ زیادہ بھی نہیں ہوں یوں سمجھ لیجئے کہ آخری گنتی کے وقت درجن سے
ایک دو کم ہی تھے..... سب سے پہلے ہم بوتلوں کی دکان میں گئے۔ وہاں
سب بچوں نے جوتے پسند کئے جوڑنے تھے میرا مطلب ہے پہننے تھے جب ان

میں ایک میاؤں ہوں

اسلام علیکم..... جناب میں روزنامہ ”مشرق“ کی جانب سے آپ کو مبارک
کہتا ہوں۔ ہم نے اپنے اخبار میں ”خوش و خرم خاندان“ کے عنوان کے تحت ایسے
خاندانوں کے انٹرویو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ہمیشہ خوش رہتے ہیں اور ان
کے اہل خاندان ان سے بے حد مطمئن ہیں چنانچہ پہلا انٹرویو آپ کا ہوگا.....
آپ یہ فرمائیے کہ آج عید کا دن ہے لیکن آپ کو آپ ہی کے گھر کے ایک چھوٹے
کمرے میں بند کر دیا گیا ہے اور آپ اس وقت صرف ایک لنگوٹ میں ملبوس
ہیں ایسا کیوں ہے؟“

”معاف کیجئے گا یہ لنگوٹ نہیں بلکہ لنگوٹی ہے..... ایک تو صحافی حضرات کی
گرامر درست نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر عید کے روز بھی ایک کمرے میں بند ہوں
تو آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

”جی مجھے تو کوئی تکلیف نہیں لیکن ہمارے قارئین یقیناً اس کی وجوہات
جاننا چاہیں گے.....“

”میں ایک میاؤں ہوں.....“

”جی کیا فرمایا آپ نے؟“

”میں ایک میاؤں ہوں“ میاؤں میاؤں“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں آپ تو اچھے بھلے انسان ہیں ملی وغیرہ تو نہیں ہیں۔“

کا بل بنا تو معلوم ہوا کہ پونے دو ہزار روپے کے ہیں.....
”پونے دو ہزار کے جوتے؟“

”جی..... پھر آپ کہتے ہیں کہ میں میاؤں کیسے ہو گیا..... بالکل جوتے.....
اور میں ایک ہزار روپیہ لے کر گیا تھا کپڑوں..... جوتوں..... چوڑیوں اور کھانے
پینے وغیرہ کے لئے بہر حال ادھر ادھر سے مانگ مانگ کر یہ بل پورا کیا اور جوتے
گھر لے آئے..... نئے کپڑوں کی چھٹی کرادی گئی..... اب جناب آج نماز عید
کے بعد لوگ آنے شروع ہو گئے صفائی کرنے والی، دودھ والا، چوکیدار، سامنے پارک
کا مالی، ڈاکیر، عید مبارک صاحب عید مبارک صاحب..... پتہ نہیں کون کون لوگ
تھے سب کو دس دس پانچ پانچ تھمانے پڑے اور ہماری جیب خالی ہو گئی۔ آخر
میں چوکیدار آیا تو جیب چونکہ خالی ہو چکی تھی اس لئے میری بیوی نے کہا کہ چوکیدار
بہت کام کا آدمی ہے اسے خالی ہاتھ نہیں بھیجا جائے اس لئے اسے یہ والا کرتہ
شلوار دے دیتے ہیں جو تم نے پہن رکھا ہے ابھی استری تو خراب نہیں ہوئی چنانچہ
میں نے اپنا وہ سوٹ اتار کر چوکیدار کو پیش کر دیا..... میں اس دوران بالکل نہیں
بولا مسکراتا رہا..... لیکن جب میرا کرتہ شلوار اتار دیا گیا تو میں نے اپنی بیوی سے
کہا کہ کچھ تو میرا خیال کرو میں ایک میاؤں ہوں..... تمہارا میاؤں ہوں.....“
”قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں آپ نے اپنی بیوی سے کہا ہو گا کہ میں ایک
میاں ہوں یعنی خاوند ہوں“

”جی بالکل میں نے یہی کہا کہ میں ایک میاؤں ہوں“
”میاؤں ہوں یا میاں ہوں؟“

”یہی دوسرے والا جن کا مطلب خاوند ہوتا ہے..... بس یہی کہا کہ بیوی
جو تم کچھ تو میرا خیال کرو۔ آج میں اس لنگوٹی میں ملبوس ہوں اور عید کا دن ہے.....“

تمہارا باپ ہوں اور تمہارا میاؤں ہوں..... بس جی یہ کہنا تھا کہ میری بیوی نے
دھڑائیں مار مار کر دونا شروع کر دیا کہ میرے سر تاج کو کیا ہو گیا ہے آپ بیوی کی طرح
میاؤں میاؤں کیوں کرنے لگے ہیں مجھے سخت تاؤ آیا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے میں
تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم میری بیگم ہو اور میں تمہارا میاؤں ہوں.....
لیکن وہ بھلی لوگ اور زور زور سے رونے لگی اسے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے۔
تب مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے کہا کہ کون کہتا ہے کہ میں میاؤں نہیں ہوں میں
تمہارا میاؤں ہوں۔ ایک عرصے سے میاؤں ہوں اور ہمیشہ میاؤں رہوں گا.....
میاؤں۔ میاؤں۔ میاؤں..... پھر پتہ نہیں انہیں کیا ہوا ان سب نے مجھے پکڑ کر
اس کمرے میں بند کر دیا اس لنگوٹی سمیت.....“
”اچھا اچھا..... بالکل..... اعراجات کی وجہ سے انسان کچھ میسر تو ہو
ہی جاتا ہے.....“

”آپ ہوں گے میسر میں تو میاؤں ہوں.....“

”اچھا جناب انٹرویو کا بہت بہت شکریہ اب اجازت دیجئے“

”بات سنئے“

”جی فرمائیے“

”ذرا اور قریب آجائیے“

”جی“

”آپ کا کیا خیال ہے کہ میں سچ پچ میاؤں ہو گیا ہوں؟..... ابھی نہیں صاحب
میں ایک میاں ہوں اور میاؤں نہیں ہوں“

”تو پھر آپ.....“

”دیکھیں ناں بھائی ابھی تو عید کی صبح ہے..... ابھی میری ہمیشہ گان آئیں گی“

اپنے درجنوں بچوں کے ساتھ پھر بھائی آئیں گے ان کے بعد بیگم کے رشتے دار شروع ہو جائیں گے اور آپ سارے شمار کر سکتے ہیں لیکن انہیں اور ان کے بچوں کو نہیں گن سکتے..... اور ان تمام بچہ لوگ کو اگر پانچ پانچ روپے عیدی بھی دوں تو سارے سال کی تنخواہ لگ جائے گی چنانچہ صرف آج کے دن کے لئے میں ایک میاؤں میاؤں ہوں..... لوگ آئیں گے اور میری بیوی کو اب دیدہ دیکھ کر پوچھیں گے کہ کیا ہوا اور وہ کہے گی کہ میرے خاوند ملی ہو گئے..... اور وہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے چلے جائیں گے اور میں عیدیوں کی رقم بچا لوں گا..... یہ ہے عیدیاں بچانے کا صحیح طریقہ..... میری طرف سے آپ کو بھی میاؤں عید مبارک..... میاؤں میاؤں۔

ہو ر سناؤ کی حال چال اسے؟

”اچھا تو پھر خدا حافظ؟“

”بھئی ٹھہر دو تو سہی اتنی جلدی بھی کیا ہے..... کوئی بات رہ تو نہیں گئی؟“
”نہیں..... بیجے آدھ گھنٹہ سے ہم لوگ فون پر گفتگو کر رہے ہیں، تمام باتیں تو ہو چکیں۔“

”لیکن پھر بھی یار..... کیا حال ہے؟“

”بتا یا تو ہے ٹھیک ہے..... اچھا تو پھر.....“

”اوہ تو ہمیں جلدی کس بات کی ہے..... باقی سب خیریت ہے نا؟“

”ہاں بتا تو چکا ہوں کہ خیریت ہے.....“

”اور اس کے علاوہ بھی خیریت ہے..... اچھا تو پھر خدا حافظ.....“

”اوہو اب یاد آیا کہ ایک بات تو پوچھنا ہی بھول گیا؟“

”وہ کیا بات ہے؟“

”ہو ر سناؤ کی حال چال اسے.....“

یہ آخری فقرہ ہم پاکستانیوں کا تملیہ کلام ہے اور یہ عین اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب ہم دنیا جہان کی باتیں کر چکے ہوتے ہیں۔ اور کہنے کو کچھ باقی نہیں رہتا تب پوچھا جاتا ہے کہ ہو ر سناؤ کی حال چال اسے.....

شاید ہے کہ ایک سابق صدر سے ملنے کے لئے سبب ایک غیر ملکی سربراہ مملکت

تشریف لائے، تو مترجم کے توسط سے جو گفتگو ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔
سابق صدر کہتے ہیں "ان سے پوچھو ان کی طبیعت کیسی ہے؟
غیر ملکی سربراہ اپنی زبان میں جواب دیتا ہے اور مترجم اس کا ترجمہ کر کے
کہتا ہے کہ جناب فرماتے ہیں کہ میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔
"اچھا ان سے پوچھو ان کے بال بچے کیسے ہیں؟
اس کا جواب بھی آگیا۔

"اچھا ان سے پوچھو کہ ان کا کیا حال چال ہے؟
بتایا گیا کہ غیر ملکی سربراہ کہتے ہیں کہ حال چال ٹھیک ہے۔"
"اچھا.... تو ان سے پوچھو کہ طبیعت تو ٹھیک ہے؟
مترجم نے بصداد کہا کہ جناب یہ پوچھا جا چکا ہے اس پر کہا گیا کہ اچھا
ان سے پوچھو کہ بال بچے راضی ہیں؟.... مترجم نے پھر کہا کہ جناب یہ بھی پوچھ
چکے ہیں اس پر سابق صدر نے کہا کہ اچھا تو پھر اس سے یہ پوچھا کہ ہو رکی حال چال
اسے.....؟

میرے ایک دوست مشاق بٹ ایک طویل عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں
اور بال بچوں کے ہمراہ مقیم ہیں ہر دو سال بعد وطن کا چکر ضرور لگاتے ہیں اور
ایئر پورٹ پر اترتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں کہ ہو ر سناؤ کی حال چال اسے؟....
چونکہ بہت عزیز دوست ہیں اس لئے سب لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں
گھمایا پھرایا جائے ان کا خاطر تواضع کی جائے۔ مگر بٹ صاحب سفر کی ٹھکن تارنے
کے بعد سب سے پہلی فرمائش یہ کرتے ہیں کہ بھائیو مجھ سے باتیں کرو..... میں
ترس گیا ہوں باتیں کرنے کے لئے..... صرف باتیں؟ ہم شروع شروع میں
بے حد حیران ہوئے کہ مشاق کو کیا ہو گیا ہے شاید اپنی امریکی معلومات عامہ کا

عجب جمانے کے لئے ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ نہیں مشاق
صرف ایسی باتیں کرنا چاہتا ہے جن کا کوئی مطلب نہ ہو۔ کوئی سرپرست ہو یعنی
باتیں برائے باتیں..... ہمیشہ کہتا ہے کہ یارو امریکہ میں کسی کے پاس اتنا وقت
ہی نہیں کہ وہ تم سے باتیں کر سکے اپنے بیٹے کے ساتھ گپ لگانے کی کوشش
کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے، ڈیڈی آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بیٹی کہتی ہے
ڈیڈی آپ ذرا اپنا میڈیکل چیک اپ کروائیے۔ منیٹل چیک اپ اس لئے نہیں
کہتی کہ ابھی پوری طرح امریکی نہیں ہوئی..... اور یارو میں ان تین برسوں کا
کیا کروں جو میں نے اپنے وطن میں گپیں لگاتے گزارے ہیں۔ میں باتیں نہیں کر سکتا
تو میرا پیٹ اچھڑ جاتا ہے اور اسی اچھڑا کو درست کرنے کے لئے میں ہر دوسرے
برس پاکستان آجاتا ہوں پنا سچہ مجھ سے باتیں کرو۔ اور جب باتیں ختم ہو جاتی ہیں
تو مشاق بٹ کے پاس ایک اور ٹریپ کارڈ ہوتا تھا اور وہ مسکراتا ہوا کہتا
تھا۔ ہو ر سناؤ کی حال چال اسے؟ جب اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے تمام
دوستوں کے حلق سوکھ جاتے تو وہ میری دکان پر آجاتا اور وہاں مرگ پر کھڑے خواجہ
فروشن اور ریڑھیوں والوں کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیتا..... واپسی پر ہمیشہ بے حد
غوش و خرم ہوتا اور اپنے وسیع پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ بس پاکستان آنے کا
مقصد پورا ہو گیا ہے اب میں آئندہ دو سال کے لئے بالکل تندرست رہوں
گا.....؟

"ہو ر سناؤ کی حال چال اسے؟" صرف گفتگو کو طول دینے کے لئے یا گپ بازی
کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ فقرہ کئی سنجیدہ محفلوں میں بھی سننے میں آتا ہے
مثلاً ہمارے ایک دوست کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بیشتر دوست دسویں کے روز
تغزیت کرنے کے لئے پہنچے۔ ہم سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے کہ ایک صاحب

تشریف لائے، تعزیت کی وجہ مرگ دریافت کی دنیا کی بے ثباتی پر چند فقرے کہے اور پھر نیم دراز ہو کر پوچھا اچھا تو پھر باقی سب خیریت سے ناں؟..... ہو سناؤ کی حال چال اے؟

ہمارے گاؤں کی ایک بزرگ خاتون ہیں، خاوند فوت ہو چکے ہیں، دو بیٹے انگلستان میں رہائش پذیر ہیں خود ایک کچے مکان میں تن تنہا رہتی تھیں پھر بیٹوں نے منت سماجت کی کہ اماں زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا یہاں ہمارے پاس اللہ کا دیاسب کچھ ہے، ہم دونوں کی خواہش ہے کہ تم اب یہیں ہمارے پاس آ جاؤ..... بڑی اماں نے مکان کو تالا لگا دیا اور چادر اوڑھ کر ولایت چلی گئیں..... چار ماہ قیام کیا اور پھر واپس آ گئیں..... کہنے لگیں وہاں ماشاء اللہ میرے بیٹے ہیں پوتے پوتیاں ہیں کاریں اور فریج ہیں سب کچھ ہے پر مجھ سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں بیٹے اپنے سٹور میں مصروف رہتے ہیں بچے اپنے سکول کالجوں کو چلے جاتے ہیں اور ہورائیاں گھر کے کام کاج میں لگن ہو جاتی ہیں۔ مجھے کہتے تھے کہ اماں جی جا کر سیر کر آؤ پارک میں..... میں پارک میں بیٹھی رہتی تھی رچھٹی کے دن سارے آرام کرتے تھے..... پترتین مہینوں میں تو میری زبان کو آئی لگ گئی رہیں نے سوچا دفع کر دو ولایت کو بھلا آخری عمر میں بھی انسان منہ بند کر کے فوت ہو جائے تو اس انگلستان کا کیا فائدہ..... اس وقت بڑی اماں کے پاس محلے کی کوئی درجن بھر عورتیں جمع تھیں جنہیں وہ لہک لہک کر ولایت کے نقشے سنا رہی تھیں جب کبھی سانس لینے کے لئے رکتیں تو کسی نووارد خاتون کو "ہو سناؤ کی حال چال اے کیکن؟" کہہ کر پھر شروع ہو جاتیں وہ بے حد خوش تھیں اور بے حد صحت مند تھیں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی وجہ سے بے حد پریشان ہیں یا کسی ضروری کام کے لئے جا رہے ہیں تو کوئی صاحب آپ کو پہچان دیتے ہیں اور قریب

اگر کہتے ہیں السلام علیکم غابر ہے آپ رک کروا علیکم السلام کہتے ہیں اور ہاتھ ملاتے ہیں اس پر وہ ہاتھ تھامے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کیا حال چال ہے آپ بتاتے ہیں کہ الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں وہ تھوڑی دیر چپ رہتے ہیں جس کے دوران آپ دوشگوار ہونے کے لئے زبردستی مسکراتے رہتے ہیں اور پھر وہ کہتے ہیں ہو سناؤ کی حال چال اے؟..... آپ پھر کہتے ہیں کہ بس جی دعا ہے آپ کی رو بہ دستور ہاتھ تھامے رہتے ہیں اور ایک طویل وقفے کے بعد کہتے ہیں اچھا پھر ہو رکی حال چال اے؟..... آپ ہاتھ چھڑاتے ہیں اور غصے سے ابلتے ہوئے چلے جاتے ہیں پرچھے سے آواز آتی ہے "یہ لوگ بڑے ہد دماغ ہوتے ہیں تمہارے بات بھی نہیں کرتے"

جس طرح ایک سکھ نے جب ہزبان انگریزی چند گالیاں دی تھیں اور پھر تسلی نہ ہونے پر "فرور مور" کہہ کر خالص پنجابی میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی اس طرح ہمارے ہاں جب دنیا جہاں کی باتیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر بھی تسلی نہیں ہوتی تو پھر ہو سناؤ ہو رکی حال چال اے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس فقرے کا ایک مختلف استعمال پچھلے دنوں عید شاپنگ کے دوران مجھ پر کیا گیا بچوں کے ہمراہ ایک اسٹور میں داخل ہوا تاکہ ان کے لئے نئے کپڑے اور بوٹ وغیرہ خریدے جاسکیں، مجھے دیکھ کر ایک سیلز مین آگے آیا اور کہنے لگا "فرمائیے تار صاحب کیا خدمت کر سکتا ہوں..... چونکہ بحث مختصر تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے اشیاء کی قیمتوں کا اندازہ لگا لیا جائے..... بچے کی ایک ٹی شرٹ کی قیمت پوچھی تو جواب ملنے پر دو سو روپے صرف..... بوٹ بھی دو سو روپے کے تھے، عرض کر کوئی ایسی چیز نہ تھی جو سو روپے سے کم ہو سوائے جرابوں یا بنیانوں کے..... چونکہ یہ اسٹور میرے پرائس ریجنج سے باہر تھا، اس لئے میں باہر آنے لگا تو سیلز مین نے مسکراتے ہوئے پوچھا "ہو سناؤ کی حال چال اے؟..... یعنی لگ پتہ گیا ہے ناں.... میاں خیال

سہے کہ ان دنوں تمام اشیاء پر ان کی قیمتیں درج کرنے کے علاوہ یہ فقرہ بھی لکھ دینا چاہیے یعنی بچے کی پتلون دوسو روپے، ہو ر سناؤ کی حال چال اسے؟..... ایک عید کارڈ، بیس روپے، ہو ر سناؤ..... بچی کا فراک سوا دو سو روپے، ہو ر سناؤ..... مردانہ سوٹ ساڑھے تین سو روپے، ہو ر سناؤ..... وغیرہ وغیرہ

در اصل آج صبح سے میں اپنے کالم کے لئے کسی نئے موضوع کی تلاش میں تھا کیونکہ یاد لوگ میرے کتوں، بیسوں، گھوڑوں، طوطوں، موٹر سائیکل لاہور کی سڑکوں اور مہنگائی وغیرہ کے کالموں سے بے حد بیزار ہو چکے تھے لیکن نیا موضوع مل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ سب کچھ کہنے کے بعد قارئین سے پوچھ لیا جائے کہ ہوسناؤ کی حال چال اسے؟.....

ماسٹر اور ٹیچر میں فرق ہوتا ہے

میرا بیٹا نیا نیا سکول میں داخل ہوا تو میں نے اس سے پوچھا "بیٹا آپ کے ماسٹروں کے کیا نام ہیں؟"

وہ کہنے لگا "کوئی ماسٹر ابو؟"

میں نے کہا "بیٹے وہی ماسٹر جو آپ کے سکول میں ہوتے ہیں"

"نہیں ابو ہمارے سکول میں تو کوئی ماسٹر نہیں ہوتے" وہ بولا

ہائیں! غضب خدا کا سکول میں ماسٹر نہیں ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

"کہہ جو رہا ہوں کہ ہمارے سکول میں ماسٹر نہیں ہیں"

"ماسٹر نہیں ہیں تو پھر تمہیں پڑھاتا کون ہے؟"

"مجھے ٹیچر پڑھاتے ہیں؟"

"اچھا..... بہت خوب..... بہر حال آپ کے سکول میں ہیڈ ماسٹر ہوگا"

"وہ بھی نہیں ہے..... ہمارے پرنسپل ہیں"

یہاں پہنچ کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ میرے زمانے میں تو ماسٹر ہوا کرتے تھے اور

میرے بیٹے کے زمانے میں ٹیچر اور پرنسپل تھے چنانچہ گفتگو آگے کس طرح بڑھتی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرا بیٹا کہنے لگا "ابو آپ کے زمانے میں تو ماسٹر ہوا کرتے

تھے ناں تو ماسٹر اور ٹیچر میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "بھئی ماسٹر اور ٹیچر میں بہت فرق ہوتا ہے ماسٹر ہوتا ہے شلوار

قمیض پہنے اوپر سے بندگے کی واسکٹ، سائیکل تھامے، ہینڈل پر مقبلا لٹکائے اور

اس تھیلے میں اکثر اوقات حسب پند ایک عدد چھری..... اور بہت غریب غریبا

قسم کی مخلوق، خواہ مخواہ بچوں کو پڑھاتا رہتا ہے یوشن نہیں پڑھاتا، خواہ مخواہ پڑھاتا ہے اور صرف اس لئے کہ اس کا رزلٹ اچھا آئے اور سینہ تان کر سکول میں چل سکے..... اب شیجر کے بارے میں تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ شیجر کیا ہوتا ہے؟
”ابو ہمارا شیجر تو سوٹ پہنتا ہے اور اس کے پاس مائیکل جیکسن کی ڈھیر ساری کیٹیں ہیں۔“

”بس یہی فرق ہے ماسٹر اور شیجر میں۔“

یہ گفتگو مجھے یاد آئی کہ کل شام ہمارے سکول میں پڑھنے والے اولڈ بوائیز کا ایک اجلاس تھا جس میں بے شمار بوڑھے، گنبھے، ڈبٹے پتلے، موٹے، امیر غریب، لائق اور نالائق، بوائیز جمع تھے پہلے تو حسب معمول کلاس میں کی گئی شرارتوں کے تذکرے ہوئے گفتہ اور ناگفتہ کا بیان ہوا ایک دوسرے پر خوشی خوشی کچھ اچھا لگیا اور پھر گنشگو کا رخ ”ماستروں کی جانب مڑ گیا ہر ایک نے حسب توفیق اپنے ماستروں کی توصیف کی کہ کس طرح وہ مشقت سے بغیر لاپچ کے سببیں پڑھایا کرتے تھے اور آج ہم جو کچھ بھی ہیں ان کی ”پڑھائیوں کے بدولت ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے گا ہم کیا دے سکتے ہیں سوائے دعاؤں کے..... تب میرے ذہن میں وہ تمام ماستر آئے جنہوں نے مجھے پڑھایا بلکہ یوں کہیے کہ پڑھانے کی کوشش کی اور اگر ہم آج تک نالائق چلے آ رہے ہیں تو اس میں ان کا قصور نہ تھا میرا خیال ہے بارے ماستروں کے کچھ بیاں ہو جائے۔

سب سے دہشت ناک یاد ماسٹر دین محمد کی ہے ہم چھٹی جماعت میں تھے پہلے روز فارسی پڑھانے کے لئے ماسٹر دین محمد نظریف لائے کسرتی اور متناسب جسم، جماعت فوجیوں ایسی بڑے مزے سے پہلا سبق پڑھا، گپ شپ لگائی اور

چلے گئے۔ دوسرے روز بھی آئے اور مسکراہٹیں بکھیرتے پڑھاتے رہے۔ چنانچہ وہ وہ ہمارے پسندیدہ ماسٹر ہو گئے نہ ہاتھ میں چھڑی نہ چہرے پر خشونت اور نہ کسی کو کچھ کہنا اور نہ ہی سننا..... ہماری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ سکول کے پہلے دن سینئر لڑکوں نے یہ کیوں کہا تھا کہ ماسٹر دین محمد سے پنج کے رہنا قصائی ہے قصائی..... بھلا اتنے خوشگوار شخص کو قصائی کہنا کہاں کی شرافت ہے..... بہر حال ایک روز ماسٹر صاحب فرمانے لگے کہ بھئی، بچو میں نے تمہیں محنت سے پڑھایا ہے، میری درخواست ہے کہ کل آپ سارا سبق یاد کر کے آئیں میں سنوں گا..... دوسرے روز حسب سابق آئے بچوں سے سبق سنا جس بچے کو یاد ہوتا اسے ایک طرف کھڑا کر دیتے اور جسے نہ یاد ہوتا اسے دوسری طرف، جب یہ کام مکمل ہو گیا تو معلوم ہوا کہ جن بچوں کو کچھ یاد تھا ان کی تعداد چھ ہے اور ہشتیہ حضرات تقریباً تیس ہیں جو کھڑے مسکرائے چلے جا رہے تھے..... ماسٹر صاحب پیچھے مڑے ہم نے سمجھا کمرے سے باہر جانے لگے ہیں لیکن نہیں انہوں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگائی پھر ایک لمبی ساری دبیز چھڑی (بلکہ سوئی) پتہ نہیں کہاں سے برآمد کی اور اسی طرح مسکراتے ہوئے کہنے لگے ”میرے پیارے طالب علموں جن بچوں نے سبق یاد کیا ہے وہ فدا دھر ہو جائیں کیونکہ یہ سارے حنتی ہیں اور جنہوں نے یاد نہیں کیا وہ جہنمی ہیں اور جہنم میں رہنے والوں کو سزا ملنی چاہیے.....“ اس کے بعد انہوں نے چھڑی کو تلوار کی طرح فضا میں بلند کیا اور ”یا علی“ کا نعرہ لگا کر جہنمیوں پر ٹوٹ پڑے دروازہ بند تھا اور پورے دس منٹ ماسٹر دین محمد نے جہنمیوں کو مار مار کر ان کا بھر کس نکال دیا۔ جب وہ کمرے سے باہر گئے تو کلاس روم میں میدان جنگ کے بعد کا نقشہ تھا، اتنی جانوں کو یاد کیا جا رہا تھا، ہانے ہانے کیسا جا رہا تھا، متاثرہ حصوں پر پھونکوں ماری جا رہی تھیں اور آنسو تھے کہ تھکنے میں نہ آتے تھے.....

میں نے ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے یہ تمام ایک طرفہ جنگ دیکھی کیونکہ خوش قسمتی سے میں جنتیوں میں شامل تھا۔

اگلے روز جب فارسی کا پیریڈ آیا تو ہم سب کو نہ صرف "شہیدہ کے بود مانند دیدہ" کا مطلب بھی آتا تھا بلکہ ہم نے شیخ سعدی کے اشعار بھی زبانی یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ ماسٹر دین محمد سب معمول مسکراتے ہوئے آئے لیکن لڑکوں کو دیکھ کر ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ جنتی اور جہنمی آپس میں گھل مل کے کیوں بیٹھتے ہوئے ہیں جنتی ایک طرف اور جہنمی دوسری طرف.....؟ بے چارے جہنمیوں نے عرض کی کہ ماسٹر صاحب سب یاد ہے۔ بے شک سن لیں لیکن ماسٹر صاحب نے چھڑی گھائی اور جنتیوں کو الگ بٹھایا اور جہنمیوں کو الگ..... حسب معمول انہوں نے "یا علی" کا نعرہ لگایا اور جہنمیوں پر ٹوٹ پڑے پانچ منٹ تک انہیں پیٹتے رہے پھر کتاب اٹھا کر آرام سے اگلا سبق پڑھانے لگے اس کے بعد روزانہ یہی ہوتا کہ وہ کلاس میں داخل ہوتے پہلے پانچ منٹ جہنمیوں کی پٹائی کرتے اور پھر پڑھائی کرتے جہنمیوں نے لاکھ منٹ سماجیت کہ ماسٹر صاحب اب تو سن لیں ہمیں یاد ہے ہمیں یاد ہے لیکن ماسٹر صاحب کہتے کہ جو ایک مرتبہ جہنم میں چلا گیا سو چلا گیا واپس نہیں آ سکتا..... پورے دس روز بعد انہوں نے پھر سبق سنا اور اس مرتبہ سارے ہی جنتی ہو گئے۔

جب کبھی ایران سے گزر ہوا مجھے ماسٹر دین محمد بہت یاد آئے وہ بہت بے دردی سے پیٹتے تھے لیکن تہران میں، تہریز میں، مشهد میں انہی کے یاد کرائے ہوئے فارسی کے لفظ بول کر میں نے راستے دریافت کیے، ایرانیوں کے ساتھ گفتگو کی اور میں ان کا شکر گزار ہوں۔

اسٹھویں جماعت میں ہمارے حساب کے استاد ماسٹر نادر خان تھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دراصل نادر شاہ ہیں۔ موٹے کھدر کی شلوار قمیض، اوپر کوٹ بڑی بڑی نادر شاہی موچکیں اور طرے دار پگڑی کہیں ملاقات ہو جاتی تو ہاتھ ملانے کی بجائے طالب علم کا کان پکڑ کر زور زور سے کہنپتے اور کہتے "اوتے کیا حال ہے تیرا؟" اور جواب آتا "ہائے ماسٹر جی بڑا اچھا ہائے حال ہے" میرا حساب تو واجبی تھا لیکن الجبرے میں سو فیصد پیدل تھا اس کے لئے جتنی مار میں نے کھائی ہے اس کے لئے میں الجبرے کے موجد کو کبھی معاف نہیں کر سکتا ماسٹر نادر خان بھی میری اس کمزوری سے واقف تھے چنانچہ سر دیوں کی خوشگوار دھوپ میں جب اوپر انر کلاس میں شروع ہو جاتیں تو ماسٹر صاحب بیک بود پر سب سے پہلے الجبرے کا کوئی سوال لکھ دیتے اور کہتے "آنا تو ادھر مس تن سر اور نکالنا ہاں ذرا یہ سوال میں رزنی ٹانگوں سے لڑکھڑاتا ہوا تختہ سیاہ کی جانب یوں روانہ ہوتا جیسے پھانسی کے تختے کی جانب جا رہا ہوں چاک ہاتھ میں لیتا سر کو کھجاتا اور اس طرح گہری سوچ میں غرق ہو جاتا جیسے اس سے پیشتر سوچنے کے عمل سے میں الجبرے کا سوال حل کر لیا کرتا ہوں۔

"اوتے کدھر چلا گیا ہے؟" ماسٹر صاحب گرجتے اور میں چاک رکھ کر ان کے سامنے اپنی ہتھیلیاں کھول دیتا..... اور چھڑی کی ضرب سے پیشتر ہی "ہائے ماسٹر جی" کا نعرہ لگا دیتا۔

ورینکلر فائنل کا امتحان سر پر آیا تو ماسٹر نادر خان کو بخار چڑھ گیا وہ دن رات ایک کر کے طالب علموں کو پڑھانے لگے۔ رات کی کلاسیں اس طرح شروع ہوئیں کہ ایک روز ماسٹر صاحب نے چھٹی کے وقت حکم دیا کہ آج سے تمام لڑکے شام کا کھانا

ماسٹر صاحب کے چہرے کی رنگت بدلی دانت چلکپائے لیکن وہ کچھ بولے نہیں اور نظریں نیچی کر کے پڑھانے لگے چونکہ سردی تو تھی اس لئے آہستہ آہستہ باقی لڑکوں کی ٹانگیں اور ہاتھ میری رضائی کی گرمی میں پہننے لگے تھوڑی دیر بعد نصف سے زیادہ کلاس میری رضائی سے لطف اندوز ہو رہی تھی اس موقع پر ماسٹر نادر خان نے بلیک بورڈ پر الجبرے کا ایک سوال لکھا "آہاں رضائی والے باؤ نکال یہ سوال" اب ظاہر ہے یہ صریحاً خود کشی کی دعوت تھی میں نے رضائی کو اپنے آپ سے علیحدہ کیا اس سوال کو دیکھا جو میری موت تھا ماسٹر نادر کے ہاتھ میں پکڑے بید کو دیکھا جو میرا منتظر تھا اور بلیک بورڈ کی جانب آہستہ آہستہ قدم قدم اٹھانے لگا یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت نوازش کو کمرے میں روشن بجلی کے واحد بلب کے بشن کو آف کر دینا تھا..... چنانچہ عین اس وقت جب میں تختہ دار پر چڑھنے کو تھا روشنی گل ہو گئی اور دھما پوکڑی مچ گئی ماسٹر صاحب اپنا بید اٹھائے اندھیرے میں ہی حساب کتاب لگاتے مجھ پر وار کرنے لگے لیکن میں واپس اپنی رضائی میں پہنچ چکا تھا جس کی دبیز تہیں میرے لئے ڈھال کا کام دے رہی تھیں اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیشتر لڑکے کھسکتے کھسکتے کلاس روم سے بھاگ گئے اور ان میں میں بھی شامل تھا اپنی رضائی سمیت..... دوسری صبح ماسٹر نادر نے ہمیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دیا اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی..... بہت عرصہ بعد ایک روز میری دکان پر ایک بوڑھا شخص آیا جس کی مونچھیں مردہ ہو چکی تھیں آواز میں تھراہٹ تھی اور آنکھیں سمجھ رہی تھیں میں نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے مجھے لگے لگا لیا۔

"مستغفر میں بڑے فخر سے لوگوں کو کہتا ہوں کہ تو میرا شاگرد ہے..... میری آنکھوں میں نمی کی ہلکی تہ اتر آئی یہ ماسٹر نادر خان تھے..... ہاں ماسٹر اور مجھ میں بہت فرق ہوتا ہے....."

کھا کر سید سے سکول آئیں اور یہاں پر تین گھنٹے مزید پڑھائی ہوگی۔ جملہ طالب علموں کی تو بس جان ہی نکل گئی کہ اب دن کے بعد رات کو بھی شامت آئے گی اور ہاں اس ایکسٹرا پڑھائی کے لئے کوئی علیحدہ فیس وغیرہ نہیں تھی صرف ماسٹر نادر خان کی لگن تھی ایک دو لڑکوں نے حسب توفیق بھانے بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گئے تب مجھے پسلیوں میں ٹھوکے دے دے کر کہا گیا کہ تم ہی کچھ کرو میں کھڑا ہو گیا جناب ماسٹر صاحب جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کل سردیوں کا زمانہ ہے سردی بہت ہے ہم چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح سکول پہنچیں گے؟

"نہیں پہنچیں گے تو اگلے دن بیس بیس بید کھائیں گے چھوٹے چھوٹے بچے" ماسٹر صاحب گرج کر بولے۔

"میں جی پھر کمبل لے آؤں ساتھ....." میں نے گزارش کی۔

"تو کمبل چھوڑ رضائی لے آنا..... پر آ جانا ورنہ" وہ بھنا گئے۔

اس شام کھانے کے بعد میں نے گھر کی سب سے طویل و عریض رضائی سائیکل کے کیرٹر پر باندھی اور سکول پہنچ گیا جو سنہی میں رضائی سر پر اٹھائے کلاس روم میں داخل ہوا وہاں رضائی زندہ باد کے نعرے لگنے لگے چونکہ شام کی نشتر کے لئے کمرے میں سے ڈیسک اور کرسیاں وغیرہ اٹھا کر صفیں بچھا دی گئی تھیں اس لئے میں نے آرام سے ایک کونے میں رضائی رکھی اور اسے اوڑھ کر بڑے مزے سے ٹیک لگا کر براجمان ہو گیا۔ ماسٹر نادر کمرے میں داخل ہوئے طالب علموں کی تعداد دیکھ کر بہت خوش ہوئے بلیک بورڈ صاف کر کے اس پر کوئی سوال لکھنے لگے تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ "اوسے تو حقہ پینے آیا ہے یہاں مستغفر..... یہ رضائی کس کی ہے؟ میں نے ذہین، میٹھے، میٹھے کہا۔" ماسٹر صاحب میری ہے اور آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ تو کمبل چھوڑ رضائی لے آنا۔"

خواب دیکھ رہا تھا ٹھنڈک خشکی اور خوشگوار موسموں کے۔

”السلام وعلیکم“ میرے شہر قپوری دوست مرزا صاحب جانے کہاں سے بھول پڑے ”اڈے ہوئے بہت گرمی ہے آج تو.....“ میرا خیال ہے درجہ حرارت ایک سو پندرہ سے کم نہیں ہوگا۔“

مرزا صاحب کا ہاتھ بھی تپ رہا تھا وہ مانتا پونچھتے ہوئے بیٹھ گئے ”بس بھی یہ تو پہاڑوں پر جانے کے موسم ہیں چشتے ہوں آبشاریں ہوں اور برفیں ہوں....“ کیا خیال ہے؟

”میں تو وہاں پہنچا ہوا ہوں مرزا صاحب“ میں نے بھی ماتھے سے پسینہ پونچھا ”چشتے آبشاریں اور برفیں واہ واہ مرزا صاحب.....“ پھر کب چلتا ہے؟

”یہ گھوٹے پھرنے کا شوق تو آپ نے پال رکھا ہے آپ جہاں کہیں گے چلے چلیں گے جہیں تو ٹھنڈک چاہیے پہاڑوں کی اور بس“

اتنی دیر میں شاہ صاحب بھی آگئے بالکل حواس باختہ کبھی مسکرانے لگتے اور کبھی سنجیدہ ہو کر ہم دونوں کو دیکھنے لگتے ہم نے جان لیا کہ گرمی کا اثر ہے چنانچہ ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھالیا۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جہیں تو ٹھنڈک چاہیے پہاڑوں کی.....“ مرزا صاحب بولے ”پھر کب چلتا ہے؟“

”کہاں چلنا چاہیے؟“ شاہ صاحب کی بتیسی باہر آگئی ”اے ظالمو کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر؟.....“ اے پہاڑوں پر جا رہے ہو.....؟ اے چشتے آبشاریں..... چلو چلو پہاڑوں پہ چلو..... لاہور سے نکلو یا روکسی ٹھنڈی جگہ چلو پر مجھے ساتھ لے کر چلو۔“

”ہاں جی اب ہم تین ہو گئے ہیں“ مرزا صاحب میرے قریب آگئے بتلیے

چلو چلو پہاڑوں پر چلو

یہ وہ دن ہیں جب جلتے سورج کا کچھ حصہ الگ ہو کر پاکستان پر گرتا ہے اور اس کی گلیوں اور بازاروں میں پگھلنے لگتا ہے نہ صرف یہ کہ جلتا ہوا سورج گلیوں بازاروں میں پگھلتا ہے بلکہ یہ انسانوں کے جسموں کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھونکتا ہے ان کا خون ابلنے لگتا ہے ہر شخص جو گھر سے نکلتا ہے اور سورج کی زد میں آتا ہے..... خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ٹھنڈک خشکی اور خوشگوار موسموں کے خواب وہ یوں تو موچی دروازے کے باہر سرکلر روڈ کی تپتی ہوئی سطح پر چل رہا ہوتا ہے لیکن وہ خوابوں میں ٹھنڈے نم چشموں میں چل رہا ہوتا ہے اور اس کے گرد سر ہلک برف پوش پہاڑ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ٹنک ہوائیں آرہی ہوتی ہیں جو اس کے چہرے اور بدن کو چھوتی ہیں بس کچھ یہی حال میرا تھا لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بجلی بند تھی اور باہر سڑک پر دو پہر اپنی پوری شان و شوکت سے تپ رہی تھی بازار سنان پڑا تھا رمضان کی وجہ سے ٹریفک بھی بہت کم تھی پسینہ مجھے جگمگ رہا تھا اور لوہے کی جس کرسی پر میں بیٹھا تھا وہ بھی میرے پسینے سے ٹھنڈی ہونے کی کوشش کر رہی تھی میرے بھیگے ہوئے ماتھے پر مکھیاں بیٹھی تھیں اور میں ادنگ رہا تھا کبھی کبھار بازار میں سے کوئی تانگہ گزر جاتا اور گھوڑے کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز مٹھری جھونکی گرم دوپہر میں دیر تک معلق رہتی پیاس سے زبان سوکھ رہی تھی اور کبھی کبھار جو جھونکا آتا وہ گرم لوکا ہوتا..... میں بھی

پر وگرام کہاں چلنا ہے۔ کاجوں میں پھٹیاں ہو گئی اس نے ہم تو فارغ ہیں۔
 "ہاں بالکل فارغ" شاہجی بڑی بھاجت سے بولے "کوئی کام نہیں میں یار
 لکھو یہاں سے ہم لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں اس خوفناک جہنمی گرمی میں ہم کیا سوچ
 سکتے کیا لکھ سکتے ہیں یا رو اس موسم میں کب شاعری کریں یہ کہ منی کا آن پہنچا ہے
 مہینہ..... یہ شاعری کروں؟ بس میں راضی ہوں تم مجھے بھی لے چلو۔"
 "کیسی جگہ چلیں؟ میں نے پوچھا۔

"بس برفیں ہوں ٹھنڈی ٹھنڈی اور پانی ہوندیوں کا جو گلشن میں سے آ
 رہی ہوں اور پہلو میں کوہ کے ایک چھوٹا سا بھونپڑا ہو..... کیا ہو؟" شاہجی تو
 شاید وہاں ابھی سے پہنچ گئے تھے۔

"بھونپڑا کیا کرنا ہے شاہ" مرزا صاحب ہانپتے ہوئے بولے "کوئی نیمہ شبیمہ ہو
 اپنا اور لگایا ہو کسی بھیل کے کنارے اور پھر بندہ اس میں اپنے پاؤں ڈال کر بیٹھا
 رہے.....؟"

"اور ساتھ میں چل رہی ہو کیست نور جہاں کے پنجابی گانوں کی..... سن دے
 بلوری اکھ والیا" شاہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"شاہجی" مرزا صاحب اس کے کندھے پر ایک دھپ لگاتے ہوئے بولے
 "مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی۔"

"کیوں؟" شاہجی ہراساں ہو گئے "میں نے کیا کیا ہے؟"

"کسی نیلی بھیل کے پانیوں کے قریب نیمہ لگا ہوا درسن دے بلوری اکھ والیا۔
؟ لاجول ولا۔"

"نہیں تو نہ سہی" شاہجی فوراً بیک آؤٹ کر گئے "دوستوں کی مرضی ہے
 نہیں تو نہ سہی۔"

"ہاں جی آپ کیوں گلگھو بن کے بیٹھے ہو؟" مرزا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو
 کر کہا "پھر کہاں چلنا ہے؟"

"سوات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک خیال ہے" شاہ نے سر ہلایا "اچھی جگہ ہے اچھی جگہ ہے۔"

"تم گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں پردوست کہتے ہیں کہ اچھی جگہ ہے تو اچھی ہی ہوگی" شاہ نے مونچھوں
 کو بل دیا۔

"ادھر بہت لوگ جاتے ہیں" مرزا صاحب کہنے لگے "خاص طور پر فلموں والے
 اور ہم تو کوئی خاص جگہ جائیں گے جہاں اور کوئی نہ جاتا ہو..... مثلاً.....
 دادئی کا غان چلیں؟"

"بالکل چلیں" شاہ نے پھر سر ہلایا "اچھی جگہ ہے۔"

"آپ گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ نے مجھے گھورا" میں نے بھی کیا ہوں تو مجھے کم از کم یہ تو پتہ ہے کہ جوں
 کے مہینے میں گواٹمنڈی بازار سے دادئی کا غان بہتر اور اچھی جگہ ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "میں بھی دو تین مرتبہ وہاں گیا ہوں..... کیا ہوا
 ہے وہاں کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا اور لالہ زار میں کھلے پھول اور.....؟"

"اے بھائی" شاہ نے مجھے جھنجھڑا "مجھے بھی کچھ بتاؤ وہاں پانی ہے؟ کوئی
 بھیل وغیرہ؟"

"بھیل سیف الملوک.....؟" مرزا صاحب ایک دم گم ہو گئے "ہائے ہائے
 کیا بھیل ہے۔"

"اچھا" شاہ صاحب ان کے قریب ہو گئے جیسے وہ مرزا صاحب نہ ہوں

بھیل سیٹ الملوک ہوں یعنی کہ ہائے ہائے کیا بھیل ہے واہ سن دے
بلوری اکھ والیا

”شاہ جی مجھے ایسے مذاق پسند نہیں“ مرزا صاحب اپنے خوابوں سے فوراً
واپس آگئے وہ قدرے ناراض تھے۔

”پر یا روج ہی کیا ہے میں ایک کیسٹ ساتھ لے جاؤں گا نور جہاں کی۔“
”پھر ہم ساتھ نہیں جائیں گے“ مرزا صاحب نے فیصلہ دے دیا۔

”اچھا یا رہیں گزارہ کروں گا تم پروگرام بناؤ۔“

”پھر کاغان ہی جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی اور جگہ نہیں ہے؟ جہاں ہم پہلی مرتبہ جائیں کہیں اس دنیا سے الگ
کسی بڑے پہاڑی سلسلہ کے قریب۔۔۔۔۔“

”پہلو میں کوہ کے ایک چھوٹا سا۔۔۔۔۔“ شاہ نے ہماری طرف دیکھا اور پھر
بیتنے پر ایک دو ہتھ مار کر بولے ”جھونپڑا ہو۔۔۔۔۔ ہائے ہائے جھونپڑا ہو یا رمجھے
نکالو اس گرمی سے چلو پہاڑوں پر“ ہم نے اسے تسلی دی کہ یہی ہندوستان تو کر
رہے ہیں۔

”میں پچھلے برس وادی ہنزہ اور شمالی علاقوں کی طرف گیا تھا۔۔۔ وہاں چلیں؟“
”وہاں برفیں ہیں؟ شاہ نے دریافت کیا۔

”وہاں دنیا کے طویل ترین گلیشئرز ہیں“ میں نے کہا۔

”اور گلیشئرز عام طور پر برف کے بنے ہوتے ہیں“ مرزا صاحب نے شاہ صاحب
کو بتایا۔

”اور وہاں راکا پوشی اور نانگا پربت جیسی برف پوش چوٹیاں ہیں“

”ہائے نانگا پربت“ شاہ نے دہائی دی ”یہ کدھر ہے یا رمجھے نانگا پربت

کے پاس لے چلو“

”شاہ جی آپ آرام سے نہیں بیٹھو گے تو ہم پروگرام کیسے بنائیں گے؟ مرزا
صاحب نے ناراض ہو کر کہا۔

”شاہ نے ہونتوں پر انگلی رکھی اور ایک بیسے بچے کی طرح کونے میں بیٹھ گیا۔

”ہاں جی شمالی علاقوں میں کس مقام پر جایا جائے جہاں چٹے ہوں آبشاریں ہوں“

”وہ علاقے دنیا کے خوبصورت ترین حصہ ہیں وہاں ہم پہاڑوں میں پیدل

سفر کر سکتے ہیں اور ایسے مقامات تک پہنچ سکتے ہیں جہاں شاید آج تک

کوئی نہ گیا ہو مثلاً ایک مقام ہے جسے پریوں کا باغ کہا جاتا ہے پندرہ ہزار

فٹ کی بلندی پر ایک گھنا جنگل ہے اور پھول ہیں اور سرد ہوا ہے اور ندیاں ہیں“

”ہائے ہائے ندیاں ہیں“ شاہ بے اختیار بول پڑا ”اور ان میں ٹھنڈا پانی

ہے چلو یا روج چلو ابھی چلو“

”ہم نانگا پربت کے قریب روپل وادی میں جا سکتے ہیں جو بے حد خوبصورت

ہے“

”اور وہاں سے نانگا پربت نظر آتی ہے؟“ شاہ نے پوچھا اور میں نے اثبات

میں سر ہلایا ”تو پھر چلو۔۔۔۔۔ بندہ نانگا پربت کے سامنے بیٹھا ہو اور کیسٹ لگی ہو

نور جہاں کی تینوں سامنے بٹھا کے شرمانا۔۔۔۔۔ ہائے ہائے“

ہم تینوں سورج ڈھلنے تک چٹنوں آبشاروں اور ندیوں کی باتیں کرتے رہے

اور پروگرام طے کرتے رہے لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ جوں جوں سورج ڈھلنا گیا

ہم بھی کچھ ٹھنڈے ہوتے گئے لاہور جو بھیں بہت گرم اور بہت فضول شہر

لگتا تھا اب قدرے بہتر لگنے لگا گوالمندھی بازار میں چمپل پہل شروع ہو گئی اور

ریڑھیوں والوں کی آوازیں ہر سو گونجنے لگیں۔

”یار یہ جو ہے گلگت اور ہنزہ وغیرہ ہیں یہ بہت دور نہیں؟“
شاہ نے کہا۔

”سنا ہے کہ فلائٹ بڑی مشکل سے ملتی ہے اور دیسے بھی خطرناک راستہ ہے“ مرزا بولا۔

”خطرناک راستہ ہے؟ شاہ چونکا“ لوہم نے وہاں ٹھنڈے لے جانا ہے یا ٹھنڈے ہونے جانا ہے؟“

”میرے ایک ڈرامے کی ریکاڈنگ بھی ہے اس جتنے“ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے لئے تو بہت مشکل ہو جائے گا یہاں سے نکھنا۔“
”دیسے تو شترچور بھی اتنا گرم نہیں دریا قریب ہے ضرور پیسے خرچ کے در بدر کی ٹھوکریں کھانی ہیں“ مرزا صاحب نے سر ہلایا۔

”بالکل“ شاہ نے سر ہلایا ”یا ڈاگے مہینے چلیں گے مری وغیرہ بیویوں کو بھی لے جائیں گے بندہ آرام سے کسی ہوٹل میں ٹھہرے شام کو کڑا ہی تکہ کھائے اور کشمیر پوائنٹ پر جا کر سنے کیسٹ“ سن وسے بلوری اکھ والیا ”اچھا جی خدا حافظ مجھے ایک فنکشن پر مضمون پڑھنا ہے“ شاہ اٹھا اور چلا گیا۔

لوہی چہر میری دیکھ کا بھی وقت ہو گیا ہے ”مرزا صاحب بھی تھوڑی دیر بعد اٹھے اور ہاتھ ملا کر چلے گئے۔“

برفوں، خنک ندیوں، نیلی جھیلوں اور سرد آبشاروں کا آج کا خواب ختم ہوا۔
..... کل سورج پھر جلنے کا تو پھر شروع۔

لاہوری محاورے .. اوہ آئے!

ہندوستان کے ایک مسلمان ادیب کسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے بیشتر ادیبوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں کسی نے اپنے ادب سے انہیں متاثر کیا کسی نے طرح طرح کے کھانوں سے اور کسی نے اپنے گھر کی زیبائش سے موصوف آئے تین روز کے لئے تھے مگر تین ہفتوں کے بعد گئے اور بڑی مشکل سے گئے مجھے ان کا نام بھولتا ہے کیونکہ معروف ادیب نہیں تھے چونکہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم ادیب ہو کر تے ہیں اس لئے ہم نے مان لیا اور ان کے اس بیان پر باہمی دوستی اور بھائی چارے کے رشتوں کو فروغ دینے کی خاطر شک نہیں کیا..... بہر حال آئینہ اب گھر پر پھر آدھکے..... اس دوسری آمد پر مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی اور باہمی دلچسپی کے امور پر سیر حاصل گفتگو ہوئی میں نے پوچھا اگر لاہور میں کسی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو مجھے یاد کیجئے کہنے لگے ابھی یاد کیجئے یقیناً ہوں مجھے بے حد تکلیف ہے میں نے پوچھا کس قسم کی؟ کہنے لگے زبان کی تکلیف ہے میں نے تشویش کا اظہار کیا اور کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا وہ تبسم فرما کر بولے نہیں صاحب میری زبان میں تکلیف نہیں ہے دراصل لاہوری حضرات جو اردو بولتے ہیں۔ اس کو سمجھنے میں مجھے وقت ہوتی ہے میں نے عرض کیا کہ حضور ادھر کی اردو قدرے مختلف ہے بلکہ خاصی مختلف ہے لاہور یا پاکستان کے دیگر شہروں میں بولی جانے والی اردو کا ناک نقشہ آپ کی مکھنوی اردو سے جدا ہے کہنے لگے نہیں نہیں اردو تو تقریباً وہی

زبردستی پکڑ کر ان کا رخ ادھر کر دیتے ہیں لاہور میں یہ محاورہ عام ہے اندرون شہر ایک صاحب اپنے دوست کے والد کی وفات پر تعزیت کرنے گئے ان کی فوتیگی کا سبب پوچھا تو دوست نے بتایا کہ دیسے تو بیمار بھی تھے لیکن آخری عمر میں والد صاحب تھوڑے سے میٹر ہو گئے تھے مجھے امید ہے کہ اس محاورے کا مطلب سمجھ میں آگیا ہوگا اگر نہیں آیا تو معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آپ بھی میٹر ہیں۔

(۲) جگر ہونا اہل لاہور چونکہ کھانے پینے کے بے حد شوقین ہیں بلکہ شدیدانی ہیں اس لئے یہ محاورہ عام ہوا اس کی وجہ تسمیہ کچھ یوں ہے کہ اہل لاہور بکروں مرغوں اور بھینسوں وغیرہ کا گوشت کھا جاتے ہیں ان کی تانگیں کھوپڑیاں مغز گردے کپورے وغیرہ سب کھا جاتے ہیں اور اگر نہیں کھاتے تو ان کا جگر نہیں کھاتے چنانچہ جب وہ کسی دوست کو عزیز از جان ثابت کرنا چاہتے ہوں تو کہتے ہیں کہ ”اُونے وہ تو ہمارا جگر ہے“..... یعنی اتنا عزیز ہے کہ ہم تو اسے کھا بھی نہیں سکتے البتہ کچھ ناعاقبت اندیش حضرات اس محاورے کا بے دریغ استعمال بھی کرتے ہیں اور ان میں سے ایک راشد رانا صاحب ہیں آپ ان کے ساتھ گوالمنڈی یا اٹارکھی کی طائر نکل جانیے ہر قدم پر رکیں گے دانت نکال کر کسی نہ کسی ریڑھی والے سے پان فروش سے دکاندار سے راہ گیر سے بٹل گیر ہوں گے۔ غیر تعزیت دریافت کریں گے اور پھر آگے چلیں گے۔

آپ پوچھئے یہ کون تھا؟
 ”اپنا جگر ہے“ جواب آئے گا۔
 ”اور یہ صاحب کون ہیں؟“
 ”یہ بھی جگر ہیں“
 ”اور یہ؟“

ہے لیکن اہل لاہور کچھ تراکیب کچھ الفاظ ایسے استعمال کر جاتے ہیں کہ میرے پلے کچھ نہیں پڑتا کراچی میں مجھے زیادہ وقت نہیں ہوئی بلکہ ان کی اردو سن کر مومن اور میر کی یاد تازہ ہو گئی ہے کیا محاورہ ہے صاحب اور ہر محلے ہر گلی کا الگ ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس لاہوری انداز کی اردو میں کوئی خاص لفظ جو آپ کو تکلیف دیتا ہے؟

کہنے لگے ایک لاہوری ادیب سے گفتگو ہو رہی تھی کہ اختلاف کا پہلو ظاہر ہوا تو کہنے لگے ”آپ تو میٹر ہو گئے ہو“..... اب آپ ہی فرمائیے کہ یہ میٹر ہونا کیا ہوتا ہے.....

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ”میٹر ہونا“ کسے کہتے ہیں..... بہر حال بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کیوں نہ لاہور کی اردو میں مستعمل چند خصوصی الفاظ اور محاوروں کی تشریح کر دی جائے تاکہ عوام الناس جو دوسرے ملکوں یا دوسرے شہروں سے آتے ہیں پریشان نہ ہوں اور اہل لاہور کی ”زبان دانی“ کو بہتر طریقے پر سمجھ سکیں..... مثلاً از خوار سے والا معاملہ ہے تو ملاحظہ فرمائیے۔

۱) ”میٹر ہونا“ کسی رملنے میں اس حالت کو کہتے ہیں ”کہا جاتا تھا لیکن ان دنوں چونکہ ہر طرف میٹروں کا دور دورہ ہے اس لئے اس لفظ کو قبول کر لیا گیا..... رکشا میٹر گیس میٹر بجلی اور بے شمار قسم کے میٹر ہماری زندگیوں میں چلتے رہتے ہیں ہم ان پر جھکتے ہیں اور ریڈنگ دیکھتے ہیں اور پھر غلطی سوچتے ہیں اگر مناسب قسم کا ٹکڑا دستیاب ہو تو (میٹر ہر وقت چلتے رہتے ہیں یا یوں کہیے گھومتے رہتے ہیں رکشا کھڑا کر دیجئے گھر کی تمام روشنیاں بند کر دیجئے آگ بجھا دیجئے پانی بند کر دیجئے لیکن ان کے میٹر چلتے رہیں گے اور انہیں دیکھ دیکھ کر عوام الناس خود بھی تھوڑے سے میٹر ہو جاتے ہیں جو زیادہ میٹر ہو جاتے ہیں وہ مینٹل ہاسپٹل کا رخ کرتے ہیں۔ یا عزیز واقارب

”جگر“

”اور یہ ہوتے کون ہیں؟“

”پتہ نہیں“

”ان کا نام کیا ہے؟“

”پتہ نہیں“

”تو پھر اتنے پڑوسرست انداز میں بغل گیر کیوں ہو رہے تھے۔“

”جگر جو ہوا“

”ہیرا ہونا نا۔۔۔۔۔ یہ خاصا پتھر محاورہ ہے اتنا آسان نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔ ہیرا جیسا کہ آپ جانتے ہیں بہت قیمتی چیز ہوتا ہے اور اہل لاہور بھی اسے تقریباً انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جب تک حوالے کے ساتھ بات نہ کی جائے صورت حال واضح نہیں ہو سکتی مثلاً۔۔۔۔۔ ایک بڑی اماں رشتے کے لئے آئی ہوئی ایک خاتون کو اپنے برغوردار کے بارے میں کچھ اس طرح بتائیں گی۔۔۔۔۔ بھولے جیسا کہ آپ کو کہیں نہیں ملے گا ٹھیک ہے ابھی کام پر نہیں لگا پر پھر بھی دباڑی بنا لیتا ہے محلے میں کوئی لڑائی بھگڑا ہو تو صلح یہی کراتا ہے ”کٹنے“ سیک دیتا ہے سب کے۔۔۔۔۔ نشہ پانی بالکل نہیں کرتا۔۔۔۔۔ مجھے اس نے خود بتایا ہے کہ نہیں کرتا محلے والوں کا کیا ہے وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں جو اکیلے کی عادت تو شادی کے بعد خود بخود ٹھیک ہو جائے گی یوں سمجھیں کہ میرا بیٹا ہیرا ہے ہیرا اسی طرح متعدد بار فیل ہونے والے طالب علموں کو بھی ہیرا کہا جاتا ہے۔“

”اوہ اوہ آئے آئے اسے آپ محاورہ نہیں کہہ سکتے بلکہ جذبات کا فوری اور خوبصورت اظہار کہہ سکتے ہیں اگر آپ کسی محفل میں بیٹھے ہوں اور کوئی اور صاحب وہاں تشریف لائیں تو اکثر نعرہ لگتا ہے کہ ”اوہ آئے“ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کون آئے۔۔۔۔۔“

مختلف شخصیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور مختلف انداز میں کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔ اگر قریبی دوست آتا ہے تو بلند آواز میں ”اوہ آئے“ کے نعرے لگتے ہیں۔ اگر آئے والا شخص قدرے ناپسندیدہ ہے تو سرگوشی کے انداز میں ”اوہ آئے“ والد صاحب آئیں تو ڈرتے ہوئے ”اوہ آئے“ اور اگر پوچھیں آجائے تو جھاگتے ہوئے ”اوہ آئے“

(۵) ”بھاجی“۔۔۔۔۔ یہ لفظ لاہوریوں کے اعلیٰ اخلاق کا مظہر ہے موقع بے موقع استعمال ہوتا ہے اور گفتگو کا سنگسار ہے مثلاً ایک صاحب اپنے پورے دن کی تفصیل کچھ یوں بیان کریں گے بھاجی صبح دہی کھجے کا ناشتہ کر کے گھر سے نکلا ہٹی پر پہنچا بھاجی وہاں بازار میں گٹر بھاجی کھلا ہوا میں نے خاکروب کو بلا کر کہا بھاجی اس کی صفائی کرو۔۔۔۔۔ بھاجی نے صفائی کی تو دم میں دم آیا شام کو بھاجی آپ کی بھاجی نے کہا کہ کچھ دیکھنی ہے میں نے اس سے کہا کہ بھاجی۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

(۶) کنگھا کر دینا اور چڑچا ہو جانا۔۔۔۔۔ یہ دونوں محاورے ہمیں کنگھی اور چوڑے کی یاد دلاتے ہیں نہایت مفید محاورے ہیں اور خاص طور پر بین الاقوامی سیاست کی گفتگیاں انہیں استعمال کرنے سے سلجھائی جاسکتی ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

”اوئے فیتے اوئے روس کا صدر سنا ہے فوت ہو گیا ہے اس کا تو کنگھا ہو گیا“

”کنگھا تو پتر امریکہ کا بھی ہو گیا ہے ان کا صدر بھی بچا رہا۔۔۔۔۔ روس تو چڑچا ہو گیا ہے امریکہ کے سامنے۔۔۔۔۔“

وہ کیسے۔۔۔۔۔ چوچا تو امریکہ ہوا ہے اس کے سامنے بولتا ہی نہیں“

”پتہ ہے کیا۔۔۔۔۔ یہ دونوں ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے چپے ہو گئے ہیں اندر سے دونوں جگر ہیں مل ملا کے کنگھا ہمارا کر دیتے ہیں“

مجھے امید ہے کہ میری اس گرانقدر علمی اور تحقیقی کاوش سے بہتوں کا بھلا ہوگا اور باہر سے آنے والوں کو اب لاہوریوں کی اردو سنتے ہوئے تکلیف نہیں ہوگی محاورے تو اور بھی بہت سے ہیں لیکن میری گھر والی بھابی اس وقت میٹر ہو رہی ہے کہ جاؤ جا کر بازار سے ہنری گوشت لے کر آؤ اور ہم اس کے سامنے چوپے ہو رہے ہیں نہ ہوں تو وہ ہمارا کنگھا کر دے بھابی..... اسے پتہ ہی نہیں کہ ہم جیسا "ہیرا" خاوند اسے کہیں نہیں ملے گا..... خدا حافظ بھابی۔

ملک ملک کے نائی... سورمی باربر

..... پتہ نہیں ان دنوں وہ پہیلی رائج ہے یا نہیں مگر ہمارے بچپن میں اکثر چچی جاتی تھی کہ بھلا وہ کونسا شخص ہے جس کے آگے بادشاہ بھی سر جھکاتا ہے..... اسے بوجھنے میں خاصی دقت ہوا کرتی تھی..... کمال ہے کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جس کے آگے بادشاہ بھی سر جھک دیتا ہے تب بتایا جاتا کہ میاں وہ شخص ہے "نائی"..... ہمارے ذہن میں ایک عجیب و غریب تصویر ابھرتی کہ بادشاہ سدا اپنے تاج سمیت نائی کے آگے بیٹھے ہیں اور نائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ حجامت کیسے بنائے۔

خوراک کے بعد نائی انسان کی بنیادی ضرورت ہے..... اگر انسان سکھ نہیں ہے تو..... اور چونکہ میرا سکھوں سے صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ بھی جاٹ ہوتے ہیں اس لئے ملک ملک کی خاک چھاننے کے دوران ملک ملک کے نائی حضرات سے بھی مؤدبانہ ملاقاتیں ہوتی رہیں اگرچہ ان دنوں آپ نائیوں کے آگے سر نہیں جھکاتے بلکہ آئیے کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور وہ استرا قینچی سے یس آپ کے پیچھے تعینات ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی موجودگی میں تو آپ کا سر جھک رہتا ہے..... کہا جاتا ہے کہ نائی بے حد باتونی ہوتے ہیں اس لئے کہ آپ آئیے میں اپنا "حشر" دیکھنے کی بجائے ان کی باتوں میں اُبھے رہیں لیکن یہ مفروضہ غلط ہے خاص طور پر گونگے نائیوں کے بارے میں..... تو آئیے آپ کو ملک ملک کے

موت دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس سے ہر قسم کی حجامت بنوانے کو بھی جی چاہتا ہے گفتگو ملاحظہ کیجئے (اگر وہ انگریزی جانتی ہو تو)

”آپ کو پیرس پسند آیا؟“

”جی بہت“

”کون کون سے نمائندگیوں میں گئے؟“

”مالن روج میں جھانکا تھا“

”ہائے..... مجھے بھی لے چلتے“

”دیکھئے آپ نے بال کاٹنے کی بجائے میری ٹنڈ کر دی ہے“

”بالڈ ہیڈ ڈمرو مجھے بے حد پسند ہیں“

”لیکن.....“

”ہائے آپ اتنے سویٹ لگ رہے ہیں“

فرانس میں بالوں کے ساتھ ساتھ آپ کی جیب بھی ہلکی ہو جاتی ہے۔

اب آئیے اطالوی نانی کی طرف جواتنا سمارت اور خوش پوشاک ہوتا ہے کہ

اس پر بالی وڈ کے کسی فلم ستار کا گمان ہوتا ہے..... وہ بے حد سوچ سمجھ کر بال

تراشتا ہے اور اس طرح تراشتا ہے کہ آپ کے بال جوں کے توں رہتے ہیں البتہ

اس کی قینچی ہوا میں کٹ کٹ کرتی سنائی دیتی رہتی ہے یہ قدرے باتونی ہوتا ہے۔

”سنیور آپ فلم ستار ہیں؟“

”جی نہیں“

”آہا آپ اتنے خوش شکل ہیں کہ مجھے دھوکا ہو گیا..... آپ یقیناً روزانوہ

برائزی سے زیادہ ہینڈسم ہیں..... آپ کی کوئی شینگ کپنی ہے؟“

”جی نہیں..... میں ادیب ہوں“

نائیوں سے ملائیں۔

انگریز نانی حجامت بنانے میں طاق ہوتے ہیں اور یہ غریب ان کی بقیہ قوم میں بھی موجود ہے جو خاص طور پر ایشیا اور افریقہ کی بڑی لمبی چوڑی حجامت بنا چکی ہے انگریز نانی چونکہ میٹنی اوزار سے لیس ہوتے ہیں اس لئے آپ کو پہل بھر میں ”بھیڈو“ بنا کر کپڑا جھاڑ دیتے ہیں..... ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔

”سر آپ اندرین ہیں؟“

”جی نہیں پاکستانی ہوں“

”ایک ہی بات ہے“

”آپ آئرش ہیں؟“

”جی نہیں میں انگریز ہوں“

”ایک ہی بات ہے“

”یوگاٹ اسے پوائنٹ سر..... آپ کو لیڈی ڈیانا پسند ہیں؟“

”یہ سوال تو آپ کو پرنس چارلس سے پوچھنا چاہیئے“

میرا مطلب ہے آپ کو لیڈی ڈیانا کا بھیر سائل پسند ہے؟“

”نہیں“

”جالی گڈ..... مجھے بھی پسند نہیں..... آپ کو یہاں کا موسم پسند ہے؟“

”جی نہیں.....“

”جالی گڈ مجھے بھی پسند نہیں..... لیجئے آپ کی حجامت ہو گئی..... پسند ہے؟“

”جی بالکل نہیں“

”جالی گڈ..... دو پاؤںڈ عنایت کر دیجئے“

فرانسیسی نانی عام طور پر نائن ہوتی ہے اس سے حجامت کروانے کی بجائے اسے

”آلاتب تو آپ دانستے کے ہم پلہ ہوں گے۔۔۔ اور بتریس کون ہے؟“
”براہ کرم آپ بال کاٹنے پر توجہ دیجئے“

”سنیور آپ جیسی شخصیات کبھی کبھار ہی میرے پاس تشریف لاتی ہیں۔۔۔ میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں آپ کی موجودگی خوشبو ہے آپ کی شخصیت میں سحر ہے۔۔۔ اگر کبھی صوفیہ لورین آپ کو دیکھ لیتی تو۔۔۔۔۔“

اطالوی نانی بال کاٹنے کی اجرت کے علاوہ اپنی تقریفوں کی قیمت بھی وصول کرتا ہے۔ حرم نانی عام طور پر بے حد موٹے ہوتے ہیں اور گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے صرف آخر میں اجرت بتانے کے لئے منہ کھولتے ہیں۔

”ترک بھائی سیاست کے ماسٹر ہوتے ہیں کرسی پر بیٹھتے ہی پوچھیں گے ”پاکستانی برادر؟“

”جی ہاں“

”ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ یہ امام خمینی کیا کر رہے ہیں؟“

”پتہ نہیں“

”گور باچوف کا تازہ بیان پڑھا ہے؟“

”جی نہیں“

”تمہیں پتہ ہے روسی صرف ترکوں سے ڈرتے ہیں؟“

”پتہ ہے“

”صدر ریگن کی صحت کیسی ہے؟“

”پتہ نہیں“

”یہ ہندوستان دالے تمہیں تنگ تو نہیں کرتے؟“

”کبھی کبھی کرتے ہیں“

”ان کو بتا دو کہ ترک تمہارے ساتھ ہیں“

”بتا دیا ہے“

”تمہیں پتہ ہے کہ یونانی بہت برے ہوتے ہیں“

”سارے یونانی؟“

”ہاں سارے یونانی۔۔۔۔۔“

”سارے یونانی تو برے نہیں ہو سکتے۔“

”میرے استرے کی دھار ملاحظہ کیجئے“

”ہاں سارے یونانی برے ہوتے ہیں“

ایرانی نانیوں کی تازہ ترین صورت حال کے بارے میں میں نہیں جانتا کیونکہ آخری مرتبہ جب ادھر کو جانا ہوا تھا تو شاہ صاحب عوام کو دبائے بیٹھے تھے ان دنوں کچھ اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔

”چشم ماروشن، دل ماشا۔۔۔۔۔ فرمائیے بال کاٹ دوں شیو ہنا دوں یا

آپ کے راستے میں پلکیں بچھا دوں“

”فی الحال بال کاٹ دیجئے“

”جان من ایران پسند آیا“

”ہاں۔۔۔۔۔ اچھا ہے“

”اچھا ہے؟۔۔۔۔۔ اس جیسا اور کونسا ملک ہے گلشن ہی گلشن، گلاب ہی

گلاب۔۔۔۔۔“

”اپنے پاکستان میں بھی بہت گلشن ہیں اور گلاب بھی ہیں“

”ناں۔۔۔۔۔ وہاں گلشن نہیں ہو سکتے اور گلاب تو یہاں سے گیا سرزمین

ایران سے۔۔۔۔۔ ہماری خوراک پسند آئی؟“

”ہاں آں..... لیکن ہر جگہ صرف چلو کباب ہی ملتے ہیں“
”اگر چلو کباب مل جائیں تو اور کیا چاہیے..... تمہارے ملک میں چلو کباب
ہوتا ہے؟“

”ہمارے ملک میں تو سینکڑوں قسم کے کھانے ہوتے ہیں مثلاً.....“
”چلو کباب تو نہیں ہوتا ناں؟“
”نہیں“

”تو بس..... تمہارے ہاں حافظہ اور سعدی ہیں؟ عمر خیام ہے؟.....“
”تمہارے ہاں کیا پوری دنیا میں نہیں ہے.....“

”تمہارے ہاں تو شاہ رضا شاہ پہلوی بھی تو ہے..... اور کہیں ہے؟“
”تم ساواک ایجنٹ تو نہیں ہو؟“

اب اپنے ملک کی بات ہو جائے کے ای میڈیکل ہوسٹل کے سامنے مہندی
رنگ بالوں والے ایک کرم فرما ہیں جو بال کاٹتے ہیں تو کاتے ہی چپے جاتے ہیں اور
اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ دن کا ہوش نہیں رہتا اور رات کر دیتے ہیں.....
”چودھری صاحب ذرا دیکھیں ٹھیک ہو گیا؟“

”جی ہاں اب اجازت دیکھئے مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں“
”نہیں چودھری صاحب لوگ کیا کہیں گے؟“
”کون سے لوگ؟“

”وہی جو آپ کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں..... کیا کہیں گے کہ اس کی کتنی
ٹھیک نہیں ہوئی“

”بھائی میں ٹیلی ویژن پر عید بقرعید کو ہی آتا ہوں لوگ کچھ نہیں کہیں گے
آپ مجھے فارغ کر دیں مہربانی ہوگی“

”نہیں جی بدنامی تو میری ہوگی آپ بیٹھے رہیں..... چودھری صاحب؟“
”جناب“

”یہ روحی بانو آج کل کہاں ہے؟“
”پتہ نہیں“

”اور ساحرہ کاظمی؟“
”پتہ نہیں“

”اور وہ شہناز شیخ؟ ان کئی والی؟“
”پتہ نہیں“

”آپ کو پتہ کیا ہے چودھری صاحب؟“

ساحرہ کاظمی کے حوالے سے یاد آیا کہ ایک روز بردار راحت کاظمی کے
ہاں نشست تھی ایک دراز قامت انتہائی باوقار اور خوش شکل صاحب تشریف
لائے انگریزی مجھ سے بہتر بولتے تھے لباس بھی انتہائی خوبصورت تھا یقیناً فلم کے
ساتھ تعلق ہوگا مختلف موضوعات جو زیر بحث تھے ان میں دلچسپی ظاہر کرتے رہے
پھر نہ جانے انہیں کیا ہوا یکدم اٹھے میری طرف آئے اور میرے بالوں میں پھونک
مار کر بولے ”اوہو“

میں نے پوچھا ”کیا اوہو؟“

”کنے لگے“ اوہو اور ایک اور پھونک مار دی۔

میں نے پھر پوچھا کہ جناب کیا پرابلم ہے؟

”بولے“ آپ کے بالوں کا بیلنس ٹھیک نہیں..... پھونک مارنے سے

کھڑے ہو جاتے ہیں..... کس نے کاتے ہیں؟..... آپ کبھی میرے ہاں
تشریف لائے لیکن پہلے فون پر ملاقات کا وقت حاصل کر لیجئے گا..... ندیم اور

بھائی راحت بھی مجھ سے کٹواتے ہیں۔

میں خاصا مریوب ہوا اور وہیں سر جھکا دیا۔

خواتین و حضرات یہ جو آپ آج ملک ملک کے نائیوں کے حالات و واقعات پڑھ رہے ہیں یہ بے سبب نہیں ہیں مجھے باقاعدہ تحریک ہوئی ہے کہ اس موضوع پر استرا..... معاف کیجئے گا قلم اٹھاؤں..... اور اس تحریک کے بانی ہیں جناب اسلام سلمانی صاحب جنہوں نے ازراہ عنایت اپنا ماہنامہ ”سنگھاڑ“ جو پانچ لاکھ افراد پر مشتمل پاکستانی سلمانی ”ہیر ڈریسر“ برادری کا سرکاری ترجمان ہے مجھے خصوصی طور پر روانہ کیا ہے اس؟ دلچسپ اور سبق آموز میگزین میں مضامین ہائے رنگارنگ گیسو افروز ہیں مثلاً.....

”بیوٹی پارلر کے کاروبار کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھانے کا عمل شروع ہو گیا..... غیر عورت کو ہاتھ لگانا تو کیا شریعت اسے دیکھنے سے بھی منع کرتی ہے..... خاتون گاہکوں کا موقف“

”کارمل انتظامیہ کے مخالفین کے ناخن اکھاڑ لئے جاتے ہیں“

”انسانی کھوپڑیاں لے کر رقص“

”کرسمس فادر کی داڑھی جل گئی“

”نائی اور حجام بکھنے پر احتجاج“

”عید الفطر پر مہندی لگوانے کی غرض سے غیر محرموں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر ڈاکٹر اسرار احمد کی خواتین پر نقطہ چینی“

”امریکی باربروں کی چاندی“

”بے بالوں کے عالمی ریکارڈ“

”گننے پن کا علاج ممکن ہے؟“

پہلے شیوہ نوائی پھر فائرنگ شروع کر دی۔

”بلدیہ کونسل کے میئر کا محاموں پر چھاپہ..... کئی باربروں کے خلاف کارروائی کا حکم“

”انتخابی نشانات میں اگر استرے کا بھی اضافہ کر دیا جاتا تو کیا بگڑ جاتا؟
ان کے علاوہ ”سنگھاڑ“ کا ادبی تحقیقی سلسلہ ”میں“ بال، زلف، گیسو، کاکل کے عنوان سے شعروں کا انتخاب بھی رسوا کرتا ہے آپ بھی ملاحظہ کیجئے
کیوں خزاں میرے تنائب میں چلی آئی ہے
میں نے بالوں میں کوئی پھول سجایا کب تھا

ان انگلیوں کا لمس تھا اور میری زلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خروش کا کر قلب و نظر شکار کر

آرائش گیسو کا تمہیں ہوش ہی کب تھا
جب تم نے مجھے دیکھا تو زلفوں کو سنوارا

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ماہنامہ ”سنگھاڑ“ کا یہ شمار قائد اعظم نمبر بھی ہے اور اس میں قائد اعظم کی شیوہ

آسان ناول نویسی عرف ڈبونا اور شمشیر بھائی جان

جھنگ سے ہماری ایک بھتیجی "کوثر نازنین" نے اپنے خط میں ایک مصوم سی فرمائش لکھ بھیجی ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں لکھتی ہیں۔
ڈیزائل!

آپ کا نام چونکہ ذرا مشکل ہے اس لئے صرف "انگل" لکھ رہی ہوں امید ہے آپ برا نہیں مانیں گے مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے امید ہے کہ آپ جھنگ ایسے دور دراز علاقے میں رہنے والے ہم لوگوں کے لئے یہ کام کر دیں گے۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے اور ان دنوں بالکل نارغ ہوں سوتی ہوں کہ کوئی ایسا کام کر جاؤں جس سے مجھے حیاتِ جاودانی نصیب ہو جائے بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ایک ادیب بن جاؤں اور ایک ناول لکھوں جو بہت اچھا ہو۔ اور اس پر مجھے انعام مل جائے لیکن چونکہ میرا ناول لکھنے کا تجربہ مفقود ہے اس لئے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ کس طرح لکھوں آپ تو ماشاء اللہ ہمارے ملک کے مایہ ناز ادیب ہیں اور موٹی موٹی کتابیں لکھتے رہتے ہیں۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ میری رہنمائی کریں۔ اور بتائیں کہ ناول کس طرح لکھوں مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا شروع کیسے ہو۔ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر لکھ لوں گی امید ہے آپ مایوس نہیں فرمائیں گے اور پوری پوری رہنمائی کریں گے شکریہ۔
آپ کی قاری کوثر نازنین۔

کرنے والے دو حضرات کے انٹرویو ہیں جن میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ان کے پاس اعلیٰ ساخت کے سات استرے تھے اور ہفتہ کے ہر روز کے لئے ایک مخصوص تھا قائد اعظم سینٹی ریزر استعمال نہیں کرتے تھے بال کاٹنے کے لئے مشینیں پسند نہیں کرتے تھے ان کے بال از حد ملائم اور باریک تھے اور ہمیشہ پیچھے کو لوٹے رہتے تھے انہوں نے مانگ کبھی نہیں نکالی..... "سنگھار" میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ قائد اعظم کے شیونگ سامان کو قومی عجائب گھر میں محفوظ کیا جائے اور میں اس کی پرزور تائید کرتا ہوں۔

اور ہاں آخر میں اپنی ایک حماقت کی معافی مانگنا چاہتا ہوں میں اپنی جہالت کا اقرار کرتا ہوں کہ میں اب تک بال کاٹنے والوں کو "نائی نائی" کہتا رہا اور لکھتا رہا..... دراصل یہ باربر ہیں اور نائی اور حجام کہے جانے پر احتجاج کرتے ہیں میں تمام باربروں اور باربریوں سے معذرت چاہتا ہوں کیونکہ استراشہ رگ کے نزدیک ہوتا ہے اور مجھے اپنی جان بے حد پیاری ہے۔

پہلی بات تو یہ کہ اس "بھیتی" نے مجھے "انگل" لکھ کر اپنا کیس خراب کر لیا ہے۔ ایک زمانے میں ہر طرف سے بھائی جان پکارے جاتے تھے۔ اب ان دنوں انگل تارڑ کے نعرے سننے میں آتے ہیں اگرچہ "بھائی جان" سے نکل کر "انگل" کی منازل میں بھی جو کئے دار سے نکلے تو سوسے دار والی بات ہی ہے لیکن ذہن میں جتنے بھی مشہور انگل آتے ہیں اپنے آپ کو ان کی قطار میں کھڑا پا کر بے حد گھبراہٹ ہوتی ہے مثلاً ٹیلی ویژن کے انگل سرگم ہیں۔ امریکہ والے انگل سام ہیں ادھر انگل چپکن بھی ہیں۔ جنہیں چچا چپکن بھی کہا جاتا ہے۔ دوستو و سکی کے ناولٹ "میرے چچا کا خواب" والے چچا کا ڈنٹ ہیں جن کے جسم کے بیشتر اعضا نقلی ہیں اور وہ قریب المرگ ہیں غرض کہ بیشتر مشہور چچا جو ہیں ان کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے کہ ان میں ایک اور چچا تارڑ کا اضافہ ہو جائے بہر حال میں اس اولین بھیتی کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے میری ذہلی ہوئی عمر کا احساس دلادیا ہے بھیتی کوثر چونکہ ان دنوں بالکل فارغ ہی ہیں اس لئے ان کی خواہش ہے کہ اور کوئی ڈھنگ کا کام اگر نہیں ہو سکتا تو ایک عدد ناول لکھ کر ہی حیات جاودانی حاصل کر لیں میں بھی ان کے خط پر خاصے غور و غوض کے بعد اس نیت پر پہنچا ہوں کہ جہاں مارکیٹ میں بوٹ پائش بنانا، موم بنانا، مرغیاں پالنا اور موہل آئل بنانا وغیرہ کے موضوع پر ارزاں کتابچے دستیاب ہیں وہاں "آسان ناول نویسی" پر کوئی ٹھوس دستاویز موجود نہیں چنانچہ بھیتی کوثر نازنین کی رہنمائی کے لئے میں اپنے مختصر تجربے کی روشنی میں چند معروضات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو ناول کا نام رکھ لیں۔ اگر مناسب نام دستیاب ہو جائے تو سمجھیں کہ بس آدھا کام ہو گیا۔ فیشن کے مطابق ناول کا نام اور ہیروئن کا نام ایک ہی ہوتا ہے یہ نام بے حد اچھوتا مختلف اور چونکا دینے والا رومانٹک ہونا چاہیے

سب سے پہلے تو ناول کا نام رکھ لیں۔ اگر مناسب نام دستیاب ہو جائے تو سمجھیں کہ بس آدھا کام ہو گیا۔ فیشن کے مطابق ناول کا نام اور ہیروئن کا نام ایک ہی ہوتا ہے یہ نام بے حد اچھوتا مختلف اور چونکا دینے والا رومانٹک ہونا چاہیے

لیکن احتیاط برتنے کہ نام کسی لڑکی کا ہی ہو۔ کیونکہ ہمارے تجربے میں کئی نام ایسے بھی آئے ہیں جو کہ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی خاص رنگ کی اونٹنی یا بلی کے بچے کو کہتے ہیں نام ایسا رکھیے جس کا کوئی مطلب نہ ہو۔ مثلاً نامینار ڈوبو نہ ضائقہ پٹانیہ صبر سچہ وغیرہ۔ بھیتی کوثر نازنین کا یہ کہنا بالکل ہی درست ہے کہ ناول کا آغاز کیسے کیا جائے انگل انسٹ ہیٹنگ کو بھی یہی پرالیم تھی کہ کوئی کہانی کس طرح شروع کی جائے اور اس کا پہلا فقرہ کیا ہو۔ بقول ہیٹنگ "پہلا فقرہ ایک سچا فقرہ ہونا چاہیے" لیکن یہ کلیہ تو شاید مرد ناول نگاروں پر لاگو ہوتا ہے خواتین ناول نگاروں کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں البتہ ان کو لکھنے سے پیشتر ایک "موڈ" بنانا چاہیے۔

"موڈ" کو بنانے کے مختلف طریقے ہیں پہلے اپنے اوپر فونی سی غامی کر لیں پھر زور زور سے آہیں بھریئے پھر یہ سوچئے کہ آپ فوت ہونے کو ہیں اور اس جہان رنگ بو کو آخری مرتبہ دیکھ رہی ہیں اگر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں تو سبحان اللہ بس جب روتے روتے بچی بندھ جائے تو قلم ہاتھ میں بیٹے اور سم اللہ کر دیجئے خواتین کے ناولوں کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے یا ہونا چاہیے ڈوبو نہ ٹینس کارکیٹ ہاتھوں پر گھاتی ہوئی غلام گردش سے نکل کر برآمدے میں آئی اور لان میں کھلتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اداس ہو گئی..... کیا بیوں میں بوگن ملیا زمینا گل دوپہر پٹو نیا گل شہزاد گل اشرفی چنبیلی اور کامنی کے بچوں تھے۔ ڈوبو نہ آسمان کی طرف دیکھا جہاں کالے کالے بادل امڈے چلے آ رہے تھے اور ایک اداس مرغابی اُڑتی جا رہی تھی ڈوبو نہ ایک مرتبہ پھرنے لگا کیوں اداس ہو گئی حالانکہ وہ آج ہی کالج میں ٹینس کا میچ تین گولوں سے جیت کر آئی تھی....."

اب آپ جان گئی ہوں گی کہ ڈوبو نہ آپ کی ہیروئن کا نام ہے۔ جو بے حد زور و زنج حساس، بیزار اور اداس رہتی ہے اس آغاز کے بعد آپ اب بے تکان دوہین سوئفت

لکھ سکتی ہیں جن میں ڈبوں کی پہیلیوں کی تفصیل اور درجن بھر شادیاں بیان کی جاسکتی ہیں جن میں آپ زیورات اور کپڑوں کے بارے میں اپنی وسیع معلومات کا بھرپور مظاہرہ کر سکتی ہیں اس سٹیج پر آپ کا ہیر و ناول میں داخل ہوتا ہے۔ یہ ہیر و بھی بدقت اپنے ہاتھ میں ٹینس کار ایکٹ گھماتا رہتا ہے نہایت لاپراہ اور کلنڈر اغوش شکل اور امیر ہے ڈبوں ایک روز کالج سے لوٹتی ہے تو پورے گھر میں زور و شور سے صفائیاں ہو رہی ہیں اور گھر کے تمام افراد بے حد غوش ہیں۔ ڈبوں بیزار ہو کر پوچھتی ہے کہ آج کیا خاص بات ہے اسے بتایا جاتا ہے کہ شمشیر بھائی آ رہے ہیں یہ شمشیر بھائی جان دور پار کے کزن ہیں اور یہ بتانے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ وہ اس سے پیشتر اس گھر میں کیوں نہیں آئے بہر حال ڈبوں یہ سن کر پائیں باغ میں چلی جاتی ہے جہاں پوکھیس کے درخت پر کونل برہا کے گیت گارہی ہوتی ہے (اگرچہ کوئی بھی پرندہ پوکھیس کے درخت پر اس لئے نہیں بیٹھتا کہ اس کی بواسے ناگوار لگتی ہے لیکن ہم کونل کو دھریک کے درخت پر تو نہیں دکھا سکتے اس لئے پوکھیس ہی ٹھیک ہے) یہاں ڈبوں ایک مرتبہ پھر جانے کیوں اداس ہونے لگتی ہے کہ اس کی چھوٹی بہن آکر اطلاع کرتی ہے کہ شمشیر بھائی آگئے۔ ڈبوں اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور سب کے کہنے کے باوجود نیچے ڈائننگ روم میں نہیں آتی۔ دوسری صبح جب وہ پائیں باغ میں ٹہلتی ہوئی زندگی کی بات ہے غم کا دریا ہے۔ گنگنا رہی ہوتی ہے تو اس کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے وہ پلٹتی ہے سامنے اس کے خوابوں کا شہزادہ کھڑا ہے اگرچہ اس شہزادے نے جو گرثوز اور فی شرٹ پہن رکھی ہے ڈبوں اس کی آنکھوں میں کھوجاتی ہے اس دوران کونل کو کہنے لگتی ہے ہر طرف پتیاں پتیاں پھول کھلتے ہیں یکدم ڈبوں سنبھلتی ہے اور شہزادے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرتی ہے اور اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے شام کو اس کی والدہ اسے بتاتی ہے کہ وہ تو اس کا

کزن شمشیر بھائی جان تھا اس لئے فوراً اس سے معافی مانگواتی دیر میں شمشیر بھی آ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ چھوڑیں خالہ جان..... جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں گے۔ اور وہاں سے چلا جاتا ہے.....

معاف کیجئے گا میں دفر جذبات سے مغلوب ہو کر کچھ زیادہ ہی لکھ گیا ہوں بہر حال یہ ایک مکمل پلاٹ ہے اس پر ایک شاندار ناول تعمیر ہو سکتا ہے البتہ اس کا انجام کچھ یوں ہو سکتا ہے کہ ڈبوں زندگی اور دنیا سے مایوس ہو کر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ دریا کے کنارے سیر کے لئے جاتی ہے اور اس میں پھلاں لگا دیتی ہے۔ قریب ہی ایک مچھیرا ہے جو ڈبوں کو ڈبکیاں لگاتے دیکھ کر ایک زوردار ہیچ مارتا ہے اور ڈبوں کو ڈوبنے سے بچا لیتا ہے یہ مچھیرا اصل شمشیر بھائی جان ہے جو ڈبوں کے عشق میں ناکام ہونے کے بعد مچھیرے ہو گئے ہیں اس کے بعد دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گنگناتے ہوئے ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف چلتے ہیں ڈبوں کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں اور ناول کا اختتام ہو جاتا ہے۔

ہمیرے حاصل کرنے کا آسان طریقہ

”مشرق“ میں چھپنے والے کالم ”مردوں کی دنیا“ جسے بعض لوگ ”مردوں کی دنیا“ پرستے ہیں، کی شریک کالم نگار محترمہ راشدہ نثار کا کہنا ہے کہ میں سبھی مستنصر حسین تارڑ صرف اس لئے پودوں، درختوں، جانوروں اور موشیوں وغیرہ کے بارے میں کالم لکھتا ہوں کیونکہ میں عورتوں سے بے حد غور فرماتا ہوں۔ یہ بیان قدرے دھمکی آمیز ہے کہ میاں تمہاری جرأت نہیں کہ تم ہم خواتین کے بارے میں قلم اٹھا سکو..... تو جناب میں بہت ہی بہادر قسم کا مرد ہوں۔ میں ہرگز عورتوں سے خائف نہیں ہوں۔ اور اسی لئے میں نے ارادہ کیا ہے کہ آج کا کالم صرف اور صرف خواتین کے حوالے سے ہوگا۔ اگر خواتین اپنے کالم کا نام ہی ”مردوں کی دنیا“ رکھ سکتی ہیں تو مجھے کم از کم یہ حق حاصل ہے کہ میں بھی ایک کالم صرف اور صرف صنفِ نازک (اگر انہیں اس ترکیب پر اعتراض نہ ہو تو) کے بارے میں لکھ سکوں۔ اس میں وقت یہ ہے کہ میرے تمام کالم میری بیگم بھی پڑھتی ہے اور میں چاہتا کہ عورتوں کے بارے میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں جس کا اثر میری گھریلو زندگی پر پڑے۔ (اگرچہ میں ایک بہادر مرد ہوں) کیونکہ میرے ذہن میں جو بھی فقرہ آتا ہے اس کے ساتھ ہی بیگم کی چڑھی ہوئی تیوری بھی آتی ہے۔ چنانچہ اس کا آسان ترین حل میں نے یہ سوچا کہ خواتین کے رسالوں کی طرف رجوع کیا جائے اور ان میں سے کوئی ایسا مواد تلاش کیا جائے جس کی بنیاد پر ایک عدد ”سنوئی کالم“ لکھا جاسکے۔ پاکستانی رسائل میں تو

زیادہ تر ایسے گھریلو مسائل زیر بحث لائے گئے تھے جو خطرناک حد تک تقریباً وہی تھے جن کا تذکرہ میری بیگم کے لبوں پر بھی جاری رہتا ہے۔ مثلاً میں تو اپنی ساس کو پسند کرتی ہوں۔ لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔ میرا خاوند دیر سے گھر آتا ہے۔ میری ننہیں مجھ سے حسد کرتی ہیں۔ میری والدہ کے سکے چچا کے داماد کے بھائی کی بیوی جب بھی ہمارے گھر آتی ہے تو میرے خاوند اس کے ساتھ خوشگوار طریقے سے پیش نہیں آتے جبکہ میں ان کے بھائیوں کو اکثر چائے بھی پیش کرتی ہوں کر بیٹے اور آئن کریم پکانے کا کیا طریقہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ البتہ خواتین کے ایک غیر ملکی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے ”سنہری مشورے“ کے عنوان کے تحت ایک مضمون نظر آیا جو یورپ کی شادی شدہ اور غیر شادی شدہ خواتین کے لئے لکھا گیا تھا اس میں جو سنہری مشورے ”درج ہیں۔ وہ ہمارے ہاں کی خواتین کے لئے بھی انتہائی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ آزمائش ہمیشہ کی طرح شرط ہے۔ مضمون کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے ”آپ جانتی ہیں کہ مہنگائی زوروں پر ہے۔ ایک عام لڑکی کا گزارہ نہیں ہوتا۔ اور ہر لڑکی کی ایک معصوم قسم کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ نہ سہی لیکن ہمیں کے ایک آدھ سیٹ کی ضرورت مالک جو۔ چنانچہ ہم نے آپ کے لئے مندرجہ ذیل مشورے تیار کئے ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے آپ دو چار برس کے اندر اندر ہمیرے وغیرہ خرید سکتی ہیں۔ مشورے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اگر آپ شادی شدہ نہیں ہیں تو فوراً شادی کر لیجئے ہمیرے حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔

۲۔ دفتر پیدل جائیے اور ٹیکسی یا بس کا کرایہ بچائیے۔

۳۔ نہانے کے لئے بالٹی استعمال نہ کریں۔ اس طرح پانی زیادہ خرچ ہوگا۔ اس کی بجائے منہ ہاتھ دھو کر ہی دفتر جائیں۔

۴۔ اپنے پرانے کپڑے جوتے اور ہینڈ بیگ وغیرہ اپنے دوستوں کے آگے فروخت کرنے کی کوشش کریں۔

۵۔ کسی مقامی اخبار میں کتابوں یا فلموں پر تبصرہ لکھنا شروع کر دیں۔ اور اس آمدنی سے مزید کپڑے خرید لیں بلکہ اسے جمع کر لیں۔

۶۔ اپنے لئے پالتو جانور مرت خریدیں۔ شادی کے بعد مفت میں مل جائے گا۔

۷۔ جتنے میں ایک دن بھوکی رہیں۔ (یعنی صرف غوراک سے پرہیز کریں)

۸۔ میک اپ کے لئے مہنگے لوشن نہ خریدیں۔ بلکہ بے بی آئل وغیرہ کرمنز پر لگالیں۔

۹۔ اگر ۲۵ واٹ کے بلب سے کام چل جاتا ہے تو سو واٹ کا بلب نہ استعمال کریں۔ زیادہ روشنی آنکھوں کے لئے مضر ہے۔ کم روشنی رومانوی ہے۔

۱۰۔ جب بھی گھر پر دعوت کریں تو "ون ڈش پارٹی" کریں۔ اس طرح سوائے برتنوں کے آپ کا کوئی خرچہ نہ ہوگا۔ اور بقیہ غوراک کو فرج میں محفوظ کر کے پورا ہفتہ استعمال میں لائیں۔

۱۱۔ جب کبھی آپ کو کوئی تحفہ دیا جائے تو اتنی تعریف کریں کہ دینے والا شرمندہ ہو کر آئندہ ہفتے پھر تحفہ لے آئے۔ بعد میں یہ تحفہ بیچ کر پیسے جمع کر لیں۔

۱۲۔ گوشت چھوڑ کر صرف سبزیوں کھائیں۔

۱۳۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنے بال دھلانے کے لئے بیوٹی سیلون میں ہر گز نہ جائیں۔ بلکہ اپنے خاوند کو کہیں کہ وہ آپ کے بال دھوئے سکھائے۔ اور پھر ان میں کنگھی کر دے۔

مندرجہ بالا مشوروں پر عمل کر کے آپ دو تین برس میں اتنے پیسے جمع کر لیں گی جن سے ہیروں کا ایک سیٹ بخوبی خریدا جاسکتا ہے۔

ان مشوروں کو نقل کرنے کے بعد یکدم مجھے خیال آیا کہ یہ سب کچھ تو مغربی

معاشرے میں رہنے والی خواتین کے لئے ہے۔ ان کا طرز زندگی اور اخلاقیات وغیرہ ہم لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک مشرقی خاتون کے دل میں یہ انگ چلتی ہے کہ ہائے میرے پاس ہیروں کا ایک سیٹ ہونا چاہیے تو روزمرہ کے اخراجات کو وہ کس طرح کم کر کے اس نیک کام کے لئے پیسے بچا سکتی ہے۔ اس کے لئے مشورے ذرا مختلف قسم کے ہوں گے۔ پہلا مشورہ تو بالکل وہی ہے۔ جو روپ میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ اور ہمارے ہاں بھی کہ اگر آپ غیر شادی شدہ ہیں تو فوراً شادی کر لیجئے کیونکہ ہیرے حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے۔ بقیہ چند مشورے جو میرے ذہن میں آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اپنے لئے ہر مہینے دس نئے لباسوں کی بجائے صرف نو لباس خریدیے۔

۲۔ خاوند کے لئے سال میں جو ایک آدھ جوڑا خریدتی ہیں اس کی بھی کیا ضرورت ہے وہ لنگوٹ پہن کر بھی گزارہ کر سکتا ہے۔

۳۔ خاوند کی تمام کتابیں ردی میں فروخت کر دیجئے۔ (خاوند کو نہیں کیونکہ اس غریب کی کیا قیمت پڑے گی۔)

۴۔ عورتوں کے لئے ناول لکھنا شروع کر دیں تو می امکان ہے کہ اسے ٹیلی ویژن والے ڈرامے کی صورت میں دکھانا شروع کر دیں۔

۵۔ ہر مہینے اخبار کا بل وصول ہونے پر اخبار والے کو کہیں کہ فلاں فلاں ٹائٹلز کو تو تم اخبار پھینک کر گئے ہی نہیں (اس دوران بچے آس پاس نہ ہوں ورنہ وہ بھانڈا پھوڑ دیں گے)

۶۔ ساس اگر امیر ہے تو فوری طور پر اس کے ساتھ تعلقات خوشگوار کر لیں۔ اگر بیمار پڑ جائے تو اسے کہیں کہ امی جان آپ کو دہم ہے آپ تو بالکل تندرست ہیں..... یہ تب تک کہتی رہیں جب تک آپ کی دلی مراد پوری نہ ہو

جائے ہاں اگر وہ اصرار کرے کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو تو پھر کسی اچھے ڈاکٹر سے ہرگز رجوع نہ کریں۔

غافل کو اکثر بھوکا رکھیں یہاں تک کہ اسے بھوکا رہنے کی عادت ہو جائے (یہاں پر ملا نصر الدین کے گدے کا انجام بھی یاد رکھئے گا جسے بھوکا رہنے کی عادت ہونے لگی تو وہ فوت ہو گیا)

مجھے یقینی ہے کہ مندرجہ بالا ہدایات پر عمل کرنے سے آپ خاصی رقم جمع کر لیں گی اور حسب خواہش ہیروں کا ایک سیٹ خرید لیں گی۔

امید کرتا ہوں کہ راشدہ نشا صاحبہ کو اب یقین آگیا ہو گا کہ میں عورتوں سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں۔ راہنوں نے میرے سفر نامے نہیں پڑھے، لیکن ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک خوفناک خیال کوندے کی طرح لپکا ہے یعنی اگر میری بیگم بھی مندرجہ بالا ہدایات پر عمل درآمد شروع کر دے تو؟..... یہ نہیں کہ میں اپنی بیگم سے خوفزدہ ہوں ہرگز نہیں۔ کیونکہ میں ایک بہادر مرد ہوں..... پھر بھی آپ دعا کیجئے کہ وہ میرا کامل نہ پڑے۔ شکریہ!

مردہ کاروبار

میں کل صبح گھر سے شہر کی جانب آ رہا تھا برقی مارکیٹ کے گول چکر پر گھومتا ہوا جا رہا تھا کہ سڑک کے کنارے ایک منحنی سیاہ پڑتا شخص دکھائی دیا اور اس کا وہ ہاتھ بھی دکھائی دیا جو اس نے لفٹ حاصل کرنے کی آس میں بڑھا رکھا تھا وہ ایک کھدر کی صدری اور پھٹی ہوئی دھوٹی میں ملبوس تھا میں نے گاڑی کھڑی کی اور اسے بٹھالیا۔

”مہربانی باؤ جی بہت دیر سے کھڑا تھا آج گرمی بہت ہے۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

”یہ نہیں فردوس مارکیٹ کے پاس دھکے کا لونی وہاں رہتا ہوں۔“

”لیکن بابا جاؤ گے کہاں؟“

”پتر مہربانی تمہاری جو بٹھالیا ہم لوگوں کو بڑا آرام ہو گیا ہے یہ لفٹوں کا.... کار میں جھوٹا بھی مل جاتا ہے اور کرائے کے پیسے بھی بچ جاتے ہیں پر صاحب مجھے بہت کم لفٹ ملتی ہے پوچھو کیوں..... بس لوگ میری دھوٹی اور صدری کو جو دیکھتے ہیں۔“

بابے کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور ان پر سپینہ چمکتا تھا اور ظاہر ہے کہ سنتے بالکل نہیں تھے چنانچہ میں نے قدرے بلند آواز میں پھر پوچھا ”بابا جی جانا کہاں ہے؟“

”ہیں.... اچھا جانا کہاں ہیں.... قبرستان“
اب” ہیں؟“ کہنے کی میری باری تھی بہر حال میں نے مسکرا کر کہا ”قبرستان میں
کیا کرتے ہو بابو؟“
”باؤجی میں مردے دفن کرتا ہوں۔“

”مردے؟“ میرے ہاتھ سے سٹیرنگ چھوٹے چھوٹے بچا۔ لو بھی تارڑ صاحب
یہ صبح صبح سویرے کیا چیز اپنے پاس بٹھالی ہے آپ نے پہلو میں اور کرو خد مت خلیق
”نہیں کھودتے ہو؟“ میں نے بالآخر ہمت کر کے دریافت کیا۔
”ہاں یہ کام بھی کرتا ہوں لیکن میرا اصل کام مردے دفن کرنا ہے سرکاری ملازم
ہوں صاحب جی۔“

”ہیں سرکاری ملازم مردے دفن کرتے ہیں؟“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔
”باؤجی یہ جو کارپوریشن والوں کو نہیں ملے مردے سڑکوں پر اور ادھر ادھر
ان کو دفن کرتا ہوں پھر ہسپتالوں میں کئی لوگ مر جاتے ہیں جن کا کچھ اتہ پتہ نہیں ہوتا
کہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں تو ان کو بھی میں ہی دفن کرتا ہوں پھر ایسا بھی ہوتا
ہے کہ کوئی مر جاتا ہے تو اس کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا اور محلے والے اسے لے
آتے ہیں یا پھر کوئی ایک آدھ عزیز رشتہ دار ہوتا ہے وہ لے آتا ہے تو جناب میں
ان سے بھی ٹھیکہ کر لیتا ہوں۔“

”اچھا“ میرا منہ کھلا ہوا تھا ”تم مردے دفنانے کے ٹھیکیدار بھی ہو؟“
”ٹھیکیدار تو بڑی شے ہو تمہے باؤجی میں تو مشکل سے گزارہ کرتا ہوں کئی
مرتبہ سارے سارے دن میں کوئی مردہ نہیں آتا کبھی کبھی میلہ لگ جاتا ہے مردے
مردہ چلا آتا ہے۔ بس قسمت کی بات ہے۔“

بس یہ بھی قسمت کی بات ہے میں نے دل میں سوچا صبح صبح مردوں کے

ٹھیکیدار سے ملاقات ہو گئی بہر حال اب چونکہ بٹھالیا تھا اس لئے اس بابے کو
میں یہ کہہ کر اتار تو نہیں سکتا تھا کہ بزرگوار اس گاڑی میں مردوں کے ٹھیکیداروں کا
داخلہ منع ہے تھوڑی دیر کے بعد میں نے بابے سے پوچھا کہ یہ مردہ کاروبار کیسا
ہے؟

بابا کہنے لگا ”باؤجی ٹھیک ہے روزگار ملتا ہے پر آگے سے یہ کام سنبھالنے
والا کوئی نہیں ہماری اولاد اس طرف آتی ہی نہیں میں بڑا پریشان ہوں بڑا لڑکا
ہے اس نے قبرستان کے باہر غواچر لگا لیا ہے پھوٹا کتا ہے مجھے باہر بھیجو.....
میں نے بڑا سمجھایا ہے کہ یہ بنا بنایا کام ہے اسے سنبھال لو آمدنی بھی اچھی ہے
اور کام مشکل بھی نہیں ہے..... مردہ نہلا دہلا کر لے آتے ہیں صرف مٹی کھود
کر اسے دفن ہی کرنا ہے ناں؟..... اور چنگے بھلے پیسے.....“ اتنی دیر میں ہم
مزنگ چوگلی کے قریب آپکے تھے میں نے بابے کو جنازہ گاہ کے قریب اتار اور
اپنا راستہ پکڑا گاڑی میں سے مشک کا فور کی خوشبو جانے کہاں سے آرہی تھی۔

یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ آج میری کار میں ایک مردے دفنانے والا بیٹھا
تھا اور کئی برس پیشتر میں خود ایک مردے دفنانے والے کی کار میں لفٹ لے کر
بیٹھا تھا لیکن ایک فرق تھا یہ والا دبی بابا تھا اور وہ والا دلتی گوار صاحب۔

ہوایوں کہ کرسمس کے آس پاس میں کالج بند ہوئے اور پورا قصبہ دیران
ہو گیا چنانچہ میں نے بھی رُک سیک کا ندے پر ڈالا اور ڈوور کی جانب چل دیا
جہاں سے فرانس اور بلجیم کے لئے سیٹیں چلتے تھے میرا ارادہ تھا یہاں سے سیٹ پر
سوار ہو کر رود بار انگلستان عبور کی جائے اور پھر لفٹیں حاصل کر کے سویٹزر لینڈ کے
قصبے گرینڈل والڈ جایا جائے اور وہاں پر کرسمس گزاری جائے سفر کچھ اس طور
ملے ہوا کہ میں رات بارہ بجے کے قریب ڈوور پہنچا۔ وہاں سیٹ تیار کھڑا تھا۔

ساڑھے تین بجے کے قریب میں بلجیم کی بندرگاہ آسٹنڈ کے باہر کھڑا انتخاب رت کے اس پہر کمیں رہائش کا بند درست بھی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ برسلز جانے والی شاہراہ پر کھڑے ہو کر لفٹ کے لئے قسمت آزمائی جائے ظاہر ہے اس وقت ٹریفک بہت ہی کم تھی کبھی کبھار کوئی کار یا ٹرک گزرتا مجھ پر فل لائٹ ڈال کر دیکھتا کہ اندھیرے میں یہ کیا چیز کھڑی ہے اور پھر "ہیلو" کا ایک بارن بجا کر بغیر رکے چلا جاتا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک طویل جگہ گاتی ہوئی سیاہ کار میرے قریب آ کر رکی۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں یہ ایک شاہانہ سواری تھی کار کا ڈرائیور بھی نہایت خوش لباس تھا اس نے سیاہ ڈرائیوٹ کے ہمراہ ایک نہایت ہی نفیس بوٹانی باندھ رکھی تھی۔

"کہاں جاؤ گے؟ اس نے پوچھا۔"

"برسلز کی طرف" میں نے جھک کر جواب دیا۔

"بیٹھو" اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اپنا سامان دونوں گھٹنوں پر بٹھالیا اور ایک انتہائی آرام دہ نشست میں دھنس گیا یہ یقیناً کسی شہزادے کی کار تھی لیکن ڈرائیور شکل سے شہزادہ نہیں لگتا تھا وہ درمیانی عمر کا ایک شخص تھا جس کے چہرے پر ہڈیاں بہت دکھائی دیتی تھیں اور اس کی دھنسی ہوئی آنکھیں بالکل دکھائی نہیں دیتی تھیں اس کا رنگ روپ ایسا تھا کہ ہلکے میک اپ کا گمان ہوتا تھا جب ہم آسٹنڈ سے کچھ دور ہوئے تو میں نے پوچھا کیوں جناب یہ گاڑی آپ کی ہے؟

وہ میری طرف دیکھے بغیر مسکرایا "کیوں تمہیں اس میں کوئی شک کی بات نظر آتی ہے..... ہاں سو فیصد میری ہے..... کیسی ہے؟"

"بہت زبردست میں آج تک اتنی عالی شان اور آرام دہ گاڑی میں

اچھا بیٹھا میں لفٹ کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔

میں عام طور پر لفٹ نہیں دیا کرتا "وہ ایک بھائی کو روکتا ہوا بولا" لیکن آج میں ساری رات کام کرتا رہا بالکل نہیں سو سکا اور اب مجھے برسلز جانا پڑ گیا میں نے سوچا کہ اگر اکیلا سفر کروں گا تو شاید نیند آجائے اس لئے تمہیں بٹھالیا تم باتیں کرتے جاؤ۔"

میں نے پہلے اپنا تعارف کرایا پھر اس کا نام پوچھا اور پھر حسب دستور یہ پوچھا کہ آپ کرتے کیا ہیں؟

اس نے نہایت اطمینان سے کہا میں انڈر ٹیکر ہوں۔

میرے ہاتھ پاؤں تھکے ہو گئے انڈر ٹیکر کا ہر پہاڑی میں مردے دفن کرنے والے کو کہتے ہیں رات کا وقت..... ملک بلجیم کا اور کوئی شاہراہ اور اس پر ایک گاڑی میں میں ایک مردوں کے بیوپاری کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

میں تھوڑی دیر خاموش رہا تو وہ کہنے لگا "ہر شخص انڈر ٹیکر سے ڈرتا ہے"

لیکن بالآخر اس کے پاس آتا ہے میرا ایک ہمسایہ تھا انتہائی ذلیل اور بدلتی ہوئی آپس میں گفتگو تک نہ تھی لیکن جب وہ مرا تو میرے پاس آیا..... تمہارے ہاں انڈر ٹیکر ہوتے ہیں؟

میں نے اسے بتایا کہ ہم مردے دفنانے کے معاملے میں ابھی اتنے ماڈرن

نہیں ہوئے۔ اس پر اس نے مجھے اپنے کاروبار کے بارے میں خاصی تفصیل

بتائی کہ کسی طرح وہ مردے کو وصول کرتے ہیں اس کی صفائی کرتے ہیں شیلڈ کرتے

ہیں پھر اس کے پٹروں میں سے بہترین سوٹ چن کر اسے پہناتے ہیں اس کے

چہرے کو تروتازہ بنانے کے لئے ہلکا سا میک اپ بھی کرتے ہیں (مجھے یقین تھا

کہ اس کے اپنے چہرے پر بھی وہی میک اپ تھا) تابوت پر پھولوں کی آرائش

اور تدفین کے وقت مناسب موسیقی کا انتظام وغیرہ وغیرہ..... اگرچہ میں ان مردہ مسائل میں دلچسپی نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس کی کار میں سوار تھا اس لئے اس کی گفتگو اس طرح سنتا رہا جیسے افلاطون کے شاگرد منہ کھولے اسے سنتے ہوں گے۔

”آپ کا کاروبار کس شہر میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بنیادی طور پر تو میں آسٹنڈ میں ہی کام کرتا ہوں لیکن کبھی کبھار باہر کا کام بھی کر لیتا ہوں آج بھی اسی سلسلے میں برسز جا رہا ہوں۔“

”کوئی مردہ دفنانے کے لئے؟“ میں نے بظاہر بڑے اطمینان سے پوچھا۔

”جی بالکل“ وہ کہنے لگا۔

”آپ کو کسی نے وہاں سے فون کیا ہو گا کہ آئیے اور ہمارا ایک مردہ دفن کر دیجئے.....“

”جی نہیں مردہ تو آسٹنڈ کا ہے لیکن اسے دفن برسز میں کرنا ہے کیونکہ اس کے بیٹے کی یہی خواہش ہے۔“

”میں کچھ دیر اونگھتا رہا۔ پھر ایک عجیب و غریب خیال میرے ذہن میں آیا میں نے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی پچھا چھڑانا چاہا لیکن وہ بار بار دستک دیتا رہا۔ تب میں نے ہمت کر کے پوچھا اچھا تو آپ ایک مردے کو برسز میں دفن کرنے جا رہے ہیں؟“

”ہاں“

”اور مردہ کہاں ہے؟“

”اس کار میں“

جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ کئی صفحوں میں بیان کیا جاسکتا ہے مختصراً اتنا کہوں گا کہ پہلے مجھے ٹھنڈے پینے آئے پھر گرم پینے آئے پھر جسم بے اختیار

ہو کر کانپنے لگا اور آواز نے ساتھ چھوڑ دیا اور جب میں قدرے نارمل ہوا تو ایک گیلیائی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ جناب مہربانی کر کے مجھے ابھی اسی وقت یہاں اتار دیجئے۔

”مردے سے ڈرتے ہو؟“ وہ ایک مہربان ہنسی بنتے ہوئے کہنے لگا ”کار کے پچھلے حصے میں تابوت ہے اور اس میں وہ لیٹا ہوا ہے تمہیں کیا کتا ہے ہوں؟“ میں اپنی نشست سے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور ہر لمحہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی سرد ہاتھ میری گردن ہونے کو ہے۔

”نہ نہ میں مردوں وغیرہ سے ہرگز نہیں ڈرتا میں نے یہیں اترا ہے آپ مہربانی کریں.....“

”اس وقت رات ہے کہاں دھکے کھاتے پھر وگے“

”سر میں بے حد شکر گزار رہوں گا اگر آپ مجھے فی الفور یہیں جہاں پر بھی ہم ہیں اتار دیں“

”آرام سے بیٹھے رہو“ اس نے قدرے سختی سے کہا اور میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا کیونکہ میں اکیلا تھا اور وہ دو تھے۔

”کیا یہ ایک منرے دار تجربہ نہیں ہے ایک انڈر ٹیکر کی کار میں سفر کرنا اور اس کار میں جس کے پچھلے حصے میں ایک تابوت ہو؟“

”یقیناً“ میں زبردستی مسکرایا۔

”دیکھو کل کلاں جب تمہارے پاس کار ہوگی تو ہو سکتا ہے تم مجھے راہ چلتے دیکھ لو اور پھر اپنی کار میں بٹھا لو“

”یقیناً“ میں نے پھر مسکرا کر کہا..... میں نے میں بٹھاتا ہوں کسی مردوں کے بیوپاری کو اپنی کار میں پھر شاید میں ادنگھ گیا۔ کار میں ایک خاموشی تھی جسے موت کی خاموشی

کہا جاتا ہے۔ وہ صاحب بھی خاصی دیر چپ رہا اور پھر کچھ ہوا... بریک چنتی ہوئی کاروں کے بارن پولیس کے سائرن... ہماری کار شاہراہ سے نکل کر فٹ پاتھ عبور کر کے کھیتوں میں آن رکی تھی ایک دو کاروں کے ساتھ شاید کرائی بھی تھی۔ لیکن بچاؤ ہو گیا تھا میں نے دیکھا کہ اندر ٹیکر صاحب ایک پولیس افسر کے ساتھ محو گفتگو ہیں اور خاصے گھبرائے ہوئے ہیں اور ایک تابوت شاہراہ کے عین درمیان میں پڑا تھا اور گزرتی کاریں بارن دے رہی تھیں اور اس پر روشنیاں ڈال رہی تھیں۔

میں نے اپنا رک سبک اٹھایا اور چوروں کی طرح ان سے چھپتا ہوا شاہراہ سے نیچے اتر کر کھیتوں میں چلنے لگا۔ یہ اگرچہ بہت برس پہلے کا قصہ ہے لیکن کل صبح میں نے ایک مردے دفنانے والے کو لھنٹ دے کر ان صاحب کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

چند بوڑھے لڑکے

ایک اولڈ ہوائے اندر آیا۔

یہ اولڈ ہوائے موٹا تھا اور گنبا تھا اور دھوٹی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے اپنا نام بتایا۔ کلاس سیکشن کا حوالہ دیا اور سب سے ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔ پھر ایک اور اولڈ ہوائے نے اندر بھانکا اور پھر دانت نکال کر کہنے لگا سب کیلئے آئے ہوئے ہیں۔ اسے کی حال اسے؟ یہ اولڈ ہوائے پان کھا رہا تھا اور کاروں کا بیوپاری تھا۔

ایک اور اولڈ ہوائے اندر داخل ہوا۔ لیکن اس سے پہلے اس کا ڈرائیور اندر داخل ہوا اور دروازہ کھولا تاکہ صاحب کو تکلیف نہ ہو۔ اس اولڈ ہوائے نے سوٹ پہن رکھا تھا اور سگار پی رہا تھا۔ یہ صاحب ایک سرکاری ملازم تھے۔ ایک کالسیا د اولڈ ہوائے اندر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے دانت چمکے سب سے مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا۔ کسی کالج میں استاد تھا۔

ایک پریشاں حال اولڈ ہوائے ڈرنا ڈرنا آیا اور کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ کسی پرائیویٹ ادارے میں کلرک تھا۔

چند روز پیشتر ایک سائیکل سوار حضرت میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے میں بابا اشفاق ہوں۔

میں نے کہا میں اشفاق احمد کے بابوں کو تو جانتا ہوں لیکن کسی بابا اشفاق

کو نہیں جانتا۔

وہ ہنس کر بولا جناب! ناز صاحب آپ مسلم ماڈل میں نہیں تھے؟ دسویں
لے میں؟ میں بی سیکشن میں تھا۔

تب میں نے بابے اشفاق کو پہچان لیا۔ جو اُن دنوں ایک نرم و نازک کا کا
اشفاق ہوا کرتا تھا۔ بابے اشفاق کے مطابق اس نے مسلم ماڈل ہائی سکول اولڈ
بوائز ایسوسی ایشن کی بنیاد تین تینارکھ دی تھی اور اب اگلے بدھ کو ظفر اللہ شاہ کے
ہاں تمام اولڈ بوائز جمع ہو رہے تھے۔ اور مجھے بھی اس محفل میں شامل ہونا تھا چنانچہ
اس وقت چھپیس برس کے بعد تمام کلاس فیلو ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہو رہے تھے
ہم میں سے بیشتر ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے تھے اور پہچاننے کی کوشش
میں تھے۔ کبھی کوئی اولڈ بوائے اٹھتا اور کسی عمر رسیدہ اولڈ بوائے کو چیتا مار کر کہتا
اُوئے تو ہم چھک باؤ کر رہے۔ کتنا بدل گیا ہے؟

ہماری اس محفل میں معاشرے کے تمام نمائندے موجود تھے۔ وکیل، امیر،
کاروباری، غریب کلرک، سول سروس کے حکام، اکاؤنٹنٹ، کانگریس والے۔
چھاپہ خانہ کے مالک، پی آئی اے کے میجر، پی ایچ ڈی پروفیسر، مشہور سرجن اور
ڈاکٹر، ادیب، سیاستدان وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب لوگ آج سے چھپیس برس
پہلے ایک ہی سکول میں ایک ہی کلاس میں پڑتے تھے۔ اور نوجوان تھے اور
برابری کی سطح پر تھے۔ لیکن اب سٹیٹس اور دولت نے کچھ کو مجبور بنا رکھا تھا اور
کچھ کو مغرور آہستہ آہستہ اولڈ بوائے ایک دوسرے کو پہچاننے لگے اور پھر باتیں
شروع ہو گئیں ان شہرتوں کو یاد کیا گیا جن کی پاداش میں پٹائی ہوتی تھی۔ کلاس
ٹیچروں کے قصے شروع ہوئے۔ ماسٹروں کے ان ناموں کا ذکر آیا جو ان کی شخصیت کے
مطابق ہم نے رکھ چھوڑے تھے۔ اور پھر دھیرے دھیرے سب اولڈ بوائے نوجوان

ہو گئے۔ اس عہد میں پہنچ گئے جب وہ مسلم ماڈل میں پڑھا کرتے تھے۔ اور اس
لاہور میں سائنس لینے گئے جو چھپیس برس پیشتر ان کے آس پاس زندہ تھا۔ اب
ہر طرف ایک ہنگامہ ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے کلاس ٹیچر تھوڑی دیر کے لئے باہر
پلا گیا ہے اور طالب علم شور مچا رہے ہیں۔ سول سروس والا اولڈ بوائے کلرک
کے ساتھ بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا۔ کاروں کا بیوپاری پروفیسر کے ساتھ عجیب گنگناہٹا فریج
بیچنے والا، سوئی گیس کے ایک انصر کو اس کے بچپن کے دن یاد کر رہا تھا۔۔۔۔۔
سب اُن دنوں کو یاد کر رہے تھے جب ہر درخت سر ہنر لگتا ہے اور ہر بطن پر
راج ہنس کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ ہم سب تو اس زمانے سے کٹ کر بہت پیچھے
جا چکے تھے۔ بچے بن چکے تھے اور وہی حرکتیں کر رہے تھے۔ اسی طرح ایک
دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ مار کر باتیں کر رہے تھے۔

۔۔۔۔۔ یاد ہماری کلاس کتنی زبردست تھی۔ تمہیں پتہ ہے پرویز کتنا بڑا ڈاکٹر
ہے؟ خالد محمود امریکہ کے بڑے سرجنوں میں شمار ہوتا ہے۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ اور ماسٹر عزیز صاحب کا بیٹا ڈاکٹر محبوب الحق بھی تو ہمارے مسلم
ماڈل کا تھا۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ کیا ترقی کی ہے۔۔۔۔۔؟

۔۔۔۔۔ اور کمال پی آئی اے کا میجر ہے۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ اور تم کیا کرتے ہو؟ اچھا انا رکھی میں گارمنٹس کی دکان ہے اور اپنی
فیکٹری ہے؟ واہ! امیر اربڑ کا کاروبار ہے۔ موٹر سائیکل بیچتا ہوں اور گنپت روڈ پر
ہوں۔ اور میرا پرہیز ہے پاکستان کا جدید ترین پرہیز۔

اُوئے تم کیا کرتے ہو اکرم! میں بس یاد بھی تک واپڈ امین کلرک ہوں۔۔۔
لیکن یاد تم تو اس زمانے میں بھی کار پر آیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ ہاں قسمت
بدلتی رہتی ہے۔

یار ہمارے کلاس ٹیچر کتنے محنتی تھے کتنی محبت سے پڑھایا کرتے تھے۔
ماسٹر رحمت خاں، ماسٹر عزیز رفیق صاحب، شتار اللہ، افتخار صاحب نادریاں
..... کیا کیا لوگ تھے اور کیا بڑے لوگ تھے۔ بس جناب پڑھائیاں تو ہم
نے کیں۔ آج کل معیار تو کچھ نہیں لڑکے محنت ہی نہیں کرتے۔

میں بھی ظاہر ہے اس محفل میں شامل تھا اور باتیں کر رہا تھا اور باتیں کر
رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ سمیت ہم میں سے بیشتر بالکل درمیانے قسم کے
طالب علم تھے اور ماضی کو جان بوجھ کر اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے خوب
بنارہے تھے۔ ایک عجیب حیرت ناک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ہم میں
سے ہر بالکل پھندری تھے وہ آج کامیاب ترین اور امیر ترین کاروباری تھے۔
وہ اپنی اپنی ٹیوٹاؤں اور ہونڈاؤں پر آتے تھے جبکہ دیگر حضرات پیدل تھے۔
البتہ کچھ لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں ہمیں پتہ تھا کہ وہ شان کریں گے اور
انہوں نے شان کیا۔ ہاں ایک دوا ایسے تھے جو بہت پیچھے رہ گئے۔ قسمت نے
ان کا ساتھ نہ دیا..... چھبیس برس بیشتر کے نوجوان لڑکے اب پاکستانی معاشرے
کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھا رہے تھے۔ جو حضرات اب نمایاں
عہدوں پر تھے یا امیر ہو چکے تھے۔ ان کے ٹیلی فون نمبر اور پتے نوٹ کیے جا رہے
تھے..... یار آخر کو ہم کس فیلو ہیں۔ بچپن کے دوست ہیں۔ ایک دوسرے سے
ملنا چاہیے اور مجھے معلوم تھا کہ یہ بچپن کے دوست جب اس کمرے میں داخل
ہوئے تھے تو ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے۔ انہوں نے صرف بڑے
عہدوں اور امارت کو پہچانا تھا۔

کچھ اولڈ بوائے اپنا تعلیمی تعارف نہیں کروا رہے تھے کیونکہ وہ احساس
کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ کمال ہے یہ وہی اچھو ہے جسے میں سائیکل پر ٹھاکر

سکول لے جایا کرتا تھا۔ اور اب یہ کروڑ پتی ہے اور میں مانگتا ہوں میں سکول ٹیچر ہوں
..... کچھ اولڈ بوائے بڑے افسروں اور کاروباری حضرات کے سامنے بے حد ذوق
ہو رہے تھے۔ کیا پتہ یہ شخص میرے کام آجائے اور مجھے میری عزت سے نجات دلائے۔
اتنی دیر میں چائے تیار ہو گئی۔ سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ اور اونچی اونچی
باتیں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھنے کے وعدے ہو رہے
تھے۔ بچوں کی تعداد پوچھی جا رہی ہے اور کہیں بے حد آہستہ سے سرگوشی کے انداز
میں اس لڑکی کے بارے میں سوال تھا۔ جس کے خط اس کی جیب میں ہو کر تھے۔
چائے کے بعد گفتگو کا سلسلہ پھر چل نکلا۔

سب سے پہلے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس سگھر پٹینے والے اولڈ بوائے کا ڈیوڑھی
اندھ آیا اور بتایا کہ صاحب میٹنگ ہے آپ کی۔ دیر ہو رہی ہے..... وہ
اولڈ بوائے آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

پھر ایک کاروباری کو اپنی دکان یاد آ گئی۔
سیاستدان کو بھی ایک میٹنگ پر جانا تھا۔
ڈاکٹر نے کلینک پر جانا تھا۔

وکیل کا منشی آگیا کہ ایک صاحب جنگ سے آئے ہیں فوراً آجائیں۔
اس طرح آہستہ آہستہ خزانہ شاہ کا دفتر خالی ہو گیا میں بھی باہر آ گیا۔ ریگل کے
بس سٹاپ پر صرف ایک شخص کھڑا تھا۔ میں قریب گیا وہ بھی ایک اولڈ بوائے تھا میں
نے اسے فوراً پہچان لیا..... اس کے والد کا بہت بڑا کاروبار تھا اور وہ بے حد
ذہین اور لائق طالب علم تھا۔ سب کو یقین تھا کہ وہ سول سروس میں جائے گا۔ یا کوئی
کارخانہ وغیرہ لگائے گا۔ اور خوش شکل بھی انتہا کا تھا۔ ان دنوں ٹینس کھیلتا تھا بوننگ
کے لئے جاتا تھا..... میرا دوست تو نہیں تھا۔ لیکن میں اسے پسند کیا کرتا تھا.....

میں نے پوچھا، یا تمہیں آج دیکھا نہیں اولڈ ہائز کی فصل میں۔
وہ کہنے لگا میں گیا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا رہا اور کسی نے مجھے پہچانا نہیں
میں نے کہا۔ نہیں یا تم آئے ہی نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں
نہ پہچانتا۔

وہ کہنے لگا بات سنو تم بھی صرف ان لوگوں کو پہچان رہے تھے جو کاروں پر
آئے تھے۔ یا جن کا برانڈر تھ روڈ پر کاروبار ہے..... تمہیں پتہ ہے کہ میرے
والد صاحب کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا۔ اور میں..... چھاڑی لگاتا ہوں۔ چھاؤنی میں
..... میرے پاس اپنا تنگاف کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا..... یا میری بس آگئی
ہے انشاء اللہ پھر ملیں گے۔ اور وہ اولڈ ہائز بھی چلا گیا۔

ہیڈ اینڈ لیگز ان امریکہ

ایک تو ان دنوں پرانے سکول فیلو بہت مل رہے ہیں اور یقین جانیے ان
سے مل کر کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوتی کیونکہ ان کی شکلیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے
کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ظاہر ہے آپ کی شکل بھی ان جیسی ہی ہوگی انسان
آئینوں کو تو چھپا سکتا ہے لیکن ان چہروں کو کہاں چھپائے جو ہر دو چار پختے بعد
آپ کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اسلام علیکم..... یا میں فلاں
ہوں تمہاری کلاس میں تھا پہچانا نہیں؟ جب میں نے انہیں دیکھا ہوگا تب
تو وہ ظاہر ہے ایک سکول بوائے ہوں گے۔ ترونا زہ زندگی سے بھرپور آنکھوں
میں شرارتیں چمکتی ہوئیں..... اور اب وہ جو میرے سامنے آتے ہیں تو اولڈ ٹین
ہونے کو ہیں بال سفید ہو رہے ہیں اگر بال موجود ہیں تو بچے بچے اور تنکے تنکے
سے دکھائی دیتے ہیں اور غالباً کسی معمولی مرض میں بھی مبتلا ہیں چنانچہ میں انہیں
پہچانوں کیسے..... میں دماغ پر زور دیتا ہوں، مزید زور دیتا ہوں لیکن
ان کا چہرہ بالکل یاد نہیں آتا تب میں یکدم خوش ہو کر کہتا ہوں ہاں پہچان
لیا تم میرے کلاس فیلو ہو..... بس نام یاد نہیں آ رہا؟ اور وہ بھولا بادشاہ
نام بتاتا ہے اور ہم سکول کے دنوں کے بارے میں آہیں بھرتے ہوئے ایک
جذباتی قسم کی گفتگو کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جاوید کو میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا..... وہ بالکل ویسا ہی

”ضرور ہوتی ہیں لیکن تم ایم اے فرسٹ ڈیویشن ایک ہونہارا اور لائق پاکستانی تم یہ کام کس طرح کرتے ہو.....“

”یہ کام اس طرح کرتا ہوں کہ اس کام میں رقم ملتی ہے“ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا ”دراصل ہوا یہ کہ پاکستان سے میں لبنان گیا وہاں کچھ عرصہ مزدوری کی پھر وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی وہاں سے کسی نہ کسی طرح میکسیکو چلا گیا تبہیں معلوم ہے کہ میکسیکو اور امریکہ کی سرحد مشترک ہے ہر سال بے شمار میکسیکیں سرحد پار کر کے امریکہ چلے جاتے ہیں اور وہاں کمیتوں میں ”مزدور“ کے طور پر کام کرتے ہیں یہ غیر قانونی مزدور ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی ایک سارا میکسیکن ہیٹ خریدا ایک کھیس کی بکل ماری اور ان میں شامل ہو کر امریکہ چلا گیا..... شکل سے تو ہم بھی میکسیکن لگتے ہیں ناں..... کچھ عرصہ بے کاری کافی پھر ایک سٹور میں ٹائلٹ صاف کرنے پر مامور ہو گیا.....“

”تم اور ٹائلٹ..... خاکروہوں والا کام؟“

”سنو تو سہی..... بھائی میرے جب دو تین دن سے آدمی کا پیٹ خالی ہو تو وہ ٹائلٹ بھی بخوشی صاف کرنے لگتا ہے.....“

”اور سری پائے؟“

”تم ذرا خاموش تو رہو میں بتاتا ہوں..... میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ میں اچھی قسم کی خوراک کھا سکوں اور مرغ کھا کر میرا منہ بانگیں دینے لگا تھا ایک روز قصاب کے ہاں ایک کونے میں بکروں اور گائیوں کے سروں اور تانگوں کا ایک ڈھیر دیکھا..... میں نے پوچھا یہ کیا بھاؤ ہیں؟“

کہنے لگا یہ تو ہم پھینک دیتے ہیں تم لے جانا چاہتے ہو تو مفت میں لے جاؤ..... میں نے انہیں ایک بوری میں ڈالا اور فلیٹ میں آکر فرج میں رکھ

تھا جیسا کہ تیس برس پہلے ہوتا تھا۔ صرف دائرہ ہی مونچھ کا اضافہ ہوا تھا اور ان کے پیچھے وہی چہرہ تھا۔ بچپن کا اور آغاز نوجوانی کا۔ آواز وہی تھی قدرے بچوں ایسی اور سہی سہی..... وہ میرا دوست تو نہیں تھا البتہ آدمی چھٹی کے وقت ہم سکول سے باہر بیٹھے ہوئے بابا آلو پھولے والے کے ہاں اکٹھے بیچ تبادل کیا کرتے تھے۔ ایک آنے کے چھوٹے اور ایک آنے کا ناں..... جاوید خاں لائق بچہ نثار سکول کے بعد اپنے کالج میں گیا وہاں سے ایم اے کیا سول سروس کا امتحان دیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر بے شمار امتحانوں میں بیٹھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ لائق تو تھا لیکن انٹرویو میں ہمیشہ کوئی سیدھی بانک دیتا اور فیل ہو جاتا اکثر انٹرویو لینے والے صاحب کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اسے سوال کرنے شروع کر دیتا اور ویسے بھی ضرورت سے زیادہ سچ بولتا اور اس کی چھٹی ہو جاتی..... ادھر ادھر دھکے کھانے کے بعد وہ غائب ہو گیا..... کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے میں بھی اسے بھول گیا اور پھر وہ پندرہ بیس برس بعد اگلے دوزیر سے ہاں آن دھمکا..... معلوم ہوا کہ موصوف امریکہ میں ہیں اور ان دنوں شادی کروانے کے لئے وطن واپس آئے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا ”وہاں کرتے کیا ہو؟“

کہنے لگا ”سری پائے بیچتا ہوں“

”مذاق کر رہے ہو؟“

”سری پائے مذاق نہیں ہوتے سری پائے ہوتے ہیں؟“

”لیکن امریکہ میں؟“

”ہاں امریکہ میں..... کیا وہاں بکروں اور گائیوں کے سر اور تانگیں نہیں

ہوتیں؟“

مجھے مصالحوں کے بارے میں اب بھی کچھ زیادہ علم نہ تھا بس اللہ توکل پکا تاربتا اور ہمیشہ خشک ہی پک جاتا۔ میرا کمرہ چھوٹا سا تھا اس لئے میں نے تین کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ کرائے پر لیا اور اس میں یہ کام شروع کر دیا اب اللہ کے فضل سے میں نے "ہیڈ اینڈ لیگز" نامی ہوٹل کھول رکھا ہے باورچی کے فرائض میرے ذمے ہیں اور دو خواتین گاہکوں کی خدمت میں سرری پائے پیش کرتی ہیں.....

لاہوری سرری پائیوں کی امریکہ میں کامیابی کی یہ داستان حیرت انگیز تھی۔
اور شادی کروانے کے لئے پاکستان آئے ہو؟

"شادی کروانے اور تندور خریدنے؟"

"ہاں یا سرری پائے کے ساتھ جب تک گرم گرم تندوری روٹی نہ ہو بات نہیں بنتی؟"

"ادھر امریکہ میں تندور نہیں ملتے؟"

"ملتے تو ہیں لیکن ان کی ساخت مختلف ہوتی ہے..... اور پھر اصل فرق تو مٹی کا ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی مٹی سے بنے ہوئے تنور میں پکی ہوئی روٹی میں اسی مٹی کی خوشبو ہوتی ہے اور ہم سب اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کو ترستے ہیں....."

"تنور کو لے جاؤ گے کس طرح؟"

"جس طرح بیوی کو لے کر جاؤں گا..... جہاز میں"

"کرایہ بہت لگے گا؟"

"ہاں میں نے پتہ کیا ہے تقریباً بیوی جتنا ہی کرایہ لگے گا لیکن مجھے فائدہ بہت ہوگا..... اب تو سوچ رہا ہوں کہ دوسرے شہروں میں بھی ہیڈ اینڈ لیگز کی برانچیں کھول لوں؟"

دیا..... چھٹی کے روز میں نے انہیں ایک بڑے سارے دیگچے میں ڈالا اور جتنے مصلحے میرے پاس تھے انہیں دیگچے میں پھینکنا گیا۔ پھر کچھ مکھن وغیرہ ڈال کر چولہے کی آگ کو فل کر دیا یہ ملغوبہ چھ سات گھنٹے پکانے کے بعد جب میں نے پکھا تو بے حد مزیدار تھا سارا تو کھا نہیں سکتا تھا اس لئے اگلی چھٹی پر جانے والے پاکستانی حضرات کو دعوت دے ڈالی۔ لبنانی روٹی کے ساتھ ان سرری پائیوں کو لوگ چٹنارے پیٹے ہوئے کھاتے گئے اور تعریفیں کرتے گئے اس کے بعد یہ معمول بن گیا کہ میں اتوار کے اتوار قصاب سے مفت کے سرری پائے لے آتا انہیں کسی نہ کسی طریقے سے پکاتا اور یاروں کی دعوت کرتا۔ یار لوگ کچھ عرصہ تو میری اس دعوت پر آتے رہے پھر ان میں سے ایک کہنے لگا "یار جاوید یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہر اتوار کو ہم تمہارے ہاں آتے ہیں اور اتنی مزیدار دینی خوراک جو پورے امریکہ میں نہیں ملتی مفت میں کھا کر چلے جاتے ہیں..... ہم چاہتے ہیں کہ تم اسی طرح ہر اتوار کو یہ پاکستانی ڈش پکایا کرو لیکن جو کوئی بھی آئے وہ پانچ ڈالر کی ادائیگی کرے اور پھر کھانا کھائے..... میں نے بہت احتجاج کیا کہ میں یہ نہیں کر سکتا تم میرے دوست ہو اگر امریکہ میں ہیں تو کیا ہوا پاکستانی تو ہیں ناں اور پاکستانی تو اپنے دوستوں کے لئے..... لیکن وہ کہنے لگا کہ جاوید بھائی ہم لوگ اگر بازار جا کر بھی کھانا کھائیں تو اتنی رقم خرچ ہو جاتی ہے اور وہاں کھانے کو کیا ملتا ہے..... اگر تم چارج نہیں کرو گے تو ہم آئندہ نہیں آئیں گے..... تو جناب اس طرح یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے پہل صرف پاکستانی آئے پھر کچھ امریکی بھی آنے لگے۔ آہستہ آہستہ میری پاکستانی ڈش "ہیڈ اینڈ لیگز" کی شہرت پورے شہر میں پھیل گئی..... میں اتوار کی بجائے بدھ کے روز بھی چھٹی کر کے سرری پائے پکانے لگا پھر آمدنی معقول ہونے لگی تو کام چھوڑ دیا اور روزیہ ڈش تیار کرنے لگا۔

”مجھے یاد آیا کہ اردو کے منفرد مزاج نگار جناب پطرس بخاری صاحب یوں اد میں پاکستانی مشن کے انچارج تھے تو ایک روز انہوں نے قصائی سے گردے کپورے خرید کر اپنے فلیٹ میں پکائے اور نیویارک کے سفارتی حلقوں کو دعوت دے ڈالی ان سفیروں اور وزیروں نے گردے کپورے کھائے اور انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اگلے روز اسی قصاب کی دکان پر انہی وزیروں سفیروں کا جھوم تھا جو گردے کپورے خرید رہا تھا۔ اتنی دیر میں پطرس بخاری ادھر سے گزرے تو قصاب نے چلا کر کہا

ادریہ حقیقت ہے دیار غیر میں جہاں وطن یاد آتا ہے، دوست رشتہ دار یاد آتے ہیں وہاں زبان اسی خوراک کے ذائقے کے لئے ترستی ہے۔ ان دنوں تو پاکستانی خوراک انگلستان میں عام ملتی ہے اور انگریز ہونٹوں کی نسبت پاکستانی اور ہندوستانی ہوٹل زیادہ ہیں لیکن مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا ہے جب میں ساؤتھ اینڈ میں رہائش پذیر تھا اور ہر ہفتے لندن کا پھیرا صرف اس لئے لگاتا تھا کہ پاکستانی خوراک کا ذائقہ محسوس کر سکوں..... چونکہ پورے ہفتے کا ”بھوکا“ ہوتا تھا اس لئے ہوٹل کے اندر پہنچ کر مینیو کا مطالعہ کرنے کے بعد کچھ اس قسم کا آرڈر دیتا..... دو چکن پراسٹے پلاؤ کی ایک ڈش، مشرقیہ کرفٹ، بالک، گوشت اور کھیر..... پہلی مرتبہ جب آرڈر دیا تو بہت دیر بٹھا رہا اور ویٹر میری میز کے ارد گرد گھوم کر چلا جاتا۔ بالآخر میں نے روک کر پوچھا کہ بھائی کھانا نہیں لارہے..... تو اس نے جواب دیا کہ صاحب جب آپ کے دوست آجائیں گے تب بے آؤں گا ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا..... میں نے بتایا کہ دوست وغیرہ نہیں آ رہے کام پر گئے ہوئے ہیں اس لئے مجبوراً میں یہ ساری خوراک خود ہی کھاؤں گا..... لیکن پاکستانی کھانا کھانے میں دوڑ ہی قباحتیں تھیں۔ ایک تو انسان کچھ کچھ غمور ہو جاتا تھا اور جھومتا پھرتا تھا اور دوسری یہ کہ

بڑھکیں لگانے کو جی چاہتا تھا۔ بہر حال میں نے جاوید صاحب کو اس کا میاں تجارتی زندگی پر مبارک باؤی اور پوچھا کہ بھائی میرے فہاری شادی کیسے ہوگی سسرال والوں کو یہ بتاؤ گے کہ امیکہ میں سری پائے بیچتے ہو؟ ان کے ذہن میں تو گومانندی کا حاجی آجائے گا..... جاوید کہنے لگا کہ منگنی طے پا چکی ہے میں نے انہیں بتایا ہے کہ میں وہاں ”ہیڈ اینڈ لیگز“ نامی ریسٹوران چین کا مالک ہوں، فی الحال ان میں سے کسی نے اس نام کا اردو ترجمہ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ پچھلے ہفتے جاوید صاحب اپنی نئی فوہی بیوی اور ایک عدد تنور کے ساتھ جو مزنگ سے خرید گیا تھا امریکہ سہار گئے۔

ان کا نظام تنفس درہم برہم ہو گیا اور کھانسنے لگے جب قدرے بحال ہوئے تو صرف مسکراتے پر ہی اکتفا کیا اور بولے "اے مجھ سے یار بیاں باریاں مارتا ہے تیرا ایک خط تو میں بھی لے کر گیا تھا اس کے پاس"

لاہور کی تاریخی خوراکیں

ایک صاحب نے ہاں تشریف لائے آتے ہی پیٹ لگنے اور دیر تک پیٹے ہے اب وہ مجھ سے علیحدہ ہوتے ان کا چہرہ سامنے آتا تو میں انہیں پہچانتا چنانچہ بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا اس پر وہ قدرے روکھرا گئے سانس دھونکھنی کی طرح چلنے لگا شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ قبہ والد صاحب کے کوئی ہم جماعت ہیں جو دوست کے بیٹے کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے ہیں..... والد صاحب کی صحت تو ماشاء اللہ ٹھیک ہے لیکن ان کے یہ ہم جماعت خاصے گئے گذرے تھے بیکار اہتمام نہیں ہوا تھا دیسے گزر چکے تھے جب ان کا سانس درست ہوا تو کہنے لگے "یار مستنصر اور کیا حال چال ہے"..... میرے بزرگ ہو کر مجھے یار کہہ رہے تھے ان کی اس بے پناہ محبت سے بے پناہ متاثر ہوا عرض کیا "بس جناب آپ کی دعا ہے" وہ سر ہلا کر ہنسنے لگے "اے میرا اتنا ادب کیوں کرتا ہے؟" میں نے کہا "جناب میرا فرض ہے" کہنے لگے "سننا اس لڑکی کا کیا حال ہے جسے بچپن میں خط لکھا کرتا تھا؟"

اس سوال پر میرا سانس رکنے کو آیا کہ کمال بزرگ ہیں خواہ مخواہ غیر ضروری اور آؤٹ آف ڈیٹ حوالے دے کر مجھ پر غور دار کو شرمندہ کر رہے ہیں بہر حال میں شرمندہ ہوا اور بعد ادب عرض کیا کہ بزرگو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کونسی لڑکی اور کیسی لڑکی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس پر انہوں نے کھلکھلا کر ہنسنے کی کوشش کی لیکن کھلکھلاہٹ کے بیچ ہی

اب یہ صورت حال قطعی طور پر نامستول سی ہو گئی تھی کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اگر خدا خواستہ میں نے کبھی ایام نادانی میں اس قسم کی کوئی غیر شریفانہ حرکت کی ہو اور کسی خاتون کے نام چٹھی لکھ کر اپنے والد صاحب کے کسی دوست کو ہی دی ہو کہ چاچا جی ذرا یہ لو لیٹر تو فلاں لڑکی کو دے آئیے..... چنانچہ میں نے مزید شرمندہ ہو کر کہا "چاچا جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اے....." ان کا زرد پڑتا چہرہ باقاعدہ سرخ ہو گیا "مجھے چاچا کہتا ہے..... اے شرم کر..... تو کونسا اتنا دودھ پیتا بچہ ہے جو مجھے چاچا کہہ رہا ہے..... اپنے کلاس فیلو کو چاچا کہتا ہے؟"

"میرا کلاس فیلو؟" میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

اے میں عبد الباسط ہوں..... موچی دروازے سے آیا کرتا تھا اور تم مجھے باسط کی بجائے باسی کہا کرتے تھے یاد نہیں؟

مجھ پر حیرانگی کا وہ عالم طاری ہوا جس کا اظہار انگریز لوگ گڈ ہیونز" یا "اے مانی گاڈ" بڑبڑا کر کرتے ہیں میں نے اسے غور سے دیکھا ہاں وہ اتنا بوڑھا بھی نہیں تھا صرف بری صحت نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا بلکہ حلیہ ٹائٹ کر دیا تھا زرد چہرہ آنکھیں رخساروں کی ہڈیوں پر رکھی ہوئیں آواز میں نقاہت ایک ضمنی سی توند اور اکھڑا ہوا سانس..... وہ باسی ہی تھا..... ہر حال کچھ بنیادی قسم کے سوال جواب ہوئے اور ان کے بعد میں نے پوچھا "یار باسی تمہاری صحت...." باسی نے وہ جگہ جہاں چھاتی ہو کر تھی ہے پھلا کر کہا "کیسی ہے؟..... اچھی ہے نا؟"

”اچھی؟..... میں نے ہکا کر پوچھا۔
”سب رشک کرتے ہیں کہ یہ صحت میں نے بنائی کیسے؟..... تمہاری آنکھوں
میں بھی رشک اور حسد کے جذبے ہیں“ باسی نے یہ بیان انتہائی بنجیدگی سے دیا
تھا میں نے اس کا دل دکھانا مناسب نہ سمجھا۔

”اوسے پوچھو تو سہی کہ یہ صحت میں نے بنائی کس طرح ہے؟
”کیسے بنائی ہے؟“

اس نے پھر سینہ پھلایا ”اوسے ہم نے خوراکیں کھانی ہیں“
”کونسی خوراکیں؟“

”کونسی خوراکیں..... شہر لاہور کی خوراکیں صبح سویرے نہاری اور بونگ
پھر پیڑیاں والی لسی دوپہر کو حلیم کباب اور کڑھائی مکہ..... شام کو مرغ بریانی تلی
ہوئی مچھلی اور درمیان میں مٹھائیاں لڈو پیٹھیاں والے اوسے پکڑے اور وہی بھلے
وغیرہ وغیرہ..... تم تو صاحبی میں مار کھاتے ہو بچہ لاہور شہر کی خوراکیں کھایا کرو
..... ذرا مجھ کو دیکھو“ میں نے ان کو دیکھا وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے ”بھوکوں
کی مدد کرو“ کے پوسٹر پر ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھایا جاتا ہے۔

”اور اب اپنے آپ کو دیکھو“ انہوں نے کہا۔

میں نے اسی صبح آئیے میں اپنے آپ کو دیکھا تھا اس لئے عرض کیا کہ جی بالکل
میری صحت آپ جیسی تو ہرگز نہیں ہے۔

”بس یہ خوراکوں کا کمال ہے“ وہ نقاہت سے مسکرائے۔

”یار باسی ایک بات پوچھوں..... میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور
پوچھا ”تم کبھی بیمار نہیں ہوئے؟“

”پہلے کندھے سے ہاتھ اٹھاؤ..... میں نے ہاتھ اٹھایا۔

”بیماری تو انسان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے کبھی بوا میر ہو جاتی ہے کبھی بدہضمی
ہو جاتی ہے اور تو سب کچھ ٹھیک ہے بس معدہ کام نہیں کرتا..... بڑے ڈاکٹروں
حکیموں کو دکھایا لیکن وجہ معلوم نہیں ہو سکی..... تم کیوں پوچھتے ہو؟
”بس ایسے ہی..... چائے پیو گے۔“

”چار بجے ہیں ناں؟.....“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ”اس وقت موہنی
روڈ والے کبابیہ نے کباب لگائے ہوں گے دیر ہو گئی تو ختم ہو جائیں گے.....
پھر کسی وقت آؤں گا تفصیلی گفتگو کے لئے..... اب چلتا ہوں۔“

باسی اٹھنے لگا تو لڑکھڑا گیا میں سہارا دے کر باہر تک چھوڑ آیا اس کے جانے
کے بعد میں نے سوچا کہ باہر کے ملکوں میں وہاں کے خصوصی پکوانوں کے بارے میں
بالتصور کتنا میں پچھتی ہیں جن میں اجزائے ترکیبی اور پکانے کے طریقے درج ہوتے
ہیں اور یوں کل عالم میں ان کی دھوم ہوتی ہے اور ادھر ہمارے لاہور میں دنیا
کے بہترین پکوان ”یا“ خوراکیں“ تیار ہوتی ہیں اور باہر کی دنیا کو اس کا علم ہی نہیں
اگر ان کے بارے میں بھی لاہور کی خوراکیں“ نام کا کوئی کتنا بچہ چھپ جائے تو پھر
کیا انگریز کیا روسی جا پانی بھی اپنے گھروں میں سری پائے اور سرخ چھوٹے پکانے
شروع کر دیں میں اگرچہ اس کام کے لئے فلی کوالی فائیڈ تو نہیں ہوں یہ شعبہ باسی صاحب
کا ہے لیکن چونکہ انہیں کھانے سے فرصت نہیں ہوتی اس لئے میں حسب مقدمہ
ان خوراکوں کے بارے میں قلم اٹھاتا ہوں اور انتہائی مختصر تڑکیب آپ کی
خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

تڑیدی حلیم..... اس حلیم کو تڑیدی کیوں کہا جاتا ہے اس کے بارے میں
ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ممکن ہے کہ لفظ ”تڑ“ کے آگے قاعدوں میں صرف تڑا ہوا
لکھا جاتا ہے اس لئے بچوں کی آسانی کے لئے ایک اور لفظ ایجاد کر لیا گیا ہو بہر حال

علیم بنانا بہت آسان ہے..... سب سے آسان طریقہ تو یہی ہے کہ آپ میکلورڈ روڈ پر جا کر اسے خرید لیں لیکن غیر ملکی صاحبان کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا اس کے لئے دس کلو ڈال درکار ہے ڈال کو اچھی طرح پیس لیجئے پھر اس میں پرانے لمحات کی روئی اچھی طرح ملا دیجئے جب روئی ڈال ایک جیسے ہو جائیں تو اس میں مٹھیاں بھر بھر کر مرچیں اور گرم مصالحہ ڈال دیجئے..... لیجئے علیم تیار ہے معاف کیجئے گا اس کو چوہے پر چڑھا کر بال لیں پھر علیم تیار ہے۔

سری پائے..... اس کے لئے آپ کو پاؤں درکار ہے لیکن پاؤں انسان کے نہیں کسی چوپائے کے ہونے چاہئیں اگر زندہ چوپائے کے مل جائیں تو بہتر ہے ورنہ مردہ سے بھی کام چل جائے گا اور لاہور میں عام طور پر اسی طرح کام چلایا جاتا ہے باقی ترکیب حسب معمول ہے یہی جوجی میں آئے کریں لیکن مرچیں اتنی زیادہ ڈالیں کہ اگلی صبح آپ کو خود بخود پتہ چل جائے کہ پھلی رات کیا کھایا تھا.....

گرم آئندے..... عام طور پر لوگ انڈوں اور آئندوں کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آئندے صرف آئندے ہوتے ہیں لیکن آئندہ جب بہت ہی بلند درجات پر پہنچ جاتا ہے تو آئندہ ہو جاتا ہے ایک اور چیز ”ہندہ“ ہوتی ہے جو اپنے درجے کی بیگمات کھاتی ہیں البتہ ہونڈا بالکل الگ چیز ہے یہ موٹر سائیکل کا نام ہے بہر حال گرم آئندے اس طرح تیار کیے جلتے ہیں کہ آئندے لے کر انہیں بال لیں اور پھر کسی نہ کسی طرح انہیں گرم رکھیں..... لیجئے آئندے تیار ہیں لیکن انہیں خود نہ کھائیے گا کیونکہ یہ عام طور پر کچھوے کے ہوتے ہیں..... اور کچھوگما جو ہوتا ہے وہ کچھوے سے الگ چیز ہوتا ہے دونوں کو ایک ہی جانور نہ سمجھیں بس آئندے اور آئندے والا فرق ہے۔

لاہوری مٹھیاں..... یقین کیجئے کہ مٹھائی اور مٹھیاں میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے مٹھائی وہ ہے جو صرف سنائی دے مٹھیاں وہ ہے جسے سن کر آپ کی رال ٹپکنے لگے اور آپ کا حلق تر ہو جائے اسے بنانے کے سینکڑوں طریقے رائج ہیں دنیا میں دوسرے ممالک بھی سویش وغیرہ تیار کرتے ہیں لیکن ان میں وہ خصوصی مزایا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ لوگ سویش میں صرف چینی اور شہد وغیرہ استعمال کرتے ہیں جبکہ لاہور میں مٹھیاں بنانے والے کے جسم کا پسینہ ہاتھوں کی غلاظت اور تازہ بہ تازہ مکھیوں کی وافر تعداد شیرے میں گھول دینے سے ایک انگ ٹیٹ پیدا ہوتا ہے۔ تلی ہوئی مچھلی..... اس خوراک کے لئے لازمی جز مچھلی ہے یقین کیجئے مچھلی کے بغیر آپ تلی ہوئی مچھلی تیار نہیں کر سکتے یقین نہ آئے تو تجربہ کر دیجئے ہر حال کہیں سے ایک مچھلی حاصل کیجئے بہتر تو یہی ہوگا کہیں سے تلی ہوئی مچھلی ہی حاصل کر لیجئے اس طرح آسانی ہوگی لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو مچھلی منڈی چلے جائیے وہاں آپ کو تازہ مچھلی مل جائے گی مچھلی کے تازہ ہونے کی پہچان صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ ذلت ہو چکی ہوتی ہے چنانچہ ایک عدد فوت شدہ مچھلی خریدیے اور گھر لے آئیے گھر پہنچ کر بیوی کو کہئے کہ اسے تلی دے..... لیجئے تلی ہوئی مچھلی تیار ہے..... اگر کھاتے ہوئے مچھلی کا مزہ نہ آئے تو پھر یقیناً آپ مچھلی منڈی کی بجائے کسی اور منڈی میں چلے گئے تھے۔

نوا تین حضرات لاہور کی خوراکوں کا تذکرہ ابھی ادھورا ہے اور تفصیل طلب ہے ایک ہی نشست میں لاہور کی تاریخی خوراکوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا میرا مطلب ہے ان کے بارے میں لکھا نہیں جاسکتا ورنہ یوں تو ہمارے دوست باسی کی طرح زندہ دلان لاہور روزانہ ان سب خوراکوں کے ساتھ ایک ہی نشست میں انصاف کرتے نظر آتے ہیں اور پھر ساری زندگی ان کو کچھ نظر نہیں آتا..... انشاء اللہ کسی آئندہ کالم میں بقیہ خوراکوں کا تذکرہ کروں گا تاکہ آپ سب میرے دوست باسی کی طرح اپنی صحتیں بنا سکیں۔

”چھیڑ“ کر لے سے چلی جائے اسد

اپنے چچا غالب کے شعری محاسن اور گہرائیوں اور گیرائیوں کے باسے میں یہ بندہ ناچیز تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کیونکہ ہر بڑے شاعر کو صرف ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں کوئی اور سمجھنے کی کوشش کرے تو اس کا سر پھوڑ دیتے ہیں کہ نالائق تمہیں کیا پتہ ہو کہ غالب کا کیا مقام ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی کیا ہے اور میر تقی میر میں اتنا درد کیوں ہے بڑے شاعروں کو سمجھنے کے لئے ذہن بھی بڑا ہونا چاہیے مطالعہ بھی وسیع ہونا چاہیے اور تم کیا ہو محض شعروں پر چبھنے والے..... اور ماہرین جو..... شناس“ اور..... دان“ وغیرہ اپنے ناموں کے ساتھ لگاتے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں کیونکہ اگر ہر کس و ناکس غالب اور اقبال کو سمجھنے لگے تو یہ غریب تو بھوکوں مر جائیں..... دراصل تمہیں ذرا طویل ہو گئی کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ چچا غالب نے کیا خوب کہا ہے کہ

ص چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔

تو کیا خوب کہا ہے اور سارے زمانوں کے لئے کہا ہے بلکہ آدم مر مر مطلب اپنے میاں محمد سلیم کر لاکے لئے کہا ہے۔ اب تک الیکشن کا مرحلہ خیر و خوبی گزر چکا ہو گا۔ نتائج سامنے آچکے ہوں گے اور کر لاک صاحب یا تو حسرت ہی سہی ہوں گے یا اہمیلی میں وصل کے مزے لوٹ رہے ہوں گے اور یہ کمال ان کی چھیڑ ”کر لاک“

کا ہو گا یعنی چھیڑ کر لاک سے چلی جائے..... یہ الگ بات ہے کہ غالب نے اس ”چھیڑ“ کو کن محسن میں استعمال کیا ہے لیکن اپنے لاہور میں اس کے معانی کچھ اور ہیں کیونکہ اہل لاہور بھی دوسرے شہریوں کے باسیوں کی نسبت کچھ اور ہیں..... لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تاریخ میں کر لاک صاحب کا مقام بہت منفرد ہے۔ یہ چھیڑ چھپا کر تو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے اور اس میں بڑے بڑے ناموروں کے نام آتے ہیں..... مثلاً ہمارے محلے میں ایک صاحب کے دانت پچپن میں منہ بند کرنے کے باوجود باہر جھانکتے تھے اور صرف دو عدد جھانکتے تھے چنانچہ دیگر بچے لوگ انہیں ”ہاتھی دانت“ کے نام سے پکارتے تھے۔ اور یہ نام اتنا پالو لڑ ہوا کہ صبح صبح ان کے گھر میں سے اس قسم کی آوازیں آیا کرتی تھیں.....

”ابے او ہاتھی دانت ابھی تک سویا ہوا ہے؟“
”ہاتھی دانت نے ناشتہ کر لیا؟“
اور محلے میں اس قسم کے فقرے سننے میں آتے تھے۔
”سنا ہے ہاتھی دانت فیل ہو گیا ہے“
”وہ کونسا ہاتھی ہے جس کے چار دانت ہوتے ہیں..... ایسا ہاتھی جس پر ہاتھی دانت سواری کر رہا ہو“

اور تو اور جب کبھی کوئی یار دوست اسے گھر سے بلانے جاتا تو گھنٹی بجانے پر اس کے دادا جان باہر جھانکتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ جی ہاتھی دانت سے ملنا ہے گھر پر ہے؟

یہ صاحب جوان ہوئے اور ان کے دانت بالکل ٹھیک ہو گئے مگر انہیں ہاتھی دانت ہی کہا جاتا رہا بلکہ ان کی شادی پر جب کارڈ چھپے تو ان کے والد صاحب

لوگوں کو کارڈ دیتے وقت یہ واضح کر دیتے کہ جناب میرے بیٹوں میں سے ہاتھی دانت کی شادی ہے..... اب ماشاء اللہ ان کے بچے ہیں اور ہاتھی دانت کے بچے کہلاتے ہیں۔

ایک روز میرے ہاں ایک بزرگ تشریف لائے اچکن اور ترچھی ٹوپی میں ملبوس شین کا ف انتہائی قابل رشک..... چیف انجینئر کے عہدے پر ریٹائر ہو کر اب بچوں کو کھلاتے تھے اور ادب عالیہ کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو انتہائی پر مغز اور بصیرت افروز تھی وہ جب چلے گئے تو بھولا ریڑھی والا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "باؤجی یہ بابائیں آپ کا یا رہے؟"

"کونسا بابائیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی جو آپ کے پاس بیٹھا تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس تو ایک بزرگ نصیر الدین حیدر آبادی نام کے بیٹھے تھے بابائیں نہیں تھا بھولا کہنے لگا نہیں جی بابائیں تھا۔

پانچ چھ روز بعد وہی بزرگ پھر آگئے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بھولے نے نعرہ لگایا "بابائیں"..... بزرگ نے اپنی چھڑی اٹھائی اور پر مغز گالیاں دیتے ہوئے بھولے کی طرف لپکے۔ بھولا بھی تیار تھا فوراً ریڑھی سے اتر کر چوک کی طرف بھاگ گیا..... اس دوران کچی پان فروش نے بھی "بابائیں" کا نعرہ لگا دیا۔ اب ان بزرگ نے کچی کی ماؤں، بہنوں کے قصیدے لاپٹے شروع کر دیئے....

بہر حال میں نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر واپس لے آیا..... اگلے روز میں نے بھولے سے میں کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا باؤجی اس بابے نے ایک طوطا پالا ہوا ہے اور یہ ہر وقت اس کے ساتھ باتیں کرتا رہتا ہے طوطا کچھ اچھی نسل کا نہیں ہے اس نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور یہ بابا جی اسے

کہتے ہیں "اوسے بول بچے..... نہیں..... پڑھو بسم اللہ نہیں..... نہیں نہیں....." کو کیا حال ہے نہیں نہیں..... اب ہوا یہ ہے کہ انہیں "ٹپیں" کہنے کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ عام لوگوں سے یا گھر والوں سے باتیں کرتے ہوئے بھی پانچ پنج میں "ٹپیں" کہتے جاتے ہیں۔ میرے پاس پھل فروٹ لینے آتے ہیں تو کہتے ہیں چار ٹپیں مانٹے، ایک درجن کیلے ٹپیں، کتنے ٹپیں پیسے؟..... اور کچی کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں یا رکھی ایک ٹپیں پان تو کھلاؤ..... بس باؤجی ان کا نام پڑ گیا ایک روز ان کا پوتا پھل خریدنے آیا تو کہنے لگا پیسے کم لگانا میں بابائیں کا پوتا ہوں۔

اب میں نے بھی غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے ساتھ بھی اپنی گفتگو کے دوران "ٹپیں" کرتے تھے میرا مطلب کہتے تھے لیکن میں نے اسے کوئی اردو کا قدیم محاورہ سمجھا اور میرا دماغ غلطے والے میں کی طرف نہ گیا۔

میرے ایک دوست ہیں صاحبہ خاندانی نواب ہیں عہدہ لباس میں ملبوس ہوں تو پوچھیں گے "کیوں جھاتی تار تو کرکٹ کھیتی ہے" یہ ذکریشن دراصل ڈیکوریشن ہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے چہرہ ہاروب بنانے کی ٹائمر وینس پال ہیں ایک روز مال روڈ پر چند دوستوں کے ساتھ چمیل قادی فرما رہے تھے میں قریب سے گزرا تو جانے کیوں رہ نہ سکا اور نعرہ لگا دیا "ابے او فچر....." اس پر نواب صاحب قدرے چونکے جڑبڑ ہوئے اور چمیل قادی جاری رکھی اس طرح ایک فیو سائز ہل میں ڈنر کھا رہے تھے تو میں نے قریب سے گزرتے ہوئے "چچر" کا نعرہ لگا دیا۔ لیکن مجال ہے کہ ان کی مونچھ بھی پھڑکی ہو چپکے سے کھانا کھاتے رہے..... یہ نام خد رانج ہو گیا..... ایک روز میں اپنے والد صاحب کے ساتھ بس سٹاپ پر کھڑا تھا تو پیچھے سے آواز آئی "ابے او فچر" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نواب صلیب

..... کو قاری کی عقل سلیم کے بطون میں داخل کر کے معاشرے کو یہ اشارہ دینا چاہتا ہے کہ ابے او مچھر۔

قصور میرا نہ تھا نواب صاحب اس وقت ریتوران میں داخل ہوئے تھے اور مجھے دیکھتے ہی نتائج سے لاپرواہ ہو کر نعرہ لگانے لگے تھے اس نے پہل میں نے کر دی..... یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان نوجوان ادیبوں کے ذہن میں جو میرا میچ تھا خاصا ڈبیچ ہوا اور اس کے بعد وہ مجھے کبھی ملنے نہیں آئے..... نواب صاحب کی صورت حال بھی مجھ سے مختلف نہ تھی وہ بھی مجھے دیکھتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر مچھر کا نعرہ لگا دیتے اور میں اپنے ہمراہ چلنے والے دوستوں یا رشتہ داروں کے سامنے شرمندہ ہوتا رہتا اس کا کلامیکس تب ہو جب ایک روز میں اپنے بچے کے ہمراہ انارکلی میں شاپنگ کر رہا تھا نواب صاحب نے دکان میں داخل ہوتے ہی پہل کر دی "مچھر"..... دکاندار پریشانی کہ اتنے خوش بک نوجوان ہیں اور ذہنی طور کمزور ہو گئے ہیں بہر حال نواب صاحب میرے پاس آگئے اور میرے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "یہ مچھر کا بیٹا ہے؟"

"میں نے کہا" ہاں ہے..... لیکن یاد رکھو جب شادی کرو گے اور تمہارا بیٹا ہوگا تو میں بھی اسے مچھر کا بیٹا کہوں گا" ہنس کر فرمایا "اسی لئے تو میں شادی نہیں کر رہا۔ نہ شادی ہوگی نہ بیٹا ہوگا اور نہ تم اسے مچھر کا بیٹا کہ سکو گے۔"

مزید بات یہ ہے کہ اس عرصہ میں ان کی مونچھیں صاف ہو چکی تھیں اور میری تو محفیں ہی نہیں لیکن اس کے باوجود آج تک ہم دونوں "ابے او مچھر" ہیں اور ایک دوسرے کی تاک میں رہتے ہیں بات پھیر کر لا اسے چلی جائے اسد..... سے شروع ہوئی اور باہائیں ہاتھی دانت اور مچھر تک پہنچ گئی اگرچہ بھی ماسٹر کر ملا اچھو بیٹا، ڈاکٹر پٹری اور بشیر کھوتا کا تذکرہ باقی ہے لیکن

فل ڈیکوریشن میں چلے جا رہے تھے میری طرف دیکھا تک نہیں... حالانکہ آواز انہی کی تھی..... اب ایک اور گیم شروع ہو گئی یعنی ہم دونوں میں سے جو بھی پہلے دوسرے کو دیکھ لیتا وہ نہایت اطمینان سے "مچھر" کا نعرہ لگا دیتا..... جب کبھی میں مال پر نکلتا تو قدرے چوکننا ہو کر نکلتا کہ کہیں نواب صاحب بے خبری میں مجھے "مچھر" کہہ کر گزر نہ جائیں ادھر نواب صاحب بھی ہوشیار ہو کر چلتے..... یہ صورت حال کچھ کچھ ہاتھ سے نکلنے لگی یعنی میں کسی عزیز بزرگ رشتہ دار کے ہمراہ جا رہا ہوں اور میں نے نواب صاحب کو دیکھ لیا ہے اور اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھ سے بازی لے جائیں چنانچہ میں منہ پر پتیلی رکھ کر "ابے او مچھر" کا نعرہ لگا دیتا ہوں نواب صاحب چونک کر نارمل ہوتے ہیں اور ایسے چلتے جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ البتہ جن بزرگ کے ساتھ میں نہایت موڈ بانہ اور عالمانہ گفتگو کرتا ہوا چل رہا تھا وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "بیٹا کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں جناب"

"یہ تم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کیا کہا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں جناب"

اور وہ بزرگ مجھے گھورتے ہیں کہ برغور دار کا دماغ شاید زیادہ کھٹے پڑھنے کی وجہ سے چل گیا ہے۔ ایک مرتبہ راولپنڈی کے کچھ نوجوان ادیب مجھے ملنے کے لئے آئے اور میں انہیں ایک مقامی ریتوران میں چائے پلانے کے لئے لے گیا چائے آگئی اور میں نہایت سنجیدگی سے ادب میں جمالیات و کمالیات وغیرہ کے موضوع پر انہیں لیکچر دینے لگا..... دیکھیں بھئی ادب زندگی کے تمام تر سنگین حقائق کو نہ صرف پیش کرنے کا نام ہے بلکہ ان حقائق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی اور اقتصادی ناہمواریوں کی طرف ایک نظریاتی اور محکم کنندہ نظر

چونکہ طویل ہے اس لئے کبھی آئندہ سہی..... لیکن یہ بتاتا چلوں کہ شاید لاہور میں میں واحد شخص ہوں جس کی کوئی پھیڑ نہیں اس لئے کہ میں پڑتا ہی نہیں..... آپ بے شک جب کبھی مجھے بازار میں جاتا دیکھیں تو پیچھے سے جالے ہو فچٹر کا نعرہ لگا دیں بالکل برا نہیں مانوں گا صرف آپ کا سر توڑ دوں گا۔



خدا گنجے سے خود پوچھے

یہ انگلستان میں میری پہلی حجامت کا قصہ ہے۔ میں بال کٹوانے کے لئے جب "ہیر کٹنگ سیون" کی آرام دہ کرسی پر دراز ہوا تو اپنے سر پر کھڑے قبضی اور اسٹری سے لیس انگریزی نائی کو دیکھ کر یکدم بھونچکا سا رہ گیا۔ بال تو ظاہر ہے میں جھنڈا اڑوانے کے بعد کٹواتا ہی آیا تھا لیکن ایک گورے چٹے، نیلی آنکھوں والے ماؤنٹ بیٹن کی سسل کے انگریز کو بطور نائی دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا یہ الگ بات کہ انہی کے ہم وطنوں نے ہندوستان پر قابض ہو کر نائیوں والا کام ہی کیا تھا یعنی پردے ملک کی حجامت بنا کر ہم سب کو گنجا کر دیا تھا۔ بہر حال اس انگریز نے میرے چھاج نما گنگا گھریالے بالوں میں انگلیاں چلا دیں اور کہنے لگا کہ کیا انگلستان میں نئے نئے آئے ہو؟ میرے اقرار پر بولا: تنجی تمہارے بال اتنے گھنے اور چمکیلے ہیں بس دو چار برس کی بات ہے انگلستان کا دھواں اور غم آلود سرد ہوا تمہارے بالوں کو ختم کر دے گی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کیونکہ ہم کسان لوگ ہیں سوچتے سمجھتے کم ہیں، لٹھ چلاتے ہیں یا مشقت کرتے ہیں۔ ہم کبھی گنجے نہیں ہو سکتے..... اس پر وہ عیار حجام مسکرایا اور ایک بھلی کارڈ گرم کر کے میرے بالوں میں پھیرنے لگا۔ میں نے پوچھا بال کا ٹوگے یا پگھلاؤ گے؟ کہنے لگا: تمہارے بال اتنے گھنے ہیں کہ انہیں کاٹنے کے لئے جو اوزار درکار ہیں وہ بھیڑیں مونڈھنے والوں کے پاس تو ہو سکتے ہیں میرے پاس نہیں چنانچہ پہلے

انہیں پھیل کر کم کروں گا اور پھر کاٹوں گا۔۔۔۔۔ سچی بات ہے مجھے اس پہلی دلائقی
جہامت کا لطف نہ آیا۔ پہروں سر جھکائے ایک ایک بال کی تراش خراش اور پی
جھاؤں کی گنگناہ اور پھر سر کی ماش کا چکر دینے والا مرحلہ ان سب کے بغیر کیا لطف
آتا اس نے تو دو چار مرتبہ بجلی کی مشین چلا کر تولیہ جھاڑ دیا۔۔۔۔۔ آئیے میں شکل دیکھی
تو معلوم ہوا کہ اگرچہ اس کے پاس بھیڑیں مونڈھنے والے اوزار نہ تھے۔ لیکن اس
نے جہامت انہی کی طرز پر بنائی تھی۔ میں ایک پھیلا ہوا اور گنبا سا "مجیدو" لگ
رہا تھا۔

انگلستان کے جہاموں کے بارے میں میری معلومات اتنی وسیع ہیں کہ میں ان
پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ (چونکہ وہاں پر پڑھائی میں دل نہ لگا۔ اس لئے اس
قسم کی نادر معلومات جمع کرتا رہا)۔ لیکن یہ پھر کبھی سہی۔۔۔۔۔ بہر حال انگلستان
میں قیام کے پانچویں برس اور مارچ کی ۲۰ تاریخ کو جب میں نے اپنے بالوں میں
شیمو کیا تو واش بین میں پانی کھڑا ہو گیا کیونکہ میرے سر سے اترنے والے بالوں
سے پانی کا پائپ بند ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ میں گنبا ہو رہا تھا۔ ان پیارے بالوں کے
گچوں کو یوں اترتے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا میں بھی گنبا ہو جاؤں
گا اور میری "ٹنڈ" دھوپ میں ٹھکے گی اور بارش کا پہلا قطرہ میری آنکھوں میں آکر
گرے گا؟۔۔۔۔۔ یقین کیجئے میں قدرے آبدیدہ ہو گیا اور فوراً گنچے پن کی روک تھام
کے لئے معلومات حاصل کرنے لگا (میں اس پر بھی ایک کتاب لکھ سکتا ہوں)۔
تب کسی نے مشورہ دیا کہ لنڈن میں ایک "ایکریٹر کلینک" ہے۔ جہاں سے گنچے اپنے
سر کے بال پاتے ہیں اور وہاں سے علاج کے بعد کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر
سکتا۔۔۔۔۔ اس کلینک کے انتہائی فیشن ایبل اور خوشبودار ماسوں میں ایک ماہر لڑکھن
گیسو نے میرے بالوں اور کھوپڑی کا معائنہ کیا۔ مختلف قسم کے تیزابی مادے انڈیل

کر پوچھا کہ ٹنڈ سے لگتے ہیں یا گرم۔ میں نے کہا نہ ٹنڈ سے نہ گرم میں لگتے بہت
ہیں اور میری کھوپڑی جل رہی ہے۔ وہ ماہر بے حد غوش ہوا کہنے لگا۔ اس کا مطلب
ہے کہ تمہاری کھوپڑی بے جان نہیں ہے۔ تم صرف دس ٹریٹ منٹ لے لو
ٹھیک ہو جاؤ گے اور ہاں یہ ہے کہ وہ خاص برش اور گنگناہی جو آج سے تم استعمال
کر رہے اور یہ صابن اور یہ شیمو۔۔۔۔۔ اور یہ ہیر کنڈیشنر اب ہمارے ہیر کیئر ڈیپارٹمنٹ
میں جا کر پہلا ٹریٹ منٹ لے لو۔۔۔۔۔

ہیر کیئر ڈیپارٹمنٹ کیا تھا۔ جنت کا کوئی گوشہ تھا۔ مقابلہ حسن کا کوئی سیٹیج تھا
۔۔۔۔۔ انتہائی دیدہ زیب اور خوشنوا تین مختلف قسم کے گنچوں اور نیم گنچوں کے
سروں پر چمپئی کر رہی تھیں۔ اور ان میں کچھ ایسے غیر ملکی بھی تھے جو بالکل گنچے نہیں
تھے۔ بہر حال مجبوراً میں نے بھی ایک نازنین کے آگے سر جھکا دیا۔ اس نے میرے
نٹھے کے مطابق میرے سر میں کچھ مشینیں وغیرہ چلائیں۔ دو چار ہاتھ چلائے اور فارغ
کر دیا اور اس دوران یہ معلومات بھی ہم پہنچائیں کہ ان دلوں فلان کلب میں افترنی
رقص ہو رہا ہے اور فلان جگہ واٹن بہت عمدہ ملتی ہے اور یہ کہ میری شام اتنی
معروف نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ کلینک سے باہر آتے ہوئے جب میری خدمت میں ماہر لڑکھن
گیسو کے معائنے۔ آلات بال اگاڑ اور ایک ٹریٹ منٹ کا ہل پیش کیا گیا تو میں نے بجائے
وہاں واپس آنے کے اور مزید علاج کرانے کے، اپنے آپ کو گنبا ہو جانے کے لئے
تیار کر لیا۔۔۔۔۔ اتنی رقم سے میں ایک مادہ کے لئے یورپ کی سیر کر سکتا تھا اور اس
کے علاوہ میں نے سوچا کہ آخر کار لوگ وگیں بھی تو لیتے ہیں ہم بھی لیں گے
وطن واپسی ہوئی تو یہاں کے گرم اور پسینہ لانے والے موسموں نے میرے ٹھٹھرتے
ہوئے مردہ بالوں کو ایک نئی زندگی بخشی اور میں گنبا ہونے سے بال بال بچ گیا۔
البتہ میں حیرت میں تب مبتلا ہوا جب میں نے نہ دیکھا کہ موزوں موسم کے باوجود اس ملک

اسے اس وقت ہوا جب اس کی گائے نے ایک روز اس کی گنئی کھوپڑی پر لگی ہوئی چارے کی دھول کو چاٹا چند ہفتے گائے نے اس کے سر کو چاٹنے کا یہ عمل جاری رکھا جس کے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال اگنے شروع ہو گئے ہیں جو کئی سال سے گنیا تھا۔

چنانچہ تمام گنئے حضرات کو رب کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے ان کے لئے گائے بنائی لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ کیا گنیا پن تمام گائیوں کے چاٹنے سے دور ہو جاتا ہے یا یہ خصوصیت صرف انگلستان میں پائی جانے والی "جنگلی گلاب" نامی گائے میں ہی پائی جاتی ہے۔ بال اگاؤ صنعت صرف اسی گوری گائے میں موجود ہے تو پھر اسے فی الفور درآمد کر کے ملکی گنوں کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ ہماری امپورٹ پالیسی میں اگر "جنگلی گلاب" گائے کو درآمد کرنے کے لئے کوئی شق موجود نہ ہو تو پھر روزِ مشترک کا انتظار کیجئے۔ جب خدا گنئے سے خود ہی پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟

میں بھی گنئے وافر مقدار میں موجود ہیں ان میں سے کچھ تو اصلی گنئے تھے اور بیشتر کو حالات نے گنیا کر دیا تھا یہ بھی معلوم ہوا کہ گنیا پن دولت اور دانشوری کی نشانی ہے۔ الحمد للہ میں ان دونوں سے محروم ہوں اس لئے میرے گنئے ہونے کا امکان بالکل نہیں ہے۔ میں مزید حیرت میں تب مبتلا ہوا جب یہ پتہ چلا کہ پاکستان میں جہاں ہر قسم کی امراض کے ماہر اور ایکسپٹ پائے جاتے ہیں وہاں بال کی کھال کلینک" قسم کا کوئی ادارہ نہیں، جو گنئے پن کی روک تھام کے لئے موثر اقدام کر سکے اس ادارے کی سربراہی کے لئے متعدد ادیب دوستوں کے نام تجویز کیے جا سکتے ہیں جو میں نہیں کر رہا کیونکہ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی ہیں اور شینڈ ہے کہ داتا گنج بخش کے مزار پر بہت جایا کرتے تھے چنانچہ مکمل طور پر بخشے گئے..... کہا جاتا ہے کہ موت اور گنئے پن کا علاج ممکن نہیں۔ ہمارے گنئے یاروں نے انڈوں کے لیپ، پان کے پتوں کی گرمی، غیرہ گافز بان، ولائٹی جیٹر کنڈیشنر سب کچھ استعمال کیا جس سے شینڈ میں مزید چمک تو پیدا ہو گئی، بال پیدا نہ ہوئے، اب تو یہی ہے کہ روزِ مشترک خدا گنئے سے خود پوچھے گا کہ بتا تیری رضا کیا ہے تو وہ کہے گا "ہاں"..... لیکن انہی دنوں ادھر انگلستان سے ہی ایک ایسی خبر آئی ہے کہ گنوں کو روزِ مشترک کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور اس خبر کو آپ تک پہنچانے کے لئے ہی میں نے اپنی لمبی چوڑی تنہید باندھی ہے۔ خبر ملاحظہ کیجئے۔

لندن ۱۱ مارچ (ن ر) ایک گائے جو "جنگلی گلاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ایک کسان کا سرچاٹ کر اس کے گنئے پن کا علاج کر رہی ہے۔ خلیج ٹائمز کے مطابق ۵۶ سالہ گنئے آدمی جان کو مزے ہو جنوب مغربی انگلستان میں سالہری کے قریب کاشت کاری کرتا ہے بتایا ہے کہ گنئے پن کے اس نئے علاج کا انکشاف

خلیفہ چاقو نہیں کہلانا چاہتا تھا۔ خلیفہ گھڑا، خلیفہ انگوٹھی، خلیفہ نڈکا، خلیفہ غلیب! خلیفہ زندہ، یا خلیفہ بیٹر بکس وغیرہ کے نام سے نہیں پکارا جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ میں نے کہا "خلیفہ جی۔۔۔۔۔ مختلف امیدواروں کو مختلف نشانات الاٹ ہوتے ہیں آپ اپنی پسند کا کوئی نشان بھی تو مانگ سکتے تھے۔"

کہنے لگے "ہاں۔۔۔۔۔ اگر میں عوام الناس میں سے ہوتا تو کچھ بھی مانگ لیتا لیکن تم جانتے ہو ادیب برادری کو میرا جو بھی نشان ہوتا اس کے کچھ نہ کچھ الٹ پلٹ معافی نکال لئے جاتے اس لئے میں نے باہر بیٹھنے میں ہی عافیت جانی البتہ میں نے مختلف ادیبوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے کہ اگر وہ الیکشن میں حصہ لیتے تو کون کون سے انتخابی نشان ان کی شخصیتوں کی صحیح عکاسی کرتے۔۔۔۔۔"

اب میرے دل میں کھد بد شروع ہوئی کہ جانے خلیفہ نے میرے لئے کونسا انتخابی نشان چنا ہے چنانچہ میں نے پوچھا "یا خلیفہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بھلا کون کون سے ادیب ہیں اور ان کے انتخابی نشان کون سے ہیں؟"

خلیفہ خلفشاری نے اپنے بیگ سے فہرست نکالی اور پڑھنے لگا۔

اشفاق احمد عرف تلقین شاہ کے لئے "ریڈیو"

کشورنا ہمد کے لئے "سلائی کی مشین" عورت ذات کے لئے یہی مناسب ہے۔

انتظار حسین صاحب "رہت" ہوں گے، انہیں ٹیوب ویل سے الرجی ہے

انور سجاد کے لئے "برش" بہتر ہے گا مصو رہی تو ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش "پہاڑ" وہ جوگی میں جو پہاڑ سے اتر آئے ہیں۔

اصغر ندیم سید کے لئے "لاؤڈ سپیکر" اسے بولنے کا بہت شوق ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر تو ظاہر ہے سائیکل ہی ہوں گے۔

رحیم گل خان کے لئے "کلمہ"

میں لوٹا نہیں ہوں

ان دنوں ٹی ہاؤسوں اور ادبی محفلوں میں ایک ہی موضوع زیر بحث ہے اور وہ ہے الیکشن اکثر ادیب پچھتا بلکہ تلملا رہے ہیں کہ انہوں نے الیکشن لڑنے کے لئے کاغذات نامزدگی کیوں نہ داخل کروا دیئے اس پچھتاوے اور تلملاہٹ کا سبب الیکشن میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں اور اداکاروں کی غیر متوقع پذیرائی ہے البتہ ہمارے بزرگ ادیب حضرت خلیفہ خلفشاری (نام فرضی ہی سمجھا جائے) نہ پچھتا رہے ہیں نہ تلملا رہے ہیں بلکہ سکھ چین کی بنسی بنجار ہے ہیں میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگے میں نے جان بوجھ کر کاغذات نامزدگی داخل نہیں کروائے۔۔۔۔۔ میں نے اس کا بھی سبب پوچھا تو قریب ہو کر بولے میں انتخابی نشان کا رسک نہیں لینا چاہتا۔۔۔۔۔

"انتخابی نشان! میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں" وہ کہنے لگے پہلے تو ارادہ تھا لیکن پھر ایک روز اخبار میں قومی مصوبائی

اسمبلیوں کے امیدواروں کے نشانات کی تصویریں دیکھیں تو ارادہ بدل دیا۔۔۔۔۔

دیکھو بھئی میں اس عمر میں آکر لوٹا نہیں ہو سکتا۔

"لوٹا خلیفہ خلفشاری؟"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔۔۔۔۔ اگر مجھے لوٹے کا نشان الاٹ ہو جاتا

تو میں کیا ہوتا! خلیفہ خلفشاری لوٹا۔۔۔۔۔ اسی طرح میں گلاس" نہیں ہونا چاہتا تھا

”سلمان بٹ“ سکوتر.....
 احمد ندیم قاسمی وہ ”پل“ ہیں جو نئی اور پرانی نسل کے درمیان کھڑے ہیں۔
 اسرار زیدی پنسل..... لکھتے ہو رہتے ہیں۔
 نجیب احمد ”تائنگہ“..... لیکن گھوڑے کے بغیر
 انور سدید ”لیٹر بکس“..... دوستوں اور اخباروں کو خط لکھنے میں مزید آسانی
 ہوگی۔
 اظہر جاوید ”تتلی“..... چونکہ انتخابی نشانوں میں ”بھنورا“ نہیں ہے اس لئے
 امجد اسلام امجد ”کنگھی“.....
 انیس ناگی ”آری“..... جو کاسٹی چلی جاتی ہے۔
 جاوید شاہین ”چار پائی“ جہاں جاتے ہیں لیٹ جاتے ہیں۔
 وزیر آغا ”ٹرکیٹر“.....
 ڈاکٹر آغا سہیل ”کار“ جو وہ چلا نہیں سکتے۔
 مسعود اشعر ”عینک“
 سراج منیر ”تیر“ جو نشانے پر جا لگا ہے۔
 زاہد ڈار ”کتاب“
 بانو قدسیہ ”چرخہ“ جس پر ڈرامے کاتتی ہیں۔
 خلیفہ خلفشاری نے فہرست اپنی جیب میں ڈالی اور اٹھ کر جانے لگا.....
 ”یار خلیفہ..... اس میں میرا نام نہیں ہے؟“
 ”اچھا اچھا“ خلیفہ قدسے شرمندہ ہو کر بولا ”یار ادا دیب تو شاید تم بھی ہو“
 میں دراصل تمہیں اب تک ادا کار سمجھتا رہا..... بہر حال چند ایک نشانات
 باقی ہیں ان میں سے کوئی ایک سا پسند کر لو..... مثلاً ”ماچس“ کیسا ہے؟



خلیفہ خلفشاری بڑی سنجیدگی سے بولا ”لوٹا“

میں بھی قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں

ایتنا بھ سنیل دت وجنتی والا محمد قوی عنایت حسین بھتی منصور بلوچ اور سرفراز نواز نے مل جل کر میری ازدواجی زندگی تباہ کر دی ہے میرا گھر پلے سکون برباد ہو چکا ہے اور میری اہلیہ محترمہ دن رات میرے کان کھاتی رہتی ہیں آج صبح ناشتہ کی میز پر خوشگوار گفتگو کا آغاز کچھ اس طرح ہوا۔

”تو پھر تم نے کیا سوچا؟“

”کس کے بارے میں؟“

”الیکشن کے بارے میں اور کس کے بارے میں؟“

”میں نے کیا سوچنا ہے الیکشن ہو رہا ہے اچھی بات ہے..... میں الیکشن کے حق میں ہوں۔“

”کیا تم ہمیشہ اتنے ہی احمق رہو گے؟“

”زیادہ ہونے کی گنجائش نہیں؟“

”میں پوچھتی ہوں تم نے الیکشن میں کھڑے ہونے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

میں نے اخبار ریلیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اہلیہ محترمہ کی جانب دیکھا جو اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں ”دیکھو بیگم یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔“

”ان کا شعبہ ہے جو کھڑے ہو رہے ہیں؟“

”ان کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”پھر کیا سوچا ہے؟“

”لیکن بیگم مجھ میں ہے کیا جو میں الیکشن میں کھڑا ہو جاؤں؟“

”تم میں کیا نہیں ہے؟ وہ سب کچھ ہے جو ایتنا بھ سنیل دت سرفراز نواز

اور وجنتی والا میں ہے۔“

میں قدرے زور سے ہو گیا کہ مجھ میں وہ کیا ہے جو وجنتی والا میں بھی ہے..... البتہ زندگی میں پہلی مرتبہ میری بیگم نے مجھے کسی قابل سمجھا تھا اس لئے میں غور سے سنتا رہا۔

”دیکھو تم بھی مشہور ہو لوگ تمہیں جانتے ہیں ٹیلی ویژن پر آتے ہو کتابیں لکھتے ہو کالم لکھتے ہو آخر یہ سب فضول کام کس دن تمہارے کام آئیں گے.....“

فائدہ اٹھاؤ۔“

”فرض کرو میں الیکشن میں کھڑا ہو جاتا ہوں تو پھر میں اپنے ووٹروں کو جا کر کیسا کہوں گا..... یہ کہ میرا چہرہ دیکھو میری کتابیں اور کالم پڑھو..... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”نہیں نہیں تم بھی کہنا کہ میں قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں؟“

”وہ تو میں کر رہا ہوں۔“

اوہو یہ خدمت تو یک طرفہ ہے..... دوسری طرف سے تمہاری خدمت بھی ہونی چاہیے۔“

”وہ کس طرح؟“

”الیکشن میں کھڑے ہو کر..... ان لوگوں کا دماغ تو نہیں خراب کہ اپنے کیریئر چھوڑ کر سیاست میں آ رہے ہیں کچھ نہ کچھ تو فائدہ ہوگا..... اچھی طرح سوچ لو یہ نہی موقع دوبارہ نہیں آئے گا؟“

”کیوں دوبارہ الیکشن نہیں ہوں گے؟“

ہوں گے لیکن یہ جو رواج ہو گیا ہے ناں ادا کاروں وغیرہ کو ووٹ دینے کا یہ دوبارہ نہیں ہوگا۔

”اور میں تو ادیب سا ہوں؟“

”خبردار جو ووٹوں کو یہ بتایا کہ تم پڑھتے لکھتے ہو..... برا اثر پڑے گا ہمیں پڑھے لکھے لوگوں کی نہیں مشہور لوگوں کی ضرورت ہے جن کی تصویریں ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں؟ بس تم اللہ کا نام لے کر اعلان کرو۔“

”کس قسم کا اعلان؟“

”یہی کہ میں پہلے اخباروں اور کتابوں..... نہیں نہیں یہ تو پڑھائی لکھائی کی باتیں ہیں یہی کہ میں پہلے ٹیلی ویژن پر قوم کی خدمت کرتا تھا لیکن وہاں بیٹھ کر اچھی طرح سے خدمت نہیں ہوئی تھی اس لئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں میدان عمل میں کود کر اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے وقف کر دوں۔“

”اگر میں اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے وقف کر دوں گا تو پھر گھر کا خرچ کیسے چلے گا.....؟“

”یقین کر دو اس سے بہت بہتر چلے گا جس طرح کہ چل رہا ہے..... میں یہاں آس پاس کی خواتین کو جمع کر کے ”محاذ برائے تارڑ“ بنالوں گی اور تم اپنے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سارا دن شہر میں گھومتے رہنا اور لوگوں کے نفروں کا بولب بولہ ہانا کروینا۔“

”باتھ ہلاؤں گا تو موٹر سائیکل سے گر پڑوں گا..... اور بیگم مجھے ووٹ کون دے گا۔؟“

”یہ جو کالے منہ والیاں تمہیں دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں وہ دیں گی یہ طالب علم دیں گے جو ہر وقت تمہارا دماغ کھاتے رہتے ہیں۔“

یہ سب اکہیں سال سے کم عمر کے ہیں..... ان کے علاوہ؟

بیگم نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہنے لگیں ”اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو تمہیں ووٹ دیں گے تم اللہ کا نام لے کر اعلان کرو۔“

تو خواتین و حضرات میں بھی الیکشن میں کھڑے ہونے کا اعلان کرتا ہوں اب آپ کی عزت میرے ہاتھ میں ہے..... میرا مطلب ہے میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ نیت تو میری یہی ہے کہ میں قوم اور ملک کی خدمت کروں لیکن مجھے کچھ ٹھیک سے معلوم نہیں کہ یہ خدمت کیسے کی جاتی ہے اس لئے آپ میری مشکل حل کیجئے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے مجھے نواز بیٹے میرا نام تو آپ کو یاد نہیں رہے گا کیونکہ ذرا مشکل ہے اس لئے صرف میری شکل یا درکنے یہ شکل اتنی اچھی تو نہیں ہے کہ اسے یاد رکھا جائے لیکن اگر آپ عنایت حسین بھٹی اور منصور بلوچ کو یاد رکھ سکتے ہیں تو میرے لئے بھی زحمت کر بیٹے گا کہا یہ جارہا ہے کہ صرف وہ

اداکار الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں جو ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو چکے ہیں یا ہونے والے ہیں اور پبلک ان کو دیکھ دیکھ کر تنگ آچکی ہے اور ان سے چٹکارا حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انہیں ووٹ دے کر فلم اور ٹیلی ویژن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا جائے..... یہ بالکل غلط پروپگنڈا ہے سرفراز نواز کو دیکھئے وہ چاہتے تو ستر سال کی عمر تک کرکٹ کھیل سکتے تھے کیونکہ انہیں منع کر کے کسی نے مار کھانی ہے محمد قومی بھی ہمیشہ پولیس کی وردی میں رہ سکتے ہیں عنایت حسین بھٹی

کا ”محبت کا جنازہ جارہا ہے“ اب بھی جارہا ہے اور کیا خوب جارہا ہے..... معاف کیجئے گا میں بوش الیکشن میں اپنے حریفوں کا دفاع کئے جارہا تھا۔ دراصل تجربہ نہیں ہے ناں آہستہ آہستہ وہ بھی ہو جائے گا فی الحال میرے اعلان پر گزارہ کیجئے اور ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لئے مجھے ارسال کر دیجئے۔ شکریہ!

کو یاد رکھ سکتے ہیں تو میرے لئے بھی زحمت کر بیٹے گا کہا یہ جارہا ہے کہ صرف وہ

اداکار الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں جو ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو چکے ہیں یا ہونے

والے ہیں اور پبلک ان کو دیکھ دیکھ کر تنگ آچکی ہے اور ان سے چٹکارا حاصل کرنے

کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انہیں ووٹ دے کر فلم اور ٹیلی ویژن سے ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے رخصت کر دیا جائے..... یہ بالکل غلط پروپگنڈا ہے سرفراز نواز کو دیکھئے

وہ چاہتے تو ستر سال کی عمر تک کرکٹ کھیل سکتے تھے کیونکہ انہیں منع کر کے کسی نے

مار کھانی ہے محمد قومی بھی ہمیشہ پولیس کی وردی میں رہ سکتے ہیں عنایت حسین بھٹی

آستینوں کے بُت

قدیم بدھ درگاہ جولین کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد ہم عہد رفتہ کے ایک عظیم شہر سری کپ کی پتھر لی دیواریں دیکھنے کے لئے گئے داخلے کے بورڈ پر ٹکٹ کی شرح درج تھی۔ میری بیوی نے بچوں اور بڑوں سمیت سب کو گنا پھر اپنے بٹوسے میں جھانکا اور بولی "پہلے ٹیکسلا عجائب گھر..... ہمیں روپے، پھر جولین کے کھنڈرات..... ہمیں روپے اور اب یہ سری کپ کے پتھر..... کم از کم میں ان پتھروں کے ڈھیر کے لئے مزید ہیں روپے خرچ نہیں کر سکتی ابھی میں نے ٹیکسلا کی سوغات پتھر کی کوئٹی بھی خریدنا ہے....." میں نے اسے سمجھایا کہ نیک بخت یہ صرف پتھر نہیں ہیں ایک قدیم شہر ہے..... اس کی تاریخ ڈھائی ہزار سال پیشتر شروع ہوئی اور مہاتما بدھ....."

"بس بس..... مہاتما بدھ بہت ہو چکا، پہلے اندس کی تاریخ سننا کر میرے کان پکائے ہیں اور اب مہاتما بدھ کے پیچھے پڑ گئے ہو۔" میں بے حد ملول ہوا کہ یہ بی بی تاریخی شعور سے یکسر عاری ہے اور سر کپ کا شہر دیکھنے کی بجائے اپنے باورچی خانے کے لئے پتھر کی کوئٹی خریدنا چاہتی ہے۔ بہر حال میں نے ایک اور کوشش کی "سر کپ کا شہر اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ آج کا نیو یارک لندن، ٹوکیو یا لاہور....."

"اچھا تو کیا سری کپ میں رہنے والی گھریلو خواتین کے باورچی خانے میں مصالحہ پینے کے لئے پتھر کی کوئٹیاں نہیں ہوتی تھیں؟ مجھے سری کپ نہیں چاہیے، کوئٹی چاہیے۔"

اگر کھنڈر دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو یہ سامنے والے ٹیلے پر چڑھ کر نگاہ ڈال لو اندر ضرور جانا ہے..... جیسا کہ تمام حضرات جانتے ہیں بیویوں کو تاریخی شعور یا کسی بھی قسم کا شعور دینا خاوندوں کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں ایک پالٹو ہانور کی طرح کان لپیٹ کر ٹیلے پر چڑھنے لگا..... وہ درست کہتی تھی یہاں سے سری کپ کے وسیع کھنڈرات نظر آرہے تھے..... ٹیلے پر ایک نوجوان چرواہا اپنی بھیڑوں سے نافل کھنڈروں میں گھومنے والی سیاح خواتین کو دیکھ رہا تھا..... تب میں نے دیکھا کہ ایک غیر ملکی جوڑا باہر آیا اور ایک کمبل پوش مقامی نوجوان ان کی جانب بڑھا۔ اس نے ایک چور کی طرح ارد گرد احتیاط کی ایک نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کمبل میں سے ایک چوٹا سا مہاتما بدھ برآمد کر کے جوڑے کے سامنے پیش کر دیا وہ متاثر ہوئے بغیر آگے چلتے رہے۔ اور نوجوان اپنے کمبل میں سے جسے نکال نکال کر انہیں دکھاتا رہا لیکن ایک وقت میں صرف ایک مجسمہ۔ غیر ملکی جوڑا کوئی بھی مجسمہ خریدے بغیر اپنے تانگے پر سوار ہوا اور جولین کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں ٹیلے سے نیچے آیا اور کمبل پوش کے پاس چلا گیا کیا حال ہے؟ "ٹھیک ہے" اس نے بے رخی سے کہا اور چلنے لگا۔

"یار بات سنو" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہے؟ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کمبل میں تھے۔

"تمہاری آستینوں میں بت ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"نہیں صاحب جی..... ہم تو مسلمان لوگ ہیں۔ توبہ توبہ بت فروش تو نہیں۔"

"یہ کمبل کے اندر آستینوں میں کیا ہے؟....."

"آپ کوئی افسر ہیں.....؟ وہ بے حد گھبرا گیا۔

"نہیں نہیں" میں نے اسے دلاسا دیا "دراصل میں بھی بت بیچتا ہوں....."

ہتوں کا سوداگر ہوں۔ ذرا دکھاؤ تو سہی تمہاری آستین میں کیا ہے..... اصلی ہیں یا نقلی؟
 ”یہ تو نقلی ہیں“ وہ ہنر بڑا کر بولا ”اصلی تو گھر پر ہیں“
 ”گھر کہاں ہے؟“
 ”وہ سڑک کے پار جو گاؤں ہے وہاں.....“
 میں نے میجر بشتر سے کہا کہ وہ بچہ لوگ کو لے کر ٹیکسلا چلا جائے اور میری بیوی کو پتھر کی کوندی خرید دے میں پہنچ جاؤں گا۔
 کمبل پوش کا گھر نہایت صاف ستھرا تھا۔ پڑھتوں پر جا پانی ڈنر سیٹ اور چینی ٹی سیٹ سجے تھے۔ کونے میں ٹیلی ویژن تھا اور شاید رنگین تھا۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بٹھایا۔ دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور پھر فرش پر ایک سفید چادر پھیلا دی۔
 ”صاحب جی اصلی پیش کروں یا نقلی.....“
 ”دونوں“ میں نے کہا۔ اس نے ایک بڑے سارے نواری پنڈنگ پر بھی جاؤ۔
 کا کٹرا اٹھایا اور اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک مجسمہ باہر نکالا۔ پھر دوسرا..... پھر تیسرا۔
 دو تین مہاتما بدھ تھے۔ چند یونانی خدو خال کے سر تھے۔ ایک ٹوٹا ہوا ہاتھ تھا۔
 ایک گنگو گھوڑا اور چند سکے.....
 ”نقلی کون سے ہیں؟“ اس نے چند مجسمے اٹھا کر دکھائے میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان کی تراش خراش ہو ہو قدیم مجسموں کی سی تھی۔ البتہ ایک آدھ اونچ کی کسر بنور دیکھنے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔ مثلاً ایک میں مہاتما بدھ تقریباً ہنس رہے تھے۔ یا ان کا ایک کان دوسرے سے لمبا ہو گیا تھا کمبل پوش انہیں گاؤں والوں سے چھپ کر بناتا تھا اور پھر کسی خاص تہناب میں ڈبو کر انہیں ”قدیم“ کر لیتا تھا۔
 پھر کناروں سے ٹوٹا..... مٹی میں دبایا اور مجسمہ تیار۔ میں نے اس سے پوچھا کہ

وہ اصلی قدیم بت کہاں سے حاصل کرنا ہے کہنے لگا ”صاحب جی بس یہ تو کاروبار کا راز ہے ویسے زیادہ تر پشاور اور سوات کے علاقے سے مال خرید کر لاتا ہوں۔ ٹوٹا پھوٹا۔ پھر اسے خود جوڑتا ہوں اور مرمت کر کے بیچ دیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ بھائی میرے یہ کاروبار تو غیر قانونی ہے۔ ایسا کیوں کرتے ہو؟ کہنے لگا صاحب جی میں کوڑا کرکٹ جمع کر کے محنت کرتا ہوں اور چار پیسے بنا لیتا ہوں۔ کاروبار تو بڑے لوگ کرتے ہیں اور سب کے سامنے کرتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ بڑے بڑے مجسمے افسروں کے گھر چلے جاتے ہیں۔ میں تو پتھروں کے ٹکڑے لا کر جوڑ لیتا ہوں۔ کمبل پوش کے بنائے ہوئے قدیم مجسموں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ شہر میں ہوتا تو آرش کالچ میں لیکر دیتا اور بت تراش کہلاتا۔ یہاں پر آستینوں میں بت چھپائے پھرتا ہے۔ گھر سے باہر آتے وقت اس نے پوچھا کہ صاحب جی آپ بھی تو بت بیچتے ہیں؟ اصلی یا نقلی؟..... میں نے کہا، میرا سارا مال نقلی ہے.....
 لفظوں سے بت بناتا ہوں اور پھر انہیں سفر ناموں، انسانوں، ڈراموں اور کالموں کی صورت بیچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن منقا بلہ بڑا سخت ہے۔ وہاں شہر میں ایک سے ایک بڑا بت فروش پڑا ہے..... جو اپنے بت فروخت کرے، اس کے اصلی اور جوڑ کر سکے اس کے نقلی..... بقول تمہارے کوڑا کرکٹ اور پتھر کے ٹکڑے..... کمبل پوش نے خدا حافظ کہنے سے پیشتر اپنی آستین میں سے ایک بت نکالا اور کہنے لگا ”صاحب جی یہ لے جاؤ، میری طرف سے..... اصلی ہے؟“
 میں نے کہا ”نہیں.....“ ادھر شہر میں ہزاروں بت بنے ہوئے ہیں..... کچھ بن بیٹھے ہیں۔ اس جہوم میں تمہارا اصلی بت بہت اکیلا محسوس کرے گا..... رہنے دو“ میں ٹیکسلا واپس آیا تو میری بیوی پتھر کی کوندی اور چند گلے خرید چکی تھی اور ہم واپس اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

”شاعر تو نہیں ہوں لیکن شاعر کے پہلو میں بیٹھا ہوں اس لئے اثر تو ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ دیے بجا بھی آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے؟“

اس کا جواب ہماری بیگم نے دیا کہنے لگیں ”اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں۔۔۔۔۔ یہ بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔ دیے آپ لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے لاہور اور شاہدرہ روڈ کے شور کے بعد یہاں بالکل سکون ہے اس لئے آپ کے کان نہیں بچ رہے۔“

ڈاؤنڈ میونسپلٹی کے سکون کے بارے میں اپنی بیگم کی عقلمندی پر نڈھال ہو گیا ”شہر کے شور و غوغا کے بعد شہرپور روڈ کا سکون ہمیں راس نہیں آیا تھا اور ہم یہ سمجھے کہ ہمارے کانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔۔“

”میں بھی مزاق کر رہا تھا“ شاہ صاحب بولے ”لیکن یار اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان پُر سکون فضاؤں کے لئے پیدا کیا ہے تو ہمارے اعصاب اتنے شور و غل میں جواب کیوں نہیں دے جاتے؟ اس وقت صرف گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز ہے جو کا خاموش شاہد ہے کہیں کبھار مخالف سمت سے کوئی گاڑی آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔۔۔۔۔ شہر میں ہم کس عذاب میں رہتے ہیں؟“

”مافی ڈیئر شاہ جی یہ عذاب تو ہم نے اپنے لئے خود چنا ہے بلکہ ہمارے والد صاحبوں نے چنا ہے جو گاؤں سے اُٹھے اور بہتر مستقبل کی خواہش میں شہروں میں آئے ہیں اب ہم واپس اسی سکون کو لوٹنا چاہتے ہیں تو بندہ سکون اور بہتر مستقبل میں سے ایک کو ہی چن سکتا ہے۔“ شاہ جی بولے ”شہر نے ہمیں کیا دیا ہے؟“

”شہر نے ہمیں کیا دیا ہے؟ بیگم شاہ نے ڈانٹ پلائی ”کمال ہے۔ یہ شہر کی وجہ سے تم اس وقت اپنی کار پر سفر کر رہے ہو ورنہ کسی گدھے پر سواری کر

پینک شہرپور اور چور بیگمات

دریائے راوی کا پل عبور کیا لاہور شہرپور روڈ کی سائیکل فیکٹریوں کے جھرم جھرم، ٹریڈرز، ٹریڈیوں اور دیکنوں کے پر شور جنگل میں سے بچتی بچاتی شاہ کی سوز کی کا جب شہرپور جانے والی چھوٹی مٹرک پر آئی تو ایک دم وہ پریشان سا ہوا اور سیرنگ پر ہاتھ مار کر بولا ”چودھری صاحب“

میں نے کہا ”جی شاہ صاحب“

کہنے لگا ”میرے کان بند ہو گئے۔“

”کان بند ہو گئے مجھے نہیں معلوم تھا کہ دماغ کے علاوہ تو ہمارے کان بھی کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔“

اب میں نے بھی غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعی ہر سو ایک پر اسرار قسم کی خاموشی تھی سردیوں کی نگلی دھوپ تھی اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک گدھا گاڑی کو مٹرک پر آتا دیکھ کر شاہ جی نے بارن دیا ”یار یہ بارن تو سنائی دیتا ہے۔۔۔۔۔ اور کچھ سنائی نہیں دیتا“

پچھلی نشست پر ہم دونوں کی بیگمات جو اس پاس سے لا تعلق اچھے ہیں فروخت ہونے والی انتہائی ارزاں اون کے بارے میں ایک عالمانہ گفتگو کر رہی تھیں خاموش ہو گئیں۔

”یہ تو اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں، بھائی جام لیکن آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ تو شاعر نہیں ہیں“ بیگم شاہ نے کہا۔

رہے ہوتے کالج میں پڑھاتے ہونٹکٹنوں میں مضمون پڑھتے ہوٹیلی ویشن کے لئے کبھی کبھار لکھتے ہو..... یہ سب کچھ شہر کی وجہ سے ہی تو ہے۔

”ہاں“ شاہ جی نے سر ہلایا ”لیکن کنٹری سائیڈ کی کیا بات ہے میرا تو جی چاہتا ہے کہ ادھر شہر چھوڑ دوں اور کچھ زمین لے لوں اور کاشتکاری شروع کر دوں اور دوپہر کا کھانا کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں بھتہ تم لے کر آؤ۔“

”پھر شادی بھی کسی گنوار سے کریں جو بھتے اٹھانے والی ہو، بیگم شاہ نے چمک کر کہا۔

”یہ بھی ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں“ میری بیگم نے گرہ دی۔

”کہتے ہیں میں تو شہر سے تنگ آ گیا ہوں میں کہتی ہوں کہ آپ تنگ آ گئے ہوں میں تو شہر کی رہنے والی ہوں اور یہ ہیں۔ ہوں گی۔“

”اچھا“ بیگم شاہ نے غور سے ہو کر کہا ”آپ بھی شہر کی ہیں؟ میں بھی شہر ہی میں پٹی بڑی ہوں۔“

”پٹی زیادہ ہے اور بڑی کم ہے“ شاہ جی نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا ”چپ کرو تم.....“ بیگم شاہ غصے میں آ گئیں ”تم شکر کرو کہ تم جیسے پینڈو کو ایک پڑھی لکھی سلیقہ شعار شہری بیوی مل گئی کسی پینڈو بیوی کو اپنے شعر سناتے تو چھٹے سے مرمت کرتی.....“

”میری بیگم بھلا کہاں چپ رہنے والی تھی اس نے بیگم شاہ کی شہ پا کر مجھ پر چڑھائی کر دی“ اور تم بھی اللہ کا شکر کرو کہ میں تمہارے نصیب میں تھی ورنہ ادھر ضلع گجرات کی کسی ان پڑھ بیوی سے بندھ جاتے تو وہ اشاعت سے پیشتر ہی تمہارے کالم سفر نامے اور افسانے سنتی؟ ٹیلی ویشن کی وجہ سے یہ جو چیزیں تمہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے شرمی سے دیکھتی ہیں ان کے بال نہ نوچ لیتی..... میں تو چپ رہتی ہوں۔“

بات کہیں سے کہیں نکل گئی تھی۔

شہر چھوڑ دوں کے آس پاس ہر یاد دل کا رنگ تھا سر ہر کیفیت درخت اور سروں کے پیلے پھول۔

”یار گاڑی روکو“ میں نے شاہ سے کہا۔

”کیوں چودھری..... ضروری ہے؟“

”ہاں بہت ضروری ہے۔“

اس نے گاڑی روکی اور میں سڑک سے اتر کر سروں کے پیلے کھیت کے کنارے جا کھڑا ہوا ”اچھا تو یہ ہے سروں اور اس کی پیلا ہٹ..... بہت عرصہ ہوا سے دیکھے ہوئے اور اس کی باس کو نتھنوں میں محسوس کئے ہوئے“ میں نے ایک طویل سروں بھر اسانس اپنے اندر کھینچا شاہ جی نے سگریٹ سلگایا اور ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے ہماری بیگمات اپنے قیمتی کپڑوں ایڑھی کے شوز سمیت کھیت کے اندر گھومنے لگیں ہم طویل قید میں رہنے والے جانور تھے جو چند لمحوں کے لئے آزاد ہوئے تھے کھیت میں سے ایک مزدور برآمد ہوا ہمیں حیرت سے دیکھا اور کدال اٹھا کر گنڈنڈی پر چلنے لگا ”وسے بھائی“ وسے بھائی“ بیگم شاہ نے پکارا وہ رک گیا۔

”بھائی ہم تھوڑا سا ساگ لے لیں؟“

”آہو.....“ پر ایک مٹھ لینا“ اس نے بھاری آواز میں کہا اور چلا گیا۔

ہماری بیگمات ساگ توڑنے لگیں اور توڑتی ہی گئیں۔

”بھئی اس بھلے مانس نے کہا تھا کہ صرف ایک مٹھی لینا پورے کھیت کا تو نہیں کہا تھا“ شاہ جی چونکہ قدر سے بزدل ہیں اس لئے ہر اسان ہو کر بولے۔

”کوئی پکڑے گا تو ہمیں ہی پکڑے گا تم کیوں فکر کرتے ہو؟“ بیگم شاہ نے جواب دیا۔

”کاش“ شاہ جی نے ایک آہ بھری اور سگریٹ پینے لگے۔

”یارو ہمارے بیگمیں کدھر گئیں؟“

”کیوں؟ تمہیں سکون اور آزادی پسند نہیں..... جہاں بھی گئیں ہیں آجائیں گی۔“
”نہ بھی آئیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟“ شاہ جی تھنڈی سانس بھر کر بولے اور پھر
مسکراتے لگے شاہ جی صاحب زیر مونچھ مسکراتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کوئی معصوم
ساجھ نقلی مونچھیں لگا کر مسکرا رہا ہے یعنی بے حد سویت لگتے ہیں۔

”بھیل“ میں سر کندھے تھے اور ان میں ایک بگلا دھوپ سینک رہا تھا۔
بے حد پُرسکون منظر تھا ٹھہرا ہوا کافی زود پانی، سر کندھے، تازہ ہوا اور آسٹوگی
دینے والی نرم دھوپ یکدم اس پُرسکون اور خاموش منظر میں ”ٹھہرو ٹھہرو پور چوڑ“
کی صدا بلند ہوئی ہم نے پٹ کر دیکھا تو ہماری بیگمات دوپٹوں میں امرود بھرے
زردیکی باغ میں سے سرپٹ بھاگتی چلی آ رہی تھیں اور ایک رکھوالا سر پر ہاتھ
دھرے شور مچاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگتا آ رہا تھا۔

”اوئے مارے گئے“ شاہ جی زور سے ہو گئے ”بڑی بے عزتی کی بات ہے
چودھری..... ہم عزت دار لوگ ہیں ادیب شاعر لوگ ہیں اور ہماری بیویاں چوکی
کر کے بھاگی چلی آ رہی ہیں؟“
بیویاں جب قریب آئیں تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے ساتھ
ہی رکھوالا بھی پہنچ گیا جس کا چہرہ غصے سے دمک رہا تھا۔
”کچھ شرم کر دو..... چوریاں کرتے ہو..... پڑھے لکھے ہو کوئی ان پڑھ تو نہیں
..... حیا ہی نہیں رہی“ وہ شور مچانے لگا۔

”بھائی جان میسر بھرا..... رکھوالا صاحب“ شاہ جی نے لرزتے ہوئے اس
کو سلام کیا ”کوئی بات نہیں..... معاف کرو اس بھائی بھیاں ہیں شہر سے آئی ہیں۔“

ساگ کے پلندے ہم نے کار میں پھینکے اور پھر سفر شروع ہو گیا..... وہی
پُرسکون ہوا اور ہر یاد دل ہم لوگ شہر چور میں رہائش پذیر مرزا اظہر بیگ کے بھائی کی
شادی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے چنانچہ پہنچتے ہی شریک ہو گئے کیونکہ
کھانا لگ چکا تھا یہاں شاہ جی نے ہاتھ کیچن کر رکھا اور میں نے خوش خوراکی بنکے
بد خوراکی کا مظاہرہ کیا کیونکہ مقامی ناٹی نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار بنکے
بروئے دیگ لاکر کھانا تیار کیا تھا مرزا صاحب فلاسفی کے استاد ہونے کے ناطے
حب معمول بوکھلائے بوکھلائے پھرتے تھے اور ان کی خوش شکل اور خوش لباس
بیگم اٹھلائی اٹھلائی پھرتی تھیں کہ دیور کی شادی تھی مرزا صاحب کے والد جناب
مرزا اظہر بیگ صاحب سے بھی ایک مختصر سی ملاقات ہوئی طعام کے بعد فیصلہ
ہوا کہ شہر چور کے باغوں کی سیر کی جائے چنانچہ ہم قصبے سے باہر آئے اور نہر کی جانب
چلے گئے جہاں سر کندوں سے بھری ایک ”بھیل“ تھی اور کھیت تھے اور مردوں
کے باغ تھے۔

”بابائے..... شلغم“ بیگم شاہ جو کھیتوں میں گھس کر مختلف پتوں کو اکھاڑے
چلی جا رہی تھیں یکدم ان پتوں کے آخر میں لگے ہوئے شلغم کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔
”اور مولیاں بھی“ ہماری بیگم کے ہاتھ میں دو عدد مولیاں تھیں۔
میں نے ایک شلغم اکھاڑا اور اس کی منی کو صاف کر کے کھانے لگا تو بیگم دہلیں
”نہ نہ یہ نہ کھائیں گندہ بھی ہے اور کھانے کے بعد نقصان دہ ہے۔“
”کیوں شاہ جی؟“ میں نے اصغر سے پوچھا۔

”کھاؤ کھاؤ..... تازہ ہے کچھ نہیں ہوتا“ وہ بذات خود مولیاں کھا رہا تھا۔
”ہم“ ”بھیل“ کنارے ایک ٹیلے پر بیٹھ کر دھوپ سینکنے لگے اور شلغم کھانے لگے
مختواری دیور بعد شاہ جی چونک کر بولے۔

”اوسے شہر سے آئی ہیں تو کیا ہو..... جو بھی شہر سے آتا ہے ہمارے اردو توڑتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ جی ہم شہر سے آئے ہیں تمہاری کسی دکان سے ہم چیز چرا کر رہے کہتے ہیں! کوئی بات نہیں ہم گاؤں سے آئے ہیں۔“
”بابا کیوں کھپ ڈال رہا ہے؟“ بیگم شاہ تنک کر بولیں ”پیسے لے لو۔“

ہیجڑے اور شہزادے

خلیفہ خلفناری سے ملاقات ہوئی میں نے پوچھا خلیفہ آج کا اخبار پڑھا ہے؟
کھٹے لگے پڑھا لکھا ہوں اخبار پڑھتا ہوں آج کا اخبار بھی ہے لیکن یہ تم ساکت پنکھے کی جانب رخ کر کے ”ناں ناناں“ کے انداز میں سر کیوں ہلاتے ہو؟
میں نے عرض کیا کہ بجلی بند ہے اس لئے پنکھا بند ہے اس لئے..... پنکھا بند ہونے سے شاید تمہارا داغ پہلے پگھلا ہے پھر چل گیا ہے اس لئے اپنا سر ہلاتے چلے جا رہے ہو.....“

”نہیں نہیں میں نے سر ہلانا موقوف کیا اور کہا ”سناسہ کہ یہ بھی ایک انداز ہوا کرتا ہے پنکھی ہاتھ میں پکڑ کر چہرے کے سامنے لاکے پنکھی کی بجائے اپنا چہرہ دائیں بائیں بلانا شروع کر دو تو بھی ہوا آتی ہے بس وہی تجربہ کر رہا تھا.....“
”بھائی میرے“ خلیفہ نے کف افسوس ملنے کے بعد وہی کف میرے کندھے پر رکھی اور کہنے لگے ”وہ تو ہاتھ کے پنکھے کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ تم ساکت پیڈ سٹل فین کے آگے بیٹھ کر جو سر ہلاتے چلے جاتے ہو تو اس طرح ہوا نہیں لگے گی۔“

”تجبی.....“ میں نے صرف ایک مرتبہ سر ہلایا ”تجبی ہوا نہیں آرہی تھی اور میں پچھلے دو گھنٹے سے خواہ مخواہ سر ہلاتے چلا جا رہا تھا..... میں ابھی بازار سے ہاتھ کا پنکھا لاتا ہوں۔“

”اوسے جا جا بڑی دولت مند.....“
میں نے بھی حسبِ مقدور معافیاں مانگیں لیکن اس کا غصہ کم نہ ہوا تب شاہ جی نے اس کا کندھا پکڑ کر کہا ”سوراصل بھائی جی ہیں تو تمہاری بیویاں لیکن بھائے بس میں نہیں ہیں معاف کر دو۔“
”بس میں نہیں ہیں؟ وہ یکدم مسکراتے لگا“ اس کا مطلب ہے سبھی کی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں آئندہ ادھر آئے تو.....“
وہ جانے لگا تو بیگم شاہ نے اسے پکار کر کہا ”بھائی اردوؤں کے لئے تنک ہو“
کار کی ڈگی میں سرسوں کا ساگ چند تلخ اور کچھ اردو تھے اور ہم شہر پور سے واپس جا رہے تھے۔

شہر پور روڈ جب شیخوپورہ روڈ کے سنگم پر آئی تو اصغر یکدم پریشان سا ہوا اور شیخ گنگ پر ہاتھ مار کر بولا ”چودھری صاحب۔“
میں نے کہا ”جی شاہ صاحب۔“

کہنے لگا ”میرے کانوں میں گڑ بڑ ہو گئی ہے اتنا شور ہے کہ پردے پھٹ رہے ہیں“ اب میں نے بھی غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعی ہر سو ایک وحشت ناک شور تھا..... ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

”لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے تم کچھ کچھ میٹر ہو گئے“ خلیفہ نے ایک مرتبہ پھر کف افسوس ملنے کا مظاہرہ کیا ”ہاں تو آج کے اخبار میں کوئی خاص خبر تھی؟“

”ہاں خلیفہ..... وہ ایتنا بھ نہیں ہے؟“

”ہاں ہاں جانتا ہوں کچھ دنوں شاید اسی کی جانب سے ایک بیان آیا تھا کہ ہم ہندوستانی یہ بھڑے حکومت پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ پاکستانی ہجڑوں کو روزگار کے بہتر مواقع دے اور میڈیکل وغیرہ کا مفت بندوبست کرے“

”نہیں خلیفہ..... لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے میرا نہیں تمہارا دماغ چل گیا ہے بھئی یہ صاحب تو بڑے سپر سٹار ہیں اور رام کے فضل سے بہت خوش شکل ہیں اور الیکشن میں بطور مرد بھی کھڑے ہوئے تھے؟“

”تو پھر میرے ذہن میں ایتنا بھ کے نام کے ساتھ یہ بھڑے کیوں ناپسنے لگتے ہیں؟“

”اوہو..... وہ بھئی کسی فلم میں اس نے ایک ہی بھڑے کا سوانگ بھڑا تھا.....“

بہر حال تم نے اصلی خبر کا تو ستیا ناس کر دیا..... خبر یہ تھی کہ ایتنا بھ ان دنوں کشمیر میں ہے اور سری نگر کی بنی ہوئی چاکلیٹ پیسٹری چونکہ اسے پسند نہیں اس لئے خصوصی طور پر صرف اس کے لئے دہلی سے چاکلیٹ پیسٹری منگوائی جاتی ہے.....“

”بچہ جو ہوا اسی لئے چاکلیٹ کھاتا ہے“

”نہیں خلیفہ خلفشاری وہ بچہ تو نہیں ہے.....“

”سیاست میں تو بچہ ہے ناں اس لئے چاکلیٹ پیسٹری کھاتا ہے“

”یار خلیفہ ایک تو گرمی سے برا حال ہے اور دوسرے تم میری بات مکمل نہیں ہونے دیتے کہنا میں یہ چاہتا ہوں کیا ہندوستان ابے ملک کے ایک شہری کے لئے چاکلیٹ پیسٹریاں بذریعہ ہوائی جہاز منگوانا زیادتی نہیں ہے؟“

”بالکل نہیں“ خلیفہ فوراً بولے ”عادت کے آگے بند باندھنا بڑا مشکل ہوتا ہے اسے چاکلیٹ پیسٹری کے بغیر مایوس لیا ہو جاتا ہو گا یا پھر ہر وقت چاکلیٹ کے لئے اس کی رال ٹپکتی رہتی ہوگی..... میرے ایک دوست انگلستان میں ایک پاکستانی جوٹن میں گئے جی بھر کر مرغ پلاؤ وغیرہ نوش کیا پھر کھیریں کھائیں.....“

میں پر ایک اسٹیم ”لاپانو“ نام کی تھی جس کی قیمت دو پونڈ درج تھی..... انہوں نے یہ سمجھ کر کہ لاپانو“ کوئی اطلاوی سوئیٹ ڈش ہے ویٹر سے فرمائش کر دی اور وہ سیدھا سادا لاپچی پیاری والا پان لے آیا..... یہ پان والا تذکرہ جانے کہاں سے بیچ میں آ گیا بہر حال ایتنا بھ کو عادت ہوگی چاکلیٹ پیسٹریاں کھانے کی ان کے بغیر اسے ایک ایک کے دودھ دکھائی دیتے ہوں گے“

”کمال ہے خلیفہ خلفشاری“ میں نے جھلا کر کہا ”تم بات کو سمجھتے نہیں ہو بھئی ایک غریب ملک کے باشندے کے لئے.....“

”اچھا سنو“ خلیفہ یکدم سنجیدہ ہو گیا ”ہمارا ملک بھی تو اتنا امیر نہیں ہے لیکن یہاں ایک شخصیت ایسی ہے جس کے ذاتی استعمال کی تمام اشیاء بذریعہ ہوائی جہاز یورپ اور امریکہ وغیرہ سے آتی ہیں اور ان کے لئے روپوں میں نہیں سونے کی صورت میں ادائیگی کی جاتی ہے.....“

”نہیں یار.....“ میں نے حیران ہو کر خلیفہ کا بازو پکڑ لیا ”تم مذاق کر رہے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ..... بھئی اپنے ہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے خوراک بہت ہے لباس کافی ہے اور کیا چاہیئے؟..... اس شخصیت کا نام کیا ہے؟“

”پتنے میں تمہیں ان چند اشیاء کے بارے میں بتانا ہوں جو اس شخصیت کے ذاتی استعمال کے لئے باہر سے منگوائی جاتی ہیں اور کچھ حالتوں میں سمگل کی جاتی ہیں.....“

”مثلاً؟“

”مثلاً امریکی سے مشروبات ڈنمارک سے آئیں کریم، جاپان سے دودھ، مہمئی لٹکا سے چائے، ہندوستان سے پان، فرانس سے خوشبویات، انگلستان سے میک اپ کا سامان، سنگاپور سے مچھلیاں، جاپان ہی سے کاریں اور موٹر سائیکل، اطالیہ سے شیونگ کریم اور آئینہ شو لوشن، تھائی لینڈ اور تائیوان سے جوتے اور کپڑے.....“
”خدا کے لئے خلیفہ خلفشاری مجھے اس شخص کا نام بتا دو جو ملک و قوم کا اتنا ضیاع کر رہی ہے؟“

”وہ شخصیت تم ہو“ خلیفہ اطمینان سے بولا۔
”میں؟“ میں اچھل پڑا ”وہ کیسے؟“

میں اس کی وضاحت نہیں کروں گا تم خود ہی ماثار اللہ بہت بڑی اور موٹی عقل والے ہو ذرا اس بار سے میں سوچو..... خلیفہ یہ کہہ کر اٹھا اور چلا گیا اور میں سوچتا رہا..... اور پھر آہستہ آہستہ اس کی بات میری سمجھ میں آنے لگی۔ یہ جو خشک دودھ ہم استعمال کرتے ہیں جاپان سے آتا ہے آئیں کریم ڈنمارک والے بنا رہے ہیں مشروبات امریکی فارمولا کی ہیں میرے شیو کا تمام تر سامان غیر ملکی ہے..... ان میں سے کچھ چیزیں درآمد ہوتی ہیں اور کچھ سمگل ہوتی ہیں اور لاہور کی ہر دکان پر ملتی ہیں..... ہاں میں ایک عام پاکستانی نہیں ہوں بلکہ ایک کروڑ پتی شہزادہ ہوں جس کے ذاتی استعمال کی بیشتر اشیاء بذریعہ ہوائی جہاز یا سمندری جہاز غیر ممالک سے منگوائی جاتی ہیں..... سونے کے بدلے ہیں.....

بولنے والا گھوڑا

گرمی زوروں پر تھی۔

میکو ڈورڈ کے باغیچے میں سرخ پینٹ کیے ہوئے مکانوں میں چینی کا شربت تھا۔ برف کوئی بار ہی تھی اور لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ کب تخم ملنگان سے ہریز گلاس نصیب ہو اور اسے حلق میں انڈیل کر پیاس بجھانی جائے میری پیاس نے بھی مجھے روک لیا۔ میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہو کر سوکھے ہوئے لبوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ہر دو چار منٹ بعد دس بارہ گلاس تیار ہوتے جو چھلکتے ہوئے منتظر ہاتھوں میں چلے جاتے..... میں اپنے گلاس کا انتظار کرنے لگا کچھلے تین گھنٹوں سے شہر لاہور کی قیمتی ہوئی سڑکوں پر مٹ گشت کرنے کے بعد میرا بھیجہ بھی اسی درجہ حرارت پر تھا جو پچھلے ہوئے تار کول کا تھا.....

”آج تو بڑی جبر جنگ گرمی ہے؟.....“ میرے پیچھے کھڑے کسی صاحب نے کہا۔ ”ہاں گرمی تو ہے“ میں نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا..... البتہ ایک گھوڑا مزے سے منہ چلا رہا تھا اس کا مالک تانگے کی پچھلی نشست پر نیم دراز ادبگھڑا تھا میں نے پھر اپنی توجہ کوئی جانے والی برف کی ٹھنڈی ٹھنڈی ٹکڑیوں اور شربت میں پھولتی ہوئی تخم ملنگان کی جانب مبذول کر دی..... یہ کالے کالے بیج شائد ملنگ حضرات اپنی سردائی میں استعمال کرتے ہوں گے اس لئے انہیں تخم ملنگان کہا جاتا ہے۔ میں نے سوچا۔

”یوں بت بنے سارا دن کھڑے رہو گے تو باری نہیں آئے گی۔ ذرا بھاجی

اک گلاس آید سردی کا نعرہ لگاؤ.... میں نے پھر پیچھے دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا صرف وہ گھوڑا تھا..... تب وہ گھوڑا مسکرایا یا شاید ہنسا اور کہنے لگا "اب تم پوچھو گے کہ کس کو کہہ رہے ہو تو میں تم کو کہہ رہا ہوں اور کیا حال چال ہے؟" "ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھا تمام لوگ یا تو اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے اور یا شربت پی رہے تھے.....

"یار تم بولتے ہو؟ میں نے پوچھا۔"

"کیوں میں نہیں بول سکتا۔ کیا میں بے زبان ہوں؟.... اور اس نے اپنی لمبی بانہنی جوئی زبان باہر نکال کر اپنی "زبان" دانی کا شونہ پیش کیا۔"

"کمال ہے گھوڑے بھی ہو اور بولتے بھی ہو....." میں نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم انسانوں پر بڑا ترس آتا ہے..... وہ سر ہلا کر گویا جوا مجھے دیکھو عیش کرتا ہوں سردی ہو یا گرمی میرا مالک میرا خیال رکھتا ہے ایک دو پھیرے لگانے کے بعد کسی سبیل سے مجھے پانی پلاتا ہے۔ دن میں تین مرتبہ کسی سایہ دار سپاٹ میں کھڑا کر کے چارہ آگے رکھتا ہے میرے سم باقاعدگی سے چیک کرتا رہتا ہے اور شام کو مالش کرتا ہے..... ذرا سست پڑوں تو ڈنگر ڈاکٹر کے پاس بھاگ جاتا ہے اور دوائی لے کر آتا ہے..... عیش ہے ناں؟..... اور تمہارا خیال کون رکھتا ہے؟"

"میرا خیال کس نے رکھنا ہے..... ہم انسان ہیں اور انسانوں میں کوئی کسی کا خیال نہیں رکھتا۔ صبح ہوتی ہے تو گھر سے نکلتا ہوں اور تمام دن جانوروں کی طرح مارا مارا پھرتا ہوں....."

"جانوروں کی طرح نہیں انسانوں کی طرح....." گھوڑے نے فوراً ٹوکار۔

چلو انسانوں کی طرح سہی..... شہر کی سڑکوں پر گھومتا رہتا ہوں اور کسی

بلکہ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس تک نصیب نہیں ہوتا۔ ایل رڈی۔ اسے نے ایک دو جگہ ٹھنڈے پانی کے بورڈ لگا رکھے ہیں اور وہاں گرم پانی بھی نہیں ملتا صاحب ثروت حضرات جوش میں آکر کبھی کبھی کوئی شاندار سبیل بناتے ہیں اور اس پر اپنے نام کا بورڈ لگاتے ہیں اور دوسرے روز وہ خشک ہو جاتی ہے۔ بورڈ باقی رہتا ہے پانی غائب ہو جاتا ہے۔ پورے شہر لاہور میں کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں سے پیاسی مخلوق کو ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ مل سکیں۔ بچے دوپہر کے وقت سکولوں سے باہر آتے ہیں تو ان کی زبانیں تہاری طرح یعنی گھوڑوں کی طرح باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ کسی سماجی کارکن کو خیال نہیں آتا۔ کوئی فلاحی تنظیم دھیان نہیں کرتی کہ فیض کے اسباب میں چارہ بنانا بھی شامل ہے ثواب کمانے کا اس سے آسان طریقہ اور کون سا ہوگا کہ چند منگے پانی کے دو چار گلاس اور من دو من برف میرے پاس اگر گنناش ہوتی تو....."

گھوڑا ہنہنایا "تمہارے پاس گنناش ہوتی تو تم بھی ان کی طرح ہی ہوتے جن کے پاس گنناش ہے۔ بھلا! ایئر کنڈیشنڈ کاروں میں سفر کرنے والوں کو کیا پتہ کہ باہر سڑکوں پر رب کی مخلوق ہے جو پیاسی ہے۔... تم گفتگو جاری رکھو۔"

"تو جناب گھوڑا صاحب ہم انسانوں کا برا حال ہے.... تم تو ٹرانسپورٹ کے معاملے میں خود کفیل ہو لیکن ہمیں بسوں اور وگیزوں کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔ گوشت کا سرکاری نرخ چوبیس روپے مقرر ہے لیکن یکتا تیس بقیں روپے کے حساب سے ہے سرکاری انسر بھی اسی بھاؤ خریدتے ہیں اور جب تقریر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ جناب مارکیٹ میں جا کر دیکھیں گوشت چوبیس روپے عام بک رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھار پولیس اور مجسٹریٹ وغیرہ شغل کے لئے چھاپے مارتے ہیں اور قصائیوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ قصائی واپس آتے ہیں اور جرمانے اور نذرانے کی

تھر و اوے

کل ایک صاحب میرے ہاں تشریف لائے، پریشان حال سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے البتہ تازہ ترین ماڈل کی جاپانی کار میں سے برآمد ہوئے اور آتے ہی پوچھنے لگے "تم ہی ہو جس کا نام پھپھتی پھپھتی میں بولتا ہے؟" میں نے شرمندہ ہو کر کہا "ہاں" ففٹی ففٹی "والے جب کبھی تنگ دست ہو جاتے ہیں تو میرے نام سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اچھا؟ وہ بولتے تو تم مشہور ہو جانا؟"

میں نے کہا "بس چند لوگ جانتے ہیں۔"

"کچھ کھت پڑھت بھی تو کہتے ہو؟"

"ہاں کرتا ہوں۔"

"تو بابا لکھو۔"

"کیا لکھوں؟"

"کچھ لکھو مصالحوں وار۔ مجید وار۔ چٹا۔" میں نے عرض کیا کہ میں مصالحوں کیپنیوں کے لئے اشتہار نہیں لکھتا۔

کہنے لگے "نہیں بابا۔ ہم ادھر کراچی سے ایک میگزین نکال رہے ہیں تم اس میں لکھو۔ پیسہ دیا بھی دیں گا۔"

میں نے پوچھا "کس قسم کا میگزین؟"

کہنے لگے "بہت اچھا والا آرٹ پیپر۔ کمرڈر ٹرانسپیرینسز۔۔۔۔۔ ٹائٹل پر کرکٹ

رقم کا کہوں سے وصول کر لیتے ہیں۔"

"گوشت وغیرہ تھاری پرالم ہے۔ میں تو کھاتا ہی نہیں گھوڑے صاحب نے کہا۔"

"ہاں میں بھول گیا تھا کہ گھوڑا گوشت نہیں کھاتا۔۔۔۔۔"

"سنو" گھوڑے نے سرگوشی کی۔

"سنو" میں بھی اس کے قریب ہو گیا۔

"تم گھوڑے بن جاؤ" اس نے کہا۔

"اچھا؟ میں نے دلپسی لیتے ہوئے کہا "پر کیسے؟"

"کمال ہے انسان گدے بن جاتے ہیں آلو بن جاتے ہیں سانپ بن جاتے ہیں تم گھوڑے بن جاؤ، سکھی رہو گے۔"

"باڈی گلاس پکڑو" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دکان پر کام کرنے والا لڑکا تنم ملنگاں سے بھرا ہوا گلاس لئے کھڑا تھا۔

"نہیں" میں نے کہا "گھوڑے تنم ملنگاں والا شربت نہیں پیتے۔۔۔۔۔ چوک

نسبت روڈ پر گھوڑوں کے لئے ایک سبیل ہے وہاں جا کر مفت میں پانی پیوں گا۔"

میں چوک نسبت روڈ کی جانب ہنہاتا ہوا روانہ ہوا تو پیچھے سے کسی نے

کہا۔۔۔۔۔ لو جی باؤ آٹ گیا ہے گرمی نال۔۔۔۔۔ کہتا ہے میں گھوڑا ہوں۔

والے عمران خان کا بڑا تصویر

”میرا مطلب ہے کہ اس میگزین کا مزاج کیا ہوگا۔ ادبی، سیاسی، فلسفی، ٹیلی ویژنی.... کس قسم کا ہوگا؟“

”وہ گھڑی دیکھ کر بولے“ بابا ”تھر واوے“ ٹائپ کا ہوگا۔

”تھر واوے؟ یہ کونسی قسم ہے؟ میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

”بابا آج کا تھر واوے کچر کا جمانہ ہے.... دیکھو پہلے جمانے میں مال پکا پکا بنتا تھا۔ ایک مرتبہ خریدا اور ساری عمر استعمال کیا۔ پہلے جمانے کی کار دیکھو اور ادھر اس کو دیکھو.... انہوں نے اپنی نئی کار کی طرف اشارہ کر کے کہا اس کی بانٹ پر میرا چھوٹا ہے نہیں وہ بیٹھ گیا.... دیکھو ادھر سے ایک دم ڈنٹ پڑ گیا.... پہلے لائٹر ہوتا تھا نہیں؟ اس میں چٹاق ڈالو؟ گیس ڈالو اور ساری جندگی سگریٹ پیو.... اور اب باجارت سے لوچہ روپے کا استعمال کرو پھینک دو۔ تھر واوے.... گھڑی ہوتا تھا اور میگا اور ویسٹ اینڈ اور پتہ نہیں کیا کیا؟ چمڑہ بدلتے جاؤ اور مرنے کی ٹیم اپنے چھوٹے کودے اور اب ایسا نہیں ہے۔ پچاس روپے کی گھڑی لوجب اس کا سیل ختم ہو جائے تو پھینک دو۔ تھر واوے.... اس طرح آج کل اس میگزین کا جمانہ نہیں ہے کہ غور غور سے سارا فیملی پڑھو۔ سنبھال کر رکھو۔ اس کا ہائڈنگ کرا کے لائبریری میں رکھو.... اب تو میگزین اٹھاؤ کھڑڈ نوٹو دیکھو لیٹنے پڑھو سکینڈل دیکھو اور پھر پھینک دو.... ایسا ہوتا ہے تھر واوے میگزین تم ادبی سیاسی پوچھتا ہے۔“

میں نے عرض کیا کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟

بولے ”بس تم کچھ لکھو۔ ہم کو تارا نام چاہیے اور بڑا سارا فوٹو بس کچھ لکھ دو ہم چھاپ دیں گا۔ اور دیکھو مصالے دار ہو۔ کوئی ادب و ادب اور اخلاق مخلوق مت

ڈالنا۔ بالکل تھر واوے؟ نا چاہیہ.... ایسا کام نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ سنبھال کر رکھیں.... بابا اگر وہ میگزین سنبھال لیں گے تو دوسرا ایٹو کیسے خریدیں گے.... ہیں.... بس پڑھیں اور پھینک دیں ایسا۔“

میں نے کہا ”جناب یہ تو آپ بہت خطرناک باتیں کر رہے ہیں۔ ہم تو روائتی آدمی ہیں اس قسم کا تھر واوے کچر ہمارے لئے مفید نہیں ہے۔ آج آپ کا ریس۔ لائٹر گھڑیاں اور میگزین تھر واوے کر رہے ہیں۔ کل کلاں دوستیاں۔ محبتیں اور چاہتیں بھی تھر واوے کر دیں گے۔“

وہ مسکرائے ”بابا یہ چیزیں تو شروع سے ہی تھر واوے ہیں۔ دوستی کرو۔ کام نکالو اور.... تھر واوے.... اور یہ محبت وغیرہ تو بالکل یہی کام ہے بابا.... ان دنوں تو یہی ملے گا۔ یہ سیاست والا لوگ کیا کرتا ہے۔ وعدہ کرتا ہے ووٹ لیتا ہے اور پھر تھر واوے.... بابا ہم کو ماڈرن ہونا پڑے گا۔ ادھر یورپ میں یہی کلچر ہے۔ بچہ یا بچی جوان ہوتی ہے تو والدین اس کو تھر واوے کر دیتا ہے اور والدین بوڑھا ہو جاتا ہے تو ان کو اولڈ پیپلز ہوم میں تھر واوے کر دیا جاتا ہے یہی چلتا ہے بابا.... تم ادیب لوگ بالکل سٹوڈنٹ رہا ہے۔ ہمیشہ ادب کے پیچھے بھاگتا ہے بابا پیسے کے پیچھے بھاگو۔ تھر واوے کچر پر ایمان لے آؤ اور مرے کرو.... کہو ہمارے میگزین کے لئے لکھو گے؟“

”بالکل نہیں“ میں نے میز پر مکا مار کر کہا ”ہم ابدی اور انہی اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔ ہم اپنی محبتوں، دوستیوں اور تحریروں کو تھر واوے نہیں بنا سکتے۔“ ”نہیں بنا سکتے؟“ وہ صاحب ہنسنے لگے ”بابا اپنے آس پاس دیکھو غور سے۔ سب ایسا کر رہے ہیں اور تمہیں معلوم نہیں.... کہو لکھو گے؟“ آپ کتنے پیسے دیں گے؟“ میں نے یونہی پوچھ لیا۔ انہوں نے میرے کان

ٹریفک جیم

منزل کے لئے دو گام تو نہیں کئی گام چل کر میں یہاں تک پہنچا ہوں اور منزل بھی میرے سامنے آچکی تھی، بلکہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے آچکی تھی اور باقاعدہ دکھائی دے رہی تھی، اگر یہ لب بام تھی تو صرف دو چار ہاتھ کے فاصلے پر تھی، قسمت کی غولی یا خرابی کا کہ بھی نہیں تھا، کیونکہ کند بھی ٹوٹی نہیں تھی، بلکہ صحیح سالم میرے ہاتھ میں تھی.... اور پھر بھی پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ایک جگہ پر ساکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا، اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا، سارے راتے مسرور ہو چکے تھے.... میں ایک ٹریفک جیم میں گھرا کھڑا تھا....

گھر سے نسبت روڈ چوک تک کا فاصلہ میں نے پندرہ منٹ میں طے کیا اور جب وہاں سے گوالمنڈی چوک کی جانب دیکھا تو مشرک غائب تھی اور اس کی جگہ کاروں، موٹر سائیکلوں، ریڑھوں، وگینوں، سائیکلوں اور ریڑھیوں کا ایک جم غفیر ٹھانٹیں مار رہا تھا، بلکہ ٹھانٹیں بھی نہیں مار رہا تھا، بالکل ایک جگہ پر کھڑے سب سے کسمار ہا تھا، ٹریفک کو نئے مقام پر جمیم ہوئی تھی اس کا نتیجہ بھی مشکل تھا کیونکہ جہاں تک نظر جاتی تھی کاریں اور گھوڑے آپس میں رازدنیاز کر رہے تھے، لوگ ہارن بجا بجا کر اپنی بیڑیاں ڈاؤن کر چکے تھے اور اب بے بسی سے صرف کھڑے تھے اور انتظار کر رہے تھے میں اگر اس میلے میں گھس جاتا تو میرا گم ہو جانا بھی یقینی تھا اور مجھے بہر صورت چند ضروری فون کرنے کے لئے دکان پر پہنچنا تھا جہاں چند ایسے دوست میرے

میں چپکے سے ایک رقم بتا دی جو اتنی زیادہ تھی کہ میں اس کے لئے بہت کچھ تھرواؤں کر سکتا تھا چنانچہ ان سے لکھنے کا وعدہ کر کے انہیں رخصت کر دیا اسی شام جب میں لکھنے بیٹھا تو میرے تھرواؤں سے لائٹر کی گیس ختم ہو گئی اور میں نے اسے باہر پھینک دیا، تھوڑی دیر بعد میرا بیٹا باہر سے آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی لائٹر تھا، ابو آپ نے اس لائٹر کو کیوں پھینک دیا ہے؟ میں نے کہا بیٹے آج کل تھرواؤں کچھ کا زمانہ ہے، چنیر استعمال کی اور پھینک دی.... یورپ میں تو لوگ بوڑھے والدین کو بھی تھرواؤں کر دیتے ہیں.... لیکن ابھی ہم اتنے ماڈرن نہیں ہوئے۔

”تو ابو وہ حیران ہو کر بولا اگر ہم اتنے ماڈرن ہو گئے تو دادا جان کو بھی تھرواؤں کر دیں گے.... اور ابو جب آپ بوڑھے ہو جائیں گے تو میں کیا کروں گا؟“

تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور اب ملازمتوں کی تلاش میں ہیں بے شمار ایسے افراد ہیں جو چھوٹی موٹی نوکریوں کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں یہ لاکھوں افراد اپنے آپ کو کس طرح طویل القامت کر کے ان کی نظروں میں آئیں؟..... یہ تو میری غرض عام سے نارمل پاکستانی ہیں..... کیا حوام اور کاروباری اداروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایسا عمل ہونا ضروری ہے؟ پلیز فرقان بھائی تم مجھے کچھ نیا کر طویل القامت کرو.....

☆..... میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں.....



کوفتوں والی بھابھی

خاتون ایک پرانی وضع کے پرنٹ کی شلوار قمیض میں ملبوس تھیں اور سر پر دوپٹہ تھا وہ خاصی معمر لگ رہی تھیں اور ان کی مسکراہٹ سے شک ہوتا تھا کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا ہوا ہے ان کے ہمراہ تین بچے تھے یہ بچے بلوغت کی حد کو چھو رہے تھے دو لڑکیاں جن کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ چرت پتلونوں اور کھلے گریبان کی قمیضوں میں کولہوں پر ہاتھ رکھے بزاری سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لڑکا جو پچھلے رنگ کی نیلی جین اور بنیان پہنے ہوئے تھے بار بار کچھ سوگھتا اور پھر کندھے جھٹک کر برا سامنے بناتا خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے شاید پہچانا نہیں؟....."

"جی..... مجھے یاد نہیں آ رہا"

"میں بیگم باقی ہوں..... اور یہ میرے بچے ہیں"

بیگم باقی؟ میں نے فوہن پر زور ڈالا..... میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا..... انگلستان کے قیام کے دوران مختلف رہائشی تجربے ہوتے ہیں کچھ لوگ ایک کمرہ کرایہ پرے کر خوراک کا بندوبست خود کرتے ہیں اور بیشتر پرے ایک گیسٹ کے طور پر کسی خاندان یا درمیانی عمر کے جوڑے کے ہمراہ رہائش اختیار کر لیتے ہیں طے شدہ رقم میں کمرے کا کرایہ صبح کا ناشتہ رات کا کھانا اور ہفتہ انوار کو بیچ شامل ہوتا ہے..... برطانوی روایت میں "لینڈ لیڈی" کا ایک اہم کردار ہے اور



.....: بھائی فرقان :.....

☆ "ہاں بھائی یرقان"

۲۵ "ذرا غور سے میری طرف دیکھو"

☆..... "دیکھ تو رہا ہوں....."

☆.....: کمال ہے میرے چہرے کو دیکھ کر تمہیں ہنسی نہیں آرہی..... تمہیں

اب تک ہنس ہنس کر بے حال ہو جانا چاہیے تھا.....

..... "واللہ یرقان بجائی تم بالکل درست کہہ رہے ہو..... یہ تم نے کیا

سورت بننا رکھی ہے؟..... سر کے بال غائب ہیں اور اب وہاں چمکتی ہوئی

پندیا ہے، ماتھے اور گالوں پر سفیدی مقبوض رکھی ہے اور گلے میں جوتیوں کا ہار

ہے، تم چاہتے کیا ہو؟.....

..... میں مجھ پر ہنسا چاہتا ہوں..... میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری

طرف دیکھیں، میں جہاں بھی جاؤں لوگ میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں، میرے ساتھ تصویریں

اور بائیں اور ہاتھ ملائیں.....؟

۲۶..... اور اس کے بعد پاگل خانے جمع کروائیں؟.....؟

☆.....: نہیں فرقان میں پاگل خانے نہیں جانا چاہتا۔

☆..... "تو پھر اپنا حلیہ ٹھیک کرو....."

☆.....؟ وہ تو میں کروں گا لیکن ایک بات بتاؤ..... کیا میری آنکھیں بھی
دو ہی رہیں گی تین نہیں ہو سکتیں؟.....؟
☆.....؟ ایک ہو سکتی ہے، تین نہیں ہو سکتیں.....؟
☆.....؟ اور میرے کان دو کی بجائے چار پانچ نہیں ہو سکتے۔
☆.....؟ یرقان یرقان یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم چاہتے کیا ہو؟.....؟
☆.....؟ میں نے بتایا ناں کہ میں ایک عجوبہ بننا چاہتا ہوں.....؟
☆.....؟ لیکن کیوں.....؟

”تم پہلے مجھے عجوبہ بننے کا نسخہ بتاؤ پھر بتاؤں گا..... دیکھو ناں میں ایک
غریب اور ان پڑھ ماں باپ کا بیٹا تھا، میں نے محنت کر کے مشقت کر کے ماں
باپ کی خدمت کی اور اس کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کی اور میٹرک کے امتحان
میں وظیفہ حاصل کر لیا.....؟“

☆.....؟ واہ واہ یرقان تم تو عجوبہ ہو میرے بھائی..... اپنی ہمت سے کسی
کی مدد کے بغیر تم نے میٹرک میں وظیفہ حاصل کر لیا تو یہ ایک عجوبہ ہی تو ہے۔
☆.....؟ لیکن میری تصویریں اخباروں میں نہ چھپیں لوگ میرے گرد جمع نہ ہوں
اور انہوں نے مسکرا مسکرا کر میرے ساتھ ہاتھ نہ ملائے..... میں اسی طرح
محنت مزدوری کرتا رہا اور پھر فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کر لیا.....؟“

☆.....؟ واہ واہ یرقان تم تو پاکستانی نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ہو قیامت
ذاتی مشکلات پر قابو پانے اپنے زور بازو سے گریجوایشن کر لینا اور وہ بھی فرسٹ
ڈویژن میں یہ تو واقعی عجوبہ ہے.....؟

☆.....؟ لیکن پھر بھی مجھے کسی نے نہ پہچانا، پیٹھ پر تپکی نہ دی، شاباش
نہ ملی.....؟ تم میرا ایک کام کرو یرقان“

☆.....؟ یرقان بھائی تم حکم کرو.....؟
☆.....؟ تم کسی نہ کسی طرح کسی مشین میں کس کرو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر
کسی بھی طریقے سے مجھے لمبا کرو۔
☆.....؟ تمہیں لمبا کروں؟ کپڑے کر.....؟ یا کیا اول فول بک رہے ہو.....؟
☆.....؟ اچھا بھلا قد ہے تمہارا مزید لمبے ہو کر کیا کرو گے؟
☆.....؟ یا پھر مجھے قد بڑھانے کی کوئی دوائی لا دو.....؟ کچھ کرو لیکن مجھے لمبا
کر دو۔

☆.....؟ لیکن تم لمبے ہو کر کرو گے کیا؟.....؟
”میں ایک عجوبہ بن جاؤں گا، سب لوگ میری طرف دیکھیں گے، میں جہاں
بھی جاؤں گا لوگ میرے گرد جمع ہو کر مجھے احمقوں کی طرح منہ کھول کر دیکھیں گے
اور میرے ساتھ تصویریں اتروائیں گے اور ہاتھ ملائیں گے..... میرے جوتے کا
سائز اخباروں کی شہ سرخی ہو گا، میری چار پائی کی تصویریں بنیں گی اور ڈاکٹروں کے
بیان دھڑا دھڑا آئیں گے کہ ابھی یرقان کا قد بڑھ رہا ہے اور آئندہ برسوں میں امید
ہے کہ بڑھ کر آسمان کو چھوے گا..... اور یہ پچھتم خود ہفت افلاک کا مشاہدہ کرے
گا..... بس یرقان بھائی تم مجھے لمبا کرنے کا بندوبست کرو۔“

☆.....؟ میرا خیال ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے، میں ڈاکٹر کو اطلاع کرتا ہوں۔
☆.....؟ لیکن طویل القامت ہونے کا سب سے بڑا فائدہ جانتے ہو کیا ہو
گا؟.....؟ مجھے بالآخر ملازمت مل جائے گی، اخباری ادارے اشتہاری کمپنیاں اور
ٹیلی ویژن والے مجھے نوکری کی پیشکش کریں گے..... یہ ادارے نہیں جانتے کہ
پاکستان میں لاکھوں ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے طویل القامت ہونے سے زیادہ
مشکل کارنامے سرانجام دیئے ہیں، وہ مالی مشکلات اور خاندانی مصیبتوں کے باوجود

متفرق تھے جو صرف مجھے ملنے کی خاطر اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے چنانچہ میں چوک چھوڑ کر ایک ایسی گلی میں داخل ہو گیا جو گھوم پھر کر گوالمنڈی چوک میں آسکتی تھی میں نے اپنے تئیں بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس قسم کی عقل دیگر موٹر سائیکل سواروں کے پاس بھی نفی جواب اپنے اپنے "ثبوت" یعنی موٹر سائیکل تھامنے گلی سے سڑک پر نکلنے والے راستے میں کھڑے تھے اور ان کے سامنے ٹریفک کی سیسہ پلائی دیوار کھڑی تھی۔ چنانچہ میں نے اسی میں عافیت جانی کہ واپس نسبت روڈ چوک میں جا کر قسمت آزمائی کی جائے۔ چوک میں پہنچ کر میں نے اٹھ کا نام لیا اور ٹریفک کے بحربے کراں میں اپنا موٹر سائیکل ڈال دیا۔ چندرہ منت کے اندر اندر میں گوالمنڈی چوک میں پہنچ چکا تھا۔ گلی سے چوک میں داخل ہونے کے خواہش مند حضرات ابھی تک وہیں جم کھڑے تھے چوک میں سے وہ دکان اور اس کا بورڈ دکھائی دے رہا تھا جہاں مجھے پہنچنا تھا۔

اور وہ دکان اور اس کا بورڈ اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک دکھائی دیتا رہا اور میں اس تک نہ پہنچ سکا یہاں پر صرف ٹریفک جیم ہی نہیں تھی بلکہ ریڑھوں کے "ہم" کاروں کے پھر سائیکلوں کے مائٹراپس میں مربوط ہو چکے تھے جوچی دروازے کے قریب اگر کوئی کار دو اپنچ پیچھے کھسکتی تو ساری ٹریفک میں ایک نابالغ قسم کا لرزلہ آجاتا۔ دند سکرینوں اور ہیڈ لائٹوں کے شیشے ٹوٹنے لگتے۔ ناقابل بیان الفاظ فضا میں تیرتے اور پھر سکون ہو جاتا اس جہوم میں میوہ ہسپتال سے نکلی ہوئی ایک ایمبولنس بھی کھڑی تھی جو سائرن بجا بجا کر اب خاموش ہو چکی تھی۔ شاید اس کے اندر لیٹا ہوا جاں بلب بھی خاموش ہو چکا ہو چنانچہ فوجیوں نے اپنے سائیکل جوا میں بند کر کے اس دلدل میں سے نکلنے کی کوشش کی مگر قدم کھان رکھ کر نکلے چنانچہ سائیکل

نیچی کیں تو اب وہ جگہ بھی پڑ ہو چکی تھی جہاں وہ پہلے رکھی ہوئی تھیں اس ساری صورت حال کو صرف گھوڑے "انجانے" کر رہے تھے وہ اپنی ٹھکی ہوئی ٹانگوں کو آرام دے رہے تھے اور تھو تھیاں چلا رہے تھے..... ایک گھوڑا اپنے آگے رکھے سر کو چاٹ رہا تھا جو ایک موٹر سائیکل والے کا تھا اور وہ غریب شور مچا رہا تھا کہ بھائی تانگے والے اپنے گھوڑے کو منع کرو اور تانگے والا آگے سے کہہ رہا تھا کہ باؤ جی آپ آگے سے ہٹ جاؤ باؤ نے تو منہ مارنا ہے۔ ٹریفک جیم اتنا گھنا اور مکمل تھا کہ ریوے روڈ سے نمودار ہوتا ہوا جھینسوں کا ایک ریوڑ اپنی اپنی وحشی رفتار کے باوجود اس کے اندر اپنے لئے کوئی مقام پیدا نہ کر سکا۔

اس دوران محراج پتھر جانے کہاں سے نازل ہو گیا وہ حسب معمول زندگی اور اپنے آپ سے بے حد خوش تھا مجھے یوں چسنا ہوا دیکھ کر کہنے لگا "بادشاہ ہو کھڑے ہونا ایک ہی جگہ پڑ وہ سامنے چند قدم پر تھماری ہتی ہے اور تم وہاں تک پہنچ نہیں سکتے" میں نے کہا "ما بھجے اس میں میرا کیا قصور ہے..... میں تو خواہ مخواہ چسٹ گیا ہوں" محراج پتھر نے صبح کی کھائی ہوئی تھماری کا ایک ٹکڑا دیا اور بولا "ہمارا سب کا قصور ہے بادشاہ ہو..... ہمارے ملک کے لوگ ہی ایسے ہیں..... رکشا والا لایا کارڈ ریوڑ یہ نہیں دیکھتا کہ آگے ٹریفک رکی ہوئی ہے تو کسی وجہ سے رکی ہوگی۔ انتظار نہیں کرتا۔ دوسروں کو بے وقوف سمجھتا ہے جو انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور اپنا ہاتھ چھوڑ کر سب کو اور ٹیک کر کے آگے چلا جاتا ہے اور جناب ادھر سے ادھر آنے والے کار اسٹنڈ روک لیتا ہے..... بس ٹریفک بند..... سائنڈ پر ریڑھیوں والے کھڑے ہیں اور بس کھڑے ہیں"۔

میں نے تنگ اگر کہا "یار پتھر اس ٹریفک جیم سے نکلنے کا کوئی طریقہ بھی

آپ کو اپنے قیام کے دوران طرح طرح کی لینڈ لیڈیوں سے سابقہ پڑتا ہے....
 لالچی، محبت کرنے والی، شرابی، طلاق شدہ، قریب المرگ، بہترین اخلاقیات اور
 خلوص کی مالک، آپ کی پیمبری ادھیڑ لینے والی..... غرض کہ انسانی فطرت کے
 مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک ملی جلی آبا دی میں لینڈ لیڈی خالص برطانوی
 کے علاوہ پولش، ہنگیرین، چینی بھارتی اور کبھی کبھار پاکستانی بھی ہو سکتی ہیں....
 بیگم باقی ایک پاکستانی لینڈ لیڈی تھیں۔ میں جب ان کے خاوند شیر باقی کے مکان
 میں رہائش پذیر ہوا تو وہ غیر شادی شدہ تھے.... پاکستان میں سائیکلیں کرایہ پر
 اٹھاتے تھے اور پنکچر وغیرہ لگاتے تھے انگلستان پہنچے اور فیکٹریوں میں لوہا کوٹ
 کوٹ کر ایک مکان خرید اور لباس کے پیسوں میں سے رقم جمع کر کے
 سینکڑہینڈ فرنیچر اور قالینوں سے مکان کو فرشت کیا۔ خود تہ خانے میں چلے گئے اور
 تین کمروں کو کرائے پر اٹھایا.... پاکستان میں ان کی منگنی ہو چکی تھی لیکن انگلستان
 میں صاحب جائیداد بن جانے کے بعد ان کا سینڈرڈ بھی بلند ہو گیا۔ اور انہوں
 نے اپنی منگیتر کی بجائے اس کی چھوٹی بہن سے شادی کا اظہار کیا.... اور یہ
 خواہش پوری ہوئی ٹیلی فون پر نکاح ہوا اور تمام کرایہ دار شیر باقی کو ہار پہنا کر
 لندن ایئر پورٹ پہنچے جہاں پاکستان سے آنے والے جہاز میں سے ایک نوخیز
 ڈری ڈری معمولی تعلیم یافتہ لڑکی برآمد ہوئی جو کہ ہماری بھابی تھیں۔ اور مستقبل
 کی لینڈ لیڈی.... وہ کچھ روز تو ہم سے بھی گھونگھٹ نکالتی رہیں اور پھر آہستہ
 آہستہ انہوں نے "شاہنگان" پر جانا شروع کر دیا۔ چھپے کو سپون کھنے لگیں اور کھڑکی
 بند کرنے کو "وٹڈوشٹ کروے" کہنا شروع کر دیا۔ ہمارا کرایہ بڑھا دیا گیا اور ایک
 معقول رقم کے اضافے سے ہمیں پاکستان کی خوراک بھی ملنے لگی....
 کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے خاوند کے ساتھ فیکٹری میں ملازمت شروع کر

دی اور ایک نئی کار اور دوسرے مکان کا خواب دیکھنے لگیں.... بیگم باقی ہمیں
 کسانا دینے کے معاملے میں بے حد کج فہم تھیں۔ اور جب بھی ہم شکایت کرتے
 تو مسکرا کر کہتیں "بھائی جان ان گوروں کو دیکھو سینڈوچ اور ڈبل روٹی کھاتے ہیں
 اور آپ جو کہ دو روٹیوں اور آٹھ سوڑے کھا کر بھی غوٹ نہیں ہو شکریہ کرو اللہ کا
 کہ میں آپ کی لیڈی ہو گئی ہوں گھر والا سالن بنا کر کھلاتی ہوں گوری لیڈی
 کے پاس ہوتے تو ابلے ہوئے آٹھ کھاتے.... اچھا کل گوشت پکاؤں گی تو آپ
 کو دو بوٹیاں دوں گی.... لیکن وہ ہمیں ہمیشہ "سٹارویشن ڈائمٹ" پر ہی رکھتیں۔
 پتا سچہ ایک اور پاکستانی نوجوان کو ساتھ ملا کر ہم نے بیگم باقی کی غیر موجودگی میں
 ان کی بانڈی میں سے بوٹیاں وغیرہ چوری کرنی شروع کر دیں.... بیگم باقی
 فیکٹری سے واپس آتیں کچن میں جاتی اور پھر بکدے میں اگر شور مچا دیتیں "ہائے ہائے
 صبح گن کر گئی تھی آٹھ بوٹیاں تھیں اب چھ ہیں۔ بھائی جان آپ کو کچھ پتہ ہے۔
 "بھابی مجھے کیا پتہ.... ملی کھا گئی ہوگی.... اس طرح کوفتے پکتے وقت
 تو وہ بھی غائب ہو جاتے.... ایک روز فیکٹری سے واپس آئیں اور مجھے کچن
 میں لے گئیں دیگچی میں سردی سے جما ہوا سالن تھا اور اس میں دو بڑے بڑے سولخ
 تھے جہاں کبھی کوفتے ہوا کرتے تھے.... غلطی مجھ سے ہوئی کہ جگہ ہوئے شو بے
 میں سے کوفتے نکال لئے اور یہ نہ سوچا کہ ان کی رہائش گاہ خالی پڑی ہوئی ہے
 پتہ چل جائے گا۔ بہر حال میں نے اپنی معصومیت ظاہر کی اور آئندہ سے یہ احتیاط
 کرنا شروع کر دی کہ کوفتے یا بوٹی وغیرہ نکال کر سالن کو پھر سے گرم کر کے ٹھنڈا
 کر لیا اور یوں یہ سلسلہ جاری رہا.... تین چار ماہ بعد میں کسی اور جگہ شفٹ
 ہو گیا.... اس دوران معلوم ہوا کہ بیگم باقی کے ہاں یکے بعد دیگرے تین بچے
 پیدا ہوئے ہیں.... اور اب اتنے برسوں بعد بیگم باقی میرے سامنے بیٹھیں تھیں۔

شوشہ ایک سفید چوہا

لفظ "شوشہ" کا صوتی تاثر بے حد دلچسپ ہے اور پھر جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے یہ شوشہ چھوڑا تو ذہن میں کچھ اس قسم کی تصویر ابھرتی ہے کہ "شوشہ" دراصل کوئی سفید چوہا قسم کی چیز ہے جسے کوئی صاحب جیب میں چھپا کر لاتے ہیں اور کسی بھری محفل میں چھوڑ دیتے ہیں وہاں خوب کھلبلی مچتی ہے اور بالآخر معلوم ہوتا ہے کہ جو شوشہ بڑی تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی اور جس نے کاروبار حیات کو اتھل پھل کر کے رکھ دیا ہے دراصل شوشہ تھا۔ لوگوں میں کھلبلی مچانے کے بعد وہ صاحب اپنے شوشے کو پکڑتے ہیں۔ جیب میں ڈالتے ہیں اور اسے کسی اور محفل میں "چھوڑنے" کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

مختلف قسم کے شوشے حکومتوں اداروں اور اہم شخصیات نے پال رکھے ہوتے ہیں جو وہ بوقت ضرورت چھوڑتے رہتے ہیں قدرے سنجلی سطح پر آجائے تو آپ اور مجھ ایسے ناچیزوں کے پاس بھی اپنے اپنے چھوٹے موٹے ناتواں قسم کے شوشے ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان شوشوں کو چھوڑنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ شوشہ پالنے اور اسے چھوڑنے کے لئے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اگر آپ کوئی حکومت ہوں تو سپر پاور ہوں اور اگر ادارہ ہوں تو بہت پاورفل ہوں (جیسے ایل ڈی اے واپڈا۔ ٹیلی فون وغیرہ) اور اگر شخصیت ہوں تو بااثر ہوں (مثلاً سرکاری افسر سیاست دان وغیرہ) اور اگر آپ یہ سب کچھ نہیں ہیں اور آپ اپنا غریب غریبا شوشا چھوڑنا چاہیں تو اول تو وہ اتنا ناتواں ہوگا کہ چھوٹنے سے انکار کر

"اوہو آپ تو ہماری بھابی ہیں کو فتوں والی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
 "آہو بھائی جان..... پر سچ سچ بتا دیں اب وہ کوفتے آپ ہی چراتے تھے؟"
 "میرے خیال میں اب اعتراف کرنے میں کیا ہرج ہے جرم کافی پرانا ہو چکا..... باقی صاحب کا کیا حال ہے؟"

"انہیں فوت ہوئے تو تین سال ہو گئے بھائی جان..... بس کام کرتے کرتے فیکٹری ہی میں گر پڑے..... بڑا مشکل وقت تھا پر اب ماشاء اللہ ہمارے چار مکان ہیں سب کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں اور بھی بڑا کچھ بنا گئے ہیں باقی صاحب.....؟"

"آئی تو رہنے کے لئے تھی..... بھائی جان لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں وہاں گودوں کے ساتھ پھرتی ہیں ڈانس کرتی ہیں لڑکا بھی کئی کئی دن غائب رہتا ہے..... بھائی میں تو پاکستان آئی تھی کہ یہاں رہ جاؤں پر یہ بچے..... وہ آبدیدہ ہو گئیں..... اور بچے لائق کھڑے رہے..... میں دھرم پورے میں ہوں اپنے بھائی کے پاس ان کو نہ ملے پسند ہے نہ وہ لوگ ان سے بات نہیں کرتے..... کتنے ہیں تم بے شک یہاں رہ جاؤ پر ہم جا رہے ہیں ہمارے پاس نیشنلسٹی ہے..... بھائی جان میرا جی بڑا اداس رہتا ہے لاہور سے..... اپنے بھائیوں سے پر میں مجبور ہوں..... مجھے پتر ہے کہ یہ تینوں مجھے چھوڑ جائیں گے۔ اور میں اکیلی رہ جاؤں گی..... میں کیا کروں آپ ہی کچھ بتاؤ..... وہ بچے مجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے میں ان کے راستے کی کوئی رکاوٹ ہوں..... تھوڑی دیر بعد ہیگم باقی کتنے لگیں لو پھر بھائی جان دعا کرنا اپنی بھابی کے لئے کہ اسے وطن کی مٹی نصیب ہو اور چلی گئیں۔



وسے گا اور اگر آپ اسے دھکا ستارت کر کے چھوڑ دیں تو لوگ اسے نہیں چھوڑیں گے اور آپ کو دروغ گوئی اور جعل سازی کے الزام میں دھر لیا جائے گا اور آپ کے شوشے کو جو تیاں مار مار کر بھگا دیا جائے گا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد آپ آئندہ کے لئے تائب ہو جائیں گے اور اپنے شوشے کو بھی ہدایت کریں گے کہ وہ کوئی اور بارش مالک تلاش کرے۔

حکومتوں کی سطح پر ہر دوسرے روز کسی ایک سپر پاور کی طرف سے بیان جاری کیا جاتا ہے کہ دنیا میں امن ہونا چاہیے جنگ نہایت خوفناک چیز ہے تخفیف اسلحہ نہایت ضروری ہے اور یہ کہ ہمارے ملک نے ہمیشہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کی ہے یہ بیان ایک شوشہ ہوتا ہے جو چھوٹے موٹے ملکوں کو اطمینان دلانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس دوران یہ سپر پاور انہی چھوٹے موٹے ملکوں میں سے کسی ایک میں امن قائم کرنے کی خاطر اپنی فوجیں بھیج دیتی ہے اس پر دوسری سپر پاور بے حد اپ سیٹ ہوتی ہے اور فوراً اپنی سرحد کے آس پاس کوئی ایسا ملک تلاش کرتی ہے جہاں "امن" قائم کیا جائے ایسا ملک دستیاب نہ ہو تو اسے ایسا بنا دیا جاتا ہے اور پھر فوج کشی کر کے وہاں امن قائم کر دیا جاتا ہے اس عمل کو عرف عام میں بیلنس آف پاور کہا جاتا ہے۔

اسی طور بین الاقوامی اور ملکی اداروں کے پاس بھی اپنے اپنے پائپر شوشے ہوتے ہیں جو وہ ہمہ وقت چھوڑتے رہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے پاس "حق رائے و بندگی" کا شوشہ ہے جو وہ کشمیریوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھار چھوڑ دیتی ہے۔ ویٹو کا حق صرف سپر پاورز کو دیا گیا ہے تاکہ وہ بیلنس آف پاور قائم رکھنے کی خاطر اسے ایک دوسرے کے کیمپ میں وقتاً فوقتاً چھوڑتی رہیں ہمارے اپنے ایل ڈی اے کے

اس مال بروڈ اور نہر کے کناروں کو بیوی فانی کرنے کا شوشہ ہے جو وہ بقیہ شہر کی گندگی اور ٹوٹی ہوئی سڑکوں پر چھوڑتی رہتی ہے واپڈا ایک طرف تو ملک میں بجلی کے اضافے کی نوید سناتا ہے یا سنا تی ہے اور دوسری جانب موسم سرما کے شروع ہوتے ہی پانی کی کمی کے باعث بجلی کی کمی کا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے کچھ ایسے شوشے بھی ہیں جو آدم خور ہیں یعنی لاہور شہر اور اس کے نواح میں دوڑنے والی دیگنیں جو پٹرول کی بجائے انسانی خون پر چلتی ہیں اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ انہیں کس نے چھوڑ رکھا ہے اگر موٹر سائیکلیں اور کاروں کے ساتھ ساتھ ان کی بھی چیکنگ ہو تب پتہ چلے کہ انہیں کس نے چھوڑ رکھا ہے افواہ ہے کہ انہیں چیکنگ کرنے والوں نے ہی چھوڑ رکھا ہے اور افواہ پر کون یقین کرے کیونکہ یہ شوشے کی چھوٹی بہن ہوا کرتی ہے۔

شوشے چھوڑنے کے سلسلے میں ہمارا ہمسایہ ملک بھی بہت ایڈوانس ہے بلکہ چیمپین ہے اس کے پاس انواع و اقسام کے شوشے ہیں جو وہ موقع محل کی مناسبت سے چھوڑتا رہتا ہے ان میں سے بیشتر شوشوں کا رخ پاکستان کی جانب کر دیا جاتا ہے کہ جاؤ بچہ وہاں جا کر کھلبلی مچا دو اور دوسرے چھوڑے جانے والے سیاسی شوشوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے انہیں یہاں درج کرنا ممکن نہیں اس لئے ماضی میں چھوڑے گئے صرف ایک شوشے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ وہ صاحب تاج محل دراصل مغلوں نے نہیں بلکہ راجپوت ہندوؤں نے تعمیر کیا تھا اور یہ مقبرہ وغیرہ نہیں کسی اعلیٰ قسم کی دیوی کا مندر ہے یہ شوشہ اگرچہ بہت ہی لاغر اور ناتواں قسم کا تھا لیکن اس پر خوب خوب بحثیں ہوئیں اور معاملہ ابھی تک حل طلب ہے انہی دنوں لائف میگزین میں تاج محل کی ایک رنگین تصویر شائع ہوئی جس میں ایک سکھ خاندان بعد اپنی پگڑیوں کے عمارت کے حسن سے لائق مونگ پھلیاں وغیرہ کھا رہا ہے اور نیچے لکھا تھا یہ عمارت ان کے آبا و اجداد نے تعمیر کی تھی۔ یعنی شوشے کا اثر امریکہ تک

ایک حالیہ سروے کے مطابق

آج صبح سویرے اپنے بزرگ ادیب خلیفہ خلفشاری میرے ہاں تشریف لے آئے اور آتے ہی کہنے لگے ”بھائی میاں پنکھا چلتا ہے؟“

میں نے عرض کیا ”جی چلتا ہے“ اور انہیں پنکھے کے نیچے بٹھایا۔

”واہ واہ کیا خوب گھومتا ہے“ انہوں نے اس پر ایک محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا ”اپنے ہاں تو اس وقت لوڈ شیڈنگ ہے۔ گرمی کے ہاتھوں تٹائے ہوئے بچے بیگم کو تنگ کر رہے تھے اور بیگم ہمیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں اس لئے ہم ادھر دوڑ آئے اور آنا تو ویسے بھی تھا کیونکہ تم سے کچھ پوچھنا تھا؟“

”جی ارشاد میں نے بصد ادب عرض کیا۔“

”یہ سروے وغیرہ کون لوگ کرتے ہیں؟“

”کوئی سروے؟“

”وہی والا جس کے بارے میں اخباروں میں چھپتا ہے کہ ایک سروے کے مطابق

..... یا ایک حالیہ سروے میں..... تو یہ سروے کون لوگ کرتے ہیں؟“

”پتہ نہیں خلیفہ.....“ بھلے لوگ ہی ہوں گے جو کرتے ہیں۔“

”میں تو ٹیلیٹواڈا دوں ان سب کا.....؟“ خلیفہ غصے سے بولے ”میری تو

زندگی اجیرن کر رکھی ہے ان سروے والوں نے.....“

”کیوں؟ میں نے بے حد حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔“

”بھئی یہ لوگ ہر شے میں ٹانگ اڑاتے چلے جاتے ہیں دنیا میں کوئی ایسا موضوع

پہنچ گیا تھا میں نے ایک محب الوطن ہندوستانی سے اس نئی دریافت کے بارے میں استفادہ کیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ ٹھیک سے تاج محل بنانے کا حکم تو شاہجہاں نے دیا تھا لیکن اس پر جو مزدور کام کرتے رہے وہ تو ہندو اور سکھ تھے اب یہ تو سبط الحسن ضیغم ہی بتا سکیں گے کہ شاہجہاں کے زمانے میں سکھوں کی تعداد کتنی تھی لیکن اگر اس شوٹے کو مان لیا جائے کہ عمارت بنوانے والے کے نام نہیں ہوتی بلکہ اسے تعمیر کرنے والے افراد کی ہوتی ہے تو اس سے بے شمار شوٹے جنم لے سکتے ہیں مثلاً یہ کہ اہرام مصر یہودیوں نے بنائے تھے مسجد قرطبہ کی تعمیر میں چونکہ عیسائی کاریگر بھی شامل تھے اس لئے وہ عیسائیوں نے تعمیر کی تھی۔ وینس کے ایک کلیسا کی تعمیر میں بھی ترکوں نے حصہ لیا تھا اس لئے وہ کلیسا دراصل ترکوں نے بنایا تھا۔ سکھوں کے مقدس دربار صاحب کا سنگ بنیاد چونکہ میاں میسر صاحب نے رکھا تھا اس لئے یہ بات نکلتی ہے تو بہت دور تک جاسکتی ہے۔

اسی شوٹے نے میری آلتوں کی نیندا ڈا دی ہے کیونکہ میں براہ راست اس کی زد میں آیا ہوں یعنی میں نے دھکے کھا کھا کر اور مقروض ہو کر ایک مکان بنوایا ہے وہ اس شوٹے کی رُوسے میرا نہیں بلکہ مشرعی غلام علی اور ہدایت کا ہے۔

بے حد حیران ہوا کہ یہ بن مانس کہاں سے آگئے بہر حال میں نے کہا کہ بیٹا جان دفع کرو موٹے بن مانسوں کو تم زیادہ اچھے ہو۔ اس پر وہ غرور ہو کر بولی، تو پھر آپ ہیں رنگین ٹیلی ویژن خرید کر دیں۔ اب میں تو گھر سے نکلا تھا بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن کی رقم جیب میں ڈال کر اور یہاں رنگین کی فرمائش ہو رہی تھی چنانچہ میں نے انہیں ڈانٹا کہ نہیں آپ فی الحال بلیک اینڈ وائٹ سے ہی گزارہ کریں..... اس پر چھوٹی بیٹی نے منہ بسور کر کہا،

اب اس کا مطلب ہے کہ ہم سے بن مانس اچھے ہوتے ہیں..... اب دیکھئے ناں ایک حالیہ سروس کے مطابق بن مانس بھی ٹیلی ویژن دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور رنگین پروگراموں کو ترجیح دیتے ہیں..... اب بن مانس جو ہیں وہ رنگین ٹیلی ویژن دیکھیں اور ہم بلیک اینڈ وائٹ تو ہم سے وہی اچھے ہوئے..... بہر حال قرض لیا اور رنگین لیا..... ان سروس دالوں نے تو میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ علامہ پنکھے کے نیچے بیٹھ کر قدرے بحال ہوئے، چائے کی ایک پیالی نوش فرمائی اور پھر رخصت ہونے سے پیشتر کھانسی کر بولے اور ہاں خوب یاد آیا میں نے دو سو روپے صرف دو روز کے لئے ادھار دیئے تھے اب دو ماہ ہونے کو آئے بھئی وہ تو واپس کر دو.....

”ہائے ہائے خلیفہ خلفشاری“ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”تمہیں شرم آتی چاہیئے؟“
”کیوں.....؟“ خلیفہ پچھلے ”تم نے مجھ سے ادھار نہیں لیا تھا؟“
”لیا تھا..... لیکن ایک حالیہ سروس کے مطابق اگر جمعرات کی صبح کو..... اور آج جمعرات کی صبح ہے..... کسی سے قرض واپس مانگا جائے تو وہ بے چارہ اول جلول ہو جاتا ہے..... کیا تم چاہتے ہو کہ میں اول جلول ہو جاؤں..... کم از کم میں تو نہیں چاہتا اس لئے خدا حافظ.....“

نہیں ہے جس کے بارے میں سروس نے کیا جاتا ہو عجیب و غریب سروس ہے..... مثلاً اخبار اٹھا کر دیکھ لو اس میں اس قسم کی رپورٹیں ہوں گی کہ ایک حالیہ سروس کے مطابق خبر روزے کھانے سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ دوسرے صفحے پر درج ہو گا کہ ایک سروس کے مطابق خبر روزے کھانے سے بینائی تیز ہو جاتی ہے.....
”لیکن علامہ اسے تو تحقیقی رپورٹ کہا جائے گا، سروس تو.....؟“

”بھئی ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ تحقیقی رپورٹ نہیں ہوتی اس کا ہلکا پھلکا سروس ہوتا ہے..... غسل خانے میں جاتا ہوا ڈرتا ہوں کہ جانے دنیا کے کس حصے میں یہ سروس ہوا ہو گا کہ غسل خانے میں جانے والے کتنے فیصد لوگ دانستوں پر برش پھیرتے پھرتے فوت ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں بھی اس فیصد کا ایک حصہ بن جاؤں..... کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے سوچ لیتا ہوں کہ اس کے بارے میں کوئی سروس تو نہیں ہو چکا۔ بھئی سچ پوچھ تو میں سروس کو سچ سمجھتا ہوں ان پر یقین رکھتا ہوں.....“
”تو پھر شکایت کس بات کی خلیفہ؟“

”میرے بچوں نے حد کر دی..... پہلے تو روزانہ ایک روپیہ فی کس انہیں جیب خرچ کے طور پر دیا جاتا تھا پھر ایک روز بڑے صاحب زادے فرمانے لگے کہ ابو وہ تمہیں تو میں ایک سروس ہوا ہے جس کے مطابق بچوں کو صرف ایک روپیہ جیب خرچ دینے سے ان کی ذہنی نشوونما پر برا اثر پڑتا ہے۔ میں نے ان کا جیب خرچ بڑھا دیا..... مجھے بھنڈی توری بہت پسند ہے۔ ان دنوں گھر میں روزانہ کمپتی ہے۔ کل منجھلے صاحب زادے فرمانے لگے کہ ابو جنوب مشرقی اور شمال مغربی ٹوگو لینڈ میں ایک سروس ہوا ہے جس کے مطابق بھنڈی توریاں کھانے سے انسان اول جلول ہو جاتا ہے..... چنانچہ ہماری بھنڈی توری بند ہو گئی..... پچھلے ماہ نیا ٹیلی ویژن خریدنے گئے تو سب سے چھوٹی بیٹی کہنے لگی، ابو کیا ہم اچھے ہیں یا بن مانس؟ میں

پندر روزہ ہے جو کچھ کرنا ہے کر گزرو.....

انسانوں، کارخانوں، عمارتوں اور کاروں وغیرہ کی انشورنس تو سننے میں آتی رہتی ہے لیکن انہی دنوں ایک انشورنس کمپنی کی جانب سے جانوروں وغیرہ کو بھی یہ فرید سنانی گئی ہے کہ آپ بھلا کسی سے کم ہیں اب تدریج میں پہلی مرتبہ آپ کی انشورنس بھی ہو سکتی ہے ہماری کمپنی سے رجوع کریں اور اپنے بچوں اور مالکوں کا مستقبل محفوظ کر لیجئے۔ البتہ اس انتہائی واضح نہیں کیا گیا کہ مویشیوں اور جانوروں کو انشورنس کی جانب مائل کرنے کے لئے ایجنٹ انسان ہوں گے یا اس مقصد کے لئے خصوصی طور پر جانور بھرتی کئے جائیں گے لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ خوشگوار فریضہ بھی عام انسان ایجنٹ ہی سرانجام دیں گے۔ ظاہر ہے ان ایجنٹوں کی تمام تر ٹریننگ صرف انسانوں کو ہیہ کرنے کے لئے ہوگی چنانچہ انہیں کسی خصوصی ٹریننگ کو رس میں ان آداب سے روشناس کرایا جائے گا جو کسی جانور یا مویشی کو انشورنس کی طرف مائل کرنے کے لئے انتہائی ضروری ہوں گے۔ اس ٹریننگ کو رس میں انہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس جانور کے سامنے جا کر بیٹھا جائے اور کون سے جانور کے پیچھے جا کر گفتگو کی جائے۔ اور کئی ایسے بھی جانور ہیں جن کے آگے پیچھے بیٹھنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ ان کے قریب کسی درخت پر براجمان ہو کر گفتگو کی جائے مثلاً شیر و بھڑک اس خصوصی ٹریننگ کے بعد ایک انشورنس ایجنٹ مثلاً خان صاحب فیڈ میں نکلتے ہیں اور سب سے پہلے ایک گدھے کے پاس پہنچتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ گدھے کے پیچھے سے نہیں گزرنا چاہیے ورنہ دو لٹی چڑے گی اور وہ سامنے جا کر آداب بجالاتے ہیں اور کہتے ہیں: صبح بخیر گدھے صاحب کیا آپ کو معلوم ہے کہ ہماری انشورنس کمپنی نے دنیا کے تمام گدھوں کا مستقبل تانہا بنانے کے لئے ایک بالکل نئی گدھا سیکم تیار کی ہے۔ اگر آپ اس سیکم کے تحت انشورنس

انشورنس کی گدھا سیکم

ایک کامیاب سیزمین کی تعریف کچھ یوں کی جاتی ہے کہ وہ اپنی گفتگو سے ایک اسکیم کو بھی قابل کر لے گا کہ اسے ایک عدد فریج خریدنا چاہیے یا وہ اپنی باتوں سے ایک تنور والے کے آگے الیکٹرک ہیئر فروخت کر دیتا ہے کچھ اسی طور ایک انشورنس ایجنٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی خوشگوار اور زندگی سے بھرپور صبح کو آپ کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ جناب آپ دیکھنے میں تو بالکل بھلے چنگے نظر آتے ہیں ماشاء اللہ صحت مند ہیں لیکن فرض کیجئے کہ ابھی اسی وقت آپ دھڑام سے نیچے گر پڑیں اور فوت ہو جائیں تو؟..... اس پر آپ یقیناً یہی کہیں گے کہ بھائی صاحب زندگی اور موت تو اللہ کے اختیار میں ہے لیکن فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں آپ خواہ مخواہ میرا وقت ضائع نہ کریں میں انشورنس نہیں کراؤں گا۔ تب وہ انشورنس ایجنٹ آپ کے سامنے آپ ہی کی موت اور اس کے بعد آپ کے بال بچوں کی حالت زار کا ایسا دلہوز نقشہ کھینچے گا کہ آپ اپنی ہی موت پر ابدیدہ ہونے لگیں گے اور انشورنس کروانے کی حامی بھر لیں گے کہا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی شخصیت انتہائی باوقار اس کا لباس نہایت دیدہ زیب اور اس کی گفتگو بے حد مسحور کن ہو اور حیرت انگیز طور پر اس کی تمام دلچسپیاں اور مشاغل وہی ہوں جو آپ کے ہیں تو بس جان لیجئے کہ وہ یا تو ایک عدد عاشق ہے اور یا وہ انشورنس ایجنٹ ہے۔ ویسے تو عاشق بھی ایک طرح کا انشورنس ایجنٹ ہی ہوتا ہے یعنی یہ زندگی

کرواتے ہیں تو آپ کی وفات کی صورت میں آپ کی بیگم اور آپ کے بچوں یعنی گدھے کے بچوں کو ایک چراگاہ پیش کی جائے گی جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی چین سے چرتے ہوئے گزار سکتے ہیں..... کہیے کیا حال ہے؟ اس پر گدھے صاحب ایک لمبی ڈھینچوں کریں گے۔ اور کہیں گے ”بیگم صاحبہ ایک عرصے سے غائب ہیں۔ بچوں کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ کتنے ہیں اور کہاں ہیں..... میں انشورس پھر بھی کروالوں گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ میری کمر پر ذرا کھجلی کر دیں۔ بڑی دیر سے بے چین ہو رہا ہوں.....“ خاں صاحب انتہائی مستعدی سے گدھے کی کمر پر کھجلی کرنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور اس دوران اپنی ٹٹینگ بھول کر ایک ایسے مقام پر جا کھڑے ہوتے ہیں جو دو لٹنی مارنے کے لئے انتہائی موزوں ہوتا ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گدھے کے ساتھ کنوینگ کرنے کے بعد خاں صاحب کو چند روز کے لئے ”چمک“ پڑ جاتی ہے اور وہ فیملی سے باہر ہو جاتے ہیں۔

رو بھوت ہونے کے فوراً بعد خاں صاحب ایک نئے عزم کے ساتھ کیفیت میں کام کرنے والے ایک بیل کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور گفتگو کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں: ”جناب بیل صاحب! آپ کی زندگی کیا ہے؟ علم کا ایک دریاستے جو بہت چلا جاتا ہے، دن رات مشقت کرتے رہتے ہیں، کیا آپ نے کبھی اپنے بہتر مستقبل کے لئے سوچا ہے؟ فرض کیجئے کہ آپ آج ہی مر جاتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ بیل سر اٹھاتا ہے۔ اور بڑے اطمینان سے کہتا ہے: ”ہوگا کیا؟ چمک اچارے جائیں گے اور ماس گدھ کھا جائیں گے“ اس پر خاں صاحب مسکرا کر کہتے ہیں ”نہیں بھائی.....“ میرا مطلب ہے آپ کے مالک کا کیا ہوگا..... وہ غریب تو بھوکا مر جائے گا“ بیل اس سادہ لوح انسان کی بے وقوفی پر غور کرتا ہے اور کہتا ہے ”نہیں جناب وہ بھوکا نہیں مرے گا بلکہ ایک اور بیل خرید لائے گا.....“

خاں صاحب اچھل پڑتے ہیں بالکل..... لیکن اُس کے پاس رقم کہاں سے آئے گی۔ اگر آپ ہماری کمپنی سے بیمہ کروالیں تو آپ کی وفات کے بعد آپ کے مالک کو اتنی رقم مل جائے گی کہ وہ ایک کی بجائے دو بیل خریدے گا.....“ بیل ناراض ہو کر کہتا ہے: ”آپ میرے سینگوں کی زد سے باہر ہیں ورنہ آپ کی حماقت کا احساس دلانا بھئی اگر میں خود مر جاتا ہوں تو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرا مالک ایک بیل خریدتا ہے یا دو..... میں تو فوت ہو گیا ناں..... اور اس کے علاوہ ہم مویشیوں میں ایک کھات ہے کہ ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہم کہاں ہیں اور کیسے ہیں ہم نے چارہ ہی کھانا ہے ہں.....“

خاں صاحب مایوس ہو کر واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن ایک کامیاب انشورس ایجنٹ کی طرح وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوتے چنانچہ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ بڑے بڑے جانوروں کی بجائے مسکین اور چھوٹے چھوٹے جانوروں پر قسمت آزمائی کی جائے۔ اس دوران اتفاق سے ان کا گندہ ٹولنٹن مارکیٹ میں سے ہوتا ہے جہاں ایک بڑے ڈربے میں سینکڑوں مرغیاں بند ہیں۔ ان کی رنگ انشورس پھر کتنی ہے اور وہ مرغیوں سے محو کام ہو جاتے ہیں تمام مرغیوں کی خدمت میں آداب آپ سب آج تک اپنے مستقبل سے غافل رہے ہیں، میں آپ کو اس خواب غفلت سے جگانے آیا ہوں، کبھی یہ بھی سوچا کہ تمہاری موت کے بعد تمہارے ننھے منے چوزوں کا کیا ہوگا۔ تمہارے رحم دل مالک پر کیا گزرے گی؟ آج ہی ایک روپیہ فی مرغی کے حساب سے انشورنس کروالو اور عیش کرو.....“ مرغیوں کا رحم دل مالک بھی قریب ہی کھڑا ہے، چنانچہ وہ باقاعدہ آبدیدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ جناب یہ تو بہت بھولی بھالی مخلوق ہے، مجھ سے بات کیجئے یہ لیجئے ایک سو دس روپے اور میری پیاری مرغیوں کی زندگی کا بیمہ کر دیجئے۔ خاں صاحب اس کامیابی پر بے حد نازاں ہوتے ہیں اور رقم

بچے ہوں گے تو طوطے ہوں گے

آج سے تقریباً پندرہ برس پیشتر دسمبر کی ایک غیر معمولی طور پر خنک رات تھی رضائی میں گھسنے سے پیشتر مجھے احساس ہوا کہ صبح کے لئے سگریٹوں کا ذخیرہ ختم ہے اور صبح چھٹی کا دن بھی تھا۔ چنانچہ میں اپنے آپ پر جبر کر کے اٹھا اور مال روڈ پر آگیا اس وقت کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ سڑکیں سنان پڑی تھیں۔ ایک کھوکھے سے سگریٹ کا پیکیٹ خرید کر میں واپس جا رہا تھا کہ ایک سکوتر ہارن دیتا ہوا میرے قریب آکھڑا ہوا۔ سکوتر پر معراج پتھر سوار تھا۔ اس نے اپنے مختصر سر پر اپنے پراسٹے زیادہ کوٹ اور اوور کوٹ وغیرہ چڑھا رکھے تھے کہ میں اسے پہچان نہ پایا۔ تب اس نے مفلر میں سے منہ نکال کر اپنے بھاری آواز میں کہا "السلام علیکم تارڑ صاحب اتنی سردی میں اور رات کے اس وقت مال روڈ کی سیریں کر رہے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے کہا معراج پتھر میں تو سگریٹ خریدنے کے لئے نکلا تھا۔ تم کس سلسلے میں گھوم رہے ہو؟

"میں طوطا دیکھنے کے لئے گیا تھا" وہ ہولا۔

"طوطا؟..." میں نے حیرت پوچھا۔

معراج پتھر اگرچہ عجیب و غریب عادات و خصائل کا مالک ہے لیکن رات کے بارہ بجے وہ طوطا دیکھنے کے لئے نکلا ہوا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

"ہاں ہاں طوطا نہیں ہوتا۔ تو تیا من تو تیا والا طوطا۔ ہر لی طوطا"

وصول کر کے ہیمر کر دیتے ہیں اس کامیاب مشن کی رپورٹ دینے کے لئے جب وہ اپنے دفتر پہنچتے ہیں تو مرغیوں کا مالک ان سے پہلے وہاں موجود ہے، ادرا ب بھی آبدیدہ ہے اور کہتا ہے "جناب میری ساری مرغیاں اٹھ کو پیارمی ہو گئیں۔ اور اس وقت رورٹ کرنے والی مشینوں پر گھوم رہی ہیں۔ براہ کرم فی مرغی تیس روپے کے حساب سے تین ہزار تین سو روپے کی ادائیگی کر دیں۔ آپ کے فارم میں لکھا ہے کہ صرف خودکشی کی صورت میں ادائیگی نہیں ہوگی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے خودکشی نہیں کی بلکہ باقاعدہ حلال کی گئی ہیں؟.... خاں صاحب کی کمپنی کو مجبوراً ادائیگی کرنا پڑتی ہے اور یہ رقم ان کی نالائقی کی وجہ سے ان کی تنخواہ میں سے کاٹ لی جاتی ہے تب خاں صاحب فیصلہ کرتے ہیں کہ اب وہ کسی ایسے جانور کی انشورنس کریں گے جس کے مرنے اور مارنے کا احتمال کم ہو چنانچہ وہ چڑیا گھر جا کر ایک شیر کے سامنے جا بیٹھتے ہیں۔ اسی شام ایک شیر انشورنس کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہاں ہنگامی پرچ جاتی ہے۔ تمام کارندے فرار ہو جاتے ہیں صرف میجر صاحب اتنے بہادر ہوتے ہیں کہ اپنی کرسی پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کیونکہ شیر کمرے کے واحد دروازے میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے شیر بھی آبدیدہ ہو کر کہتا ہے "کیا آپ کے ایجنٹ خاں صاحب نے انشورنس بھی کر دیا رکھی تھی؟ اگر کوئی تھی تو مہربانی کر کے نیچے کی رقم ان کے بال بچوں کو دے دی جائے۔ اس پر میجر صاحب ہکلاتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہیں؟.... شیر ایک لمبا ڈکار لیتا ہے اور میز پر رکھی سیون اپ کی بوتل اٹھا کر پینے لگتا ہے۔

”اچھا تو پھر دیکھ لیا؟“ میں نے بار مانتے ہوئے کہا۔
”نہیں“ اس نے مایوس ہو کر کہا ”چڑیا گھر بند ہے۔“

”ظاہر ہے کہ آدھی رات کے وقت تو چڑیا گھر بند ہوتا ہے۔ جاغوروں کو بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے؟“

”تم کسی ایسے شخص کو جانتے ہو۔ جس کے پاس طوطا ہوا اور ہم اس طوطے کو دیکھ سکیں؟“ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

تب میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور میں نے خاصی دشمنی سے معراج پتھر مت مخاطب ہو کر کہا بھائی جان میرے مہربان آپ کا دماغ تو درست ہے؟ یا تو تم مجھے اُتو بنا رہے ہو اور یا تم خود اُتو بن چکے ہو۔

معراج پتھر بننے لگا۔ تمہاری شادی ہوگی ناں پھر تم بھی اُتو بن جاؤ گے میری طرح۔

میں نے کہا کہ یہ شادی اور طوطے کا کیا تعلق ہے؟
کہنے لگا۔ بہت گہرا تعلق ہے جناب۔ شادی ہوگی تو بچے ہوں گے۔۔۔ ٹھیک؛ اور بچے ہوں گے۔ تو طوطے ہوں گے۔

”بچے ہوں گے یا طوطے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے۔ معراج پتھر میں جا رہا ہوں یا تو تم اپنی طوطا کہانی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ورنہ میں جا رہا ہوں۔“

”اوسے باندھ“ معراج پتھر نے سکوتر کے آگے رکھی ہوئی ایک بڑی ہی گٹھڑی سے مخاطب ہو کر کہا ”سلام کر چاہے کو۔“

اس گٹھڑی میں سے پہلے ایک چھوٹا سا بانٹہ برآمد ہوا۔ پھر ایک ننھا چہرہ اُڑا۔ اس نے ٹٹھکتے ہوئے کہا ”سلام چاچا جی؟“

”اوسے یہ کیا ہے؟“ میں نے پتھر سے پوچھا۔

تمہارا بھتیجا ہے۔ تارڑ صاحب؟

”اتنی سردی میں اس غریب کے بال کو کیوں لئے پھر رہے ہو؟“

”اس غریب کے بال کی وجہ سے تو میں اس سردی میں پھر رہا ہوں۔۔۔۔۔ جناب ہوا یہ کہ ہم سارے سوئے ہوئے تھے اپنی اپنی رضائیوں میں۔۔۔۔۔ اور یہ باندھ

میرے پاس سوتا ہے۔ یہ بھی سویا ہوا تھا۔ آدھی رات کو اُٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔ میں نے دھکیاں دیں، پیار کیا لیکن یہ چپ نہ ہوا۔۔۔۔۔ کہنے لگا پہلے طوطا دکھاؤ

پھر چپ کروں گا۔ میں نے ہتیرا سمجھا یا کہ چاند میرے صبح ہو جائے میں تمہیں طوطے کو تڑا شتر مرغ ہو کہو گے دکھا دوں گا لیکن اس کی ایک ہی رٹ کہ میں تو طوطا

دیکھوں گا اور اسی وقت دیکھوں گا۔۔۔۔۔ میں اب اتنا بھی بے وقوف نہیں کہ تارڑ صاحب کہ مجھے یہ بھی نہ پتہ ہو کہ رات کو چڑیا گھر بند ہوتا ہے۔ پر اس کی

صند تھی۔ چنانچہ مجبوراً اٹھا۔ یہ تمام اور رکوٹ وغیرہ پہنے اسے کپڑے پہنائے سکوتر نکالا اور اب اسے چڑیا گھر کا بند دروازہ دکھا کر واپس گھر جا رہا ہوں۔“

میں نے کہا معراج پتھر اتنی مصیبت کرنے کی بجائے ایک تھپڑ لگا دیا ہوتا خود ہی چپ کر جاتا۔

معراج پتھر مسکرانے لگا۔ اپنی اولاد کو اتنی آسانی سے نہیں مارا جاسکتا تارڑ جی۔۔۔۔۔ بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ان کا کہنا ماننا چڑتا

ہے۔۔۔۔۔ جب شادی ہوگی ناں اور بچے ہوں گے تب پوچھوں گا کہ سناؤ جی اولاد کو کبھی اس بات پر پتھر مارا کہ وہ طوطا دیکھنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔

معراج پتھر چلا گیا اور میں سوچتا رہا کہ کتنا احمق انسان ہے اتنی سردی کے باوجود بچے کی ایک ناممکن خواہش کے لئے بستر کا آرام چھوڑ کر طوطا تلاش کر رہا ہے۔

پھر میری بھی شادی ہو گئی۔ اٹھنے اولاد کی نعمت سے نوازا۔۔۔۔۔ سردیوں

کی ایک رات تھی۔ میرا بڑا بیٹا سلجوق جو اس وقت تین چار برس کا تھا۔ اٹھا اور ریلے لگا میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا: ابو مکسن ثانی کھانی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمام دکانیں بند ہو چکی ہیں لیکن میں نے کپڑے بدلے گھر سے نکلا اور آدھا شہر چھان کر اس کے لئے مکسن ٹافینوں کا ایک پیکٹ ڈھونڈ کر لے آیا۔ تب مجھے معراج پتھر بہت یاد آیا۔

آج صبح میں گرمی سے بھنایا ہوا بیٹھا تھا کہ معراج پتھر ایک عرصے کے بعد پھر سے نازل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک آٹھ دس سالہ بچہ ننھا اندر داخل ہوتے ہی اس نے بچے کے سر پر ایک ہلکی سی چپٹ رسید کی "اوسے باندر۔ سلام کر چاہے کو" پیار سے بچے نے مجھے سلام کیا اور بیٹھ گیا "آپ کا بھتیجا ہے" معراج پتھر نے حسب عادت دونوں پاؤں کرسی پر رکھے اور سگریٹ کا ایک لمبا سونٹا لگا یا۔

"یہ وہی ہے طوطے والا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں جی وہ تو ماشاء اللہ اب جوان ہو چلا ہے یہ چھوٹے والا ہے وہی جو گزریں جا پڑا تھا" ادھر ادھر کی سیاسی اور سماجی گپ شپ کے بعد معراج کہنے لگا۔ تمہارے پاس ایک کام سے آیا ہوں؟ میں نے کہا فرماؤ۔ پتھر کہنے لگا۔ اپنے بھتیجے کو گھوڑا دکھا دو۔

"گھوڑا؟ کون سا گھوڑا؟"

"وہی جس کے ساتھ تم باتیں کرتے رہے ہو۔"

"معراج پتھر گرمی بہت ہے مجھے تنگ مت کرو۔ کون سا گھوڑا؟"

"یار تم نے کالم نہیں لکھا تھا، پچھلے ہفتے کہ تخم ملنگاں کا شربت پیتے ہوئے تم سے ایک گھوڑا باتیں کرنے لگا تھا؟"

"ہاں لکھا تو تھا لیکن یار وہ تو گرمی کا اثر تھا۔ میرا دماغ چل گیا تھا..... اور

کالموں وغیرہ کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا کرتے۔"

"میں تو نہیں بیٹا" اس نے بچے کے گل پر ایک اور چپٹ رسید کی لیکن یہ بیٹا ہے..... پچھلے ہفتے مجھے کہنے لگا کہ اب یہ گھوڑے کے پیچھے دو پہیے کیوں لگے ہوتے ہیں..... میں نے بتایا کہ وہ اس کے پیچھے نہیں ہوتے بلکہ ٹانگے یا ریڑھے کے پیچھے ہوتے ہیں..... کہنے لگا۔ میں نے آج تک جتنے گھوڑے دیکھے ہیں ان کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں..... میں خالص گھوڑا دیکھنا چاہتا ہوں..... لوجی تارٹر صاحب اسے سکوتر پر بٹھا کر سارا شہر چھان مارا لیکن کہیں بھی خالص گھوڑا نہیں ملا۔ ایک وقت ہوتا تھا کہ اس شہر کی سڑکوں پر گھوڑے زیادہ اور باقی سواریاں کم ہوتی تھیں۔ پھر گھوڑے ٹانگوں اور ریڑھوں میں بندھ گئے۔ اور اب صرف گھوڑا نظر نہیں آتا..... آپ کا کالم مجھے اچھا لگا۔ میں نے اسے سنایا تو کہنے لگا۔ بس کام بن گیا۔ اس چاہے کے پاس گھوڑے ہوں گے مجھے دکھا لاؤ۔ چنانچہ تمہارے پاس لے آیا..... اب دکھاؤ گھوڑا؟

میں گھوڑا کہاں سے دکھاتا صرف دانت دکھائے اور بچے سے کہا ہر غوردار لاہور کا پڑیا گھر مختلف ممالک سے چھ لاکھ روپے مالیت کے جانور برآمد کر رہا ہے جن میں لکڑی، پتھر، ہندو اور مختلف پرندے شامل ہوں گے گوریل، منگوانے کا بھی ارادہ تھا۔ تاہم جگہ کی کمی کی وجہ سے اسے منگوانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے..... میں اپنی پہلی فرصت میں چڑیا گھر والوں سے ملاقات کروں گا اور سفارش کروں گا کہ دیگر جانوروں کے علاوہ چند گھوڑے بھی درآمد کر لئے جائیں تاکہ لاہور کے بچہ لوگ اصل گھوڑے دیکھ سکیں۔

معراج پتھر اٹھا قدرے مایوس اور ملول کہ بچے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی اور "سا مالیکم" کر کے چلا گیا..... اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ لاہور میں

واقعی جانور کم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایک عرصے سے میں نے بھی اصلی گھوڑا نہیں دیکھا جب دیکھا پہیوں کے ساتھ دیکھا۔ ایک زمانے میں ہندو اور پچ کا تماشا دکھانے والے گلی گلی ملتے تھے۔ جانے کہاں گئے۔ کھوڑا اور پیٹر وغیرہ رکھنے کا رواج بھی ختم ہو چلا ہے۔ اندرون شہر لوگ نیولے بھی پاتے تھے..... شاید جانوروں کے لئے اب ہمارے پاس وقت نہیں رہا یا شاید اب ہمیں جانوروں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان دونوں انسانوں میں ہی جانوروں کی بیشتر خصوصیات ملنے لگی ہیں۔

چوبانیت اور انسانیت

خبر یہ ہے کہ ادھر مغرب میں آج کل کچھ عجیب و غریب تجربات کئے جا رہے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ چوہوں میں کچھ انسانی ہراسیم یا مادے وغیرہ داخل کر کے دیکھا جا رہا ہے کہ ایسا کرنے سے چوہا صاحب کو کیا ہوتا ہے وہ چوہا بھی رہتا ہے یا نہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تجربات کے خلاف مغرب کے چوبادان حضرات اور ”چوہوں سے پیار کرو سوسائٹی“ کے اراکین نے شدید احتجاج کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ”چوہوں میں انسانی مادے داخل کر دینا چوبان اور چوبانیت“ کی تبدیلی ہے کیونکہ اس طرح ان میں انسانیت پیدا ہونے کا امکان ہے اور یہ کسی بھی چوہے کے لئے ذوب مرنے کا مقام ہے کہ اس میں انسانیت پیدا ہو جائے یورپ اور امریکہ کی پبلک کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ وہ جانوروں سے بے حد پیار کرتے ہیں اور وہاں نکتوں سے پیار کرو انجمن ”سانپ آپ کے رفیق ہیں“ گھوڑے انسانوں سے بہتر ہیں“ اور ”گھبروں سے محبت کرنے والوں کی سوسائٹی“ وغیرہ قسم کی مختلف تنظیمیں ہیں جو کتوں سانپوں، گھوڑوں اور گھبروں کی فلاح و بہبود کے لئے دن رات کام کر رہی ہیں مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں چوہوں کے عشاق بھی داخل تعداد میں پائے جاتے ہیں یہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مغرب میں کتے کو کتا نہیں سمجھا جاتا گدے کو گدہ نہیں سمجھا جاتا اور انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا..... تو پھر یقیناً وہاں چوہے کو بھی چوبان نہیں سمجھا جاتا۔ انگلستان میں میرے ایک استاد ہوا کرتے تھے جن کا اسم گرامی معر گرانت تھا موصوف

”برخوردار“ یہ کیا شے ہے جسے تم اتنی محبت سے بھیج رہے ہو؟ میں نے
مچلی کا ایک قتلہ منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔
ٹونی نے باجھیں کھلا کر کہا ”انکل جو ہا ہے“
اس انکشاف پر انکل کی مچلی منہ سے باہر آتے آتے بچی۔
”چوہا“

”جی انکل میرا پالتو ہے سفید رنگ کا ہے اور بے حد فرمانبردار“ یہ کہہ کر اس
نے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک خاصا گورا چٹا چوہا برآمد کر کے میز پر رکھ دیا۔ اس
سفید چوہے نے میری کالی رنگت پر آنکھیں گھماتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا اور
پھر نہایت نفاست سے چلتا ہوا میری پلیٹ کے کنارے کے قریب آیا اور مچلی
کا ایک قتلہ منہ میں ڈال کر اسے بڑے اخلاق سے کترنے لگا۔
”دیکھا مسٹرانس“ مسٹر گرانٹ نے اس کے سر پر ایک شفقت بھری انگلی رکھتے
ہوئے کہا ”کیسا سلجھا ہوا چوہا ہے“

یہ میری اور اس سلجھے ہوئے چوہے کی آخری ملاقات تھی کیونکہ اس کے
بعد میں نے مسٹر گرانٹ کے گھر جانے سے توبہ کر لی۔

ہم پاکستانی بھی جانوروں کی محبت میں کسی سے پیچھے نہیں۔ ہم جانوروں
سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں بشرطیکہ وہ بھنے ہوئے دوست شکل میں ہوں یعنی
دوست مرغ۔ بھنے ہوئے تیرہ بیڑ۔ دوست بکرے وغیرہ۔ اس طرح محبت کرنے
میں بہت آسانی رہتی ہے جانور کو کچھ کھلانے کی بجائے آپ اسے کھا جاتے ہیں۔
روزانہ ایک نئے جانور سے محبت کی جاسکتی ہے جانور کبھی بوڑھا ہو کر نہیں مرتا
کیونکہ آپ اسے عین جوانی میں ہی نوش کر جاتے ہیں۔۔۔۔۔ غالباً باقی اور کوسے
کی عمر اسی لئے سو سال کے لگ بھگ ہوتی ہے کیونکہ انہیں کوئی نہیں کھاتا۔۔۔۔۔

ہمہ صفت انگریز تھے یعنی انہیں جب دیکھا سکا ش ٹوڈ کے ایک بوسیدہ کوٹ میں
ملبوس دیکھا جس کی کہنیاں گھٹنے ٹیک چکی تھیں در سڈ کی گرے پتلون کسی زمانے میں
سیاہ تھی جو دھیرے دھیرے گرے ہو چکی تھی جیب میں دس بیس پینے سے زیادہ مالیت
کے سکے نہیں رکھتے تھے کیونکہ پورا ایک پانڈے پھر نے سے بقول ان کے طبیعت
فضول خرچی کی جانب مائل ہو جاتی تھی شیوروزانہ کرتے لیکن کسی ایسے بلید سے جو
اب تک اپنی خصلت بھول چکا تھا بال بھی خود کاٹتے تھے۔۔۔۔۔ اور پاکستانی کمانوں
کے بے حد شوقین تھے چنانچہ بہتے میں ایک آدمہ مرتبہ میرے کمرے میں عین اس
وقت داخل ہو جاتے۔ جب میں بڑی مشقت سے پکایا ہوا آلو قلم سامنے رکھے
ڈبل روٹی کا ٹولہ ہمارا ہوتا۔۔۔۔۔ آہا زبردست مشرقی خوشبو ہے ”مسٹر گرانٹ ہاتھ ملتے
ہوئے کہتے اور مجھے مجبوراً کنا پڑتا کہ آئیے ناں مسٹر گرانٹ ایک قلم سیجے اور مسٹر گرانٹ
میری پوری ہفتے کی ہانڈی چٹ کر کے چلے جاتے۔۔۔۔۔ ان کے روز روز کے
چھاپوں سے تنگ آ کر ایک اتوار میں خود ان کے گھر جادھکا اور جاتے ہی کچن کی جانب
ناک اٹھا کر بولا ”آہا مسٹر گرانٹ کیا زبردست مغربی خوشبو ہے۔۔۔۔۔ اب مسٹر گرانٹ
بے چارے کیا کرتے انہوں نے مجبوراً مجھے بھی کھانے کی دعوت دے ڈالی اگرچہ
مسٹر گرانٹ انہیں گھورتی رہیں کیونکہ میز پر جتنی خوراک تھی وہ مسٹر گرانٹ مسٹر گرانٹ
اور ان کے بیٹے ٹونی کے لئے بھی بہت کم تھی۔ بہر حال کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔

ٹونی ایک بارہ سالہ چپ چاپ قسم کا بچہ تھا اور ایک کھلے گھے کی قیص
پہنے ہوئے تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے کھانا کھانے لگا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی قیص
کو درست کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی قیص کے اندر کوئی شے ہے جو باہر آنا
چاہتی ہے اور ٹونی اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔ وہ شے حرکت میں تھی اور
باقاعدہ چھدک رہی تھی۔

لیکن اپنے شہرہ آفاق فاسٹ باؤلر سر فرار نواز نے جانوروں سے محبت کا ایک مختلف پہلو پیش کیا ہے۔ وہ آئندہ ایکشنوں میں اپنا انتخابی نشان ”گھوڑا“ رکھیں گے مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے بطور خاص گھوڑے کو ہی کیوں چنا ہے لیکن شہید ہے کہ گھوڑوں کے لئے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں کیوں رکھتے ہیں؟..... یہ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جنہوں نے انہیں دنیا کے مایہ ناز بے بازوں کی جانب سرپٹ بھاگتے دیکھا ہے اور انہیں آؤٹ کرتے دیکھا ہے سوال یہ ہے کہ اگر کل کلاں ہمارے دیگر کھلاڑی یا ادیب ایکشن کرنے کا ارادہ کر لیں تو وہ کس جانور کو اپنا انتخابی نشان بنائیں گے؟..... سب سے زیادہ ڈیما نڈر و ظاہر ہے شیر کی ہوگی کیونکہ عورتوں کی گیلری کا مخصوص نعرہ..... فلاں ساڈھا شیر اسے۔ باقی ہیر پھیر اسے۔ ہوتا ہے۔ یہ فلاں ہر میچ میں بدل جاتا ہے اب شیر میں قباحت یہ ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک ہی قسم کا اور ایک ہی شکل کا ہوتا ہے چنانچہ صرف ایک امیدوار کے کام آسکتا ہے یہ امیدوار اگر چرچ و مح کے شیر کے سامنے آجائیں تو پھر شیر کے کام آسکتے ہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ لاجوردی شیر پشاور کی شیر اور کراچی شیر کے نشان علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں عمر کے لحاظ سے بھی دو قسمیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شیر اور دوسرا بڈھا شیر۔ کرکٹ ٹیم میں کئی حضرات ایسے ہیں۔ جو بڈھے شیر ہو سکتے ہیں جانور تو شیر کے علاوہ بھی بے شمار ہیں مثلاً گدھے۔ لومڑ۔ لکڑ بگڑ۔ بن مانس۔ شتر مرغ۔ زرافے اور کنگرؤ وغیرہ لیکن مجھ میں اتنی جرات نہیں ہے کہ میں آپ کو یہ بتا سکوں کہ کون سے کھلاڑی کا نشان گدھا ہونا چاہیئے اور کس ادیب کو کنگرؤ سوٹ کرے گا پسند اپنی اپنی۔

ہاں تو بات چوہوں سے شروع ہوئی تھی اور پہنچ گئی گدھوں تک.... جن چوہوں میں انسانی جراثیم داخل کیے گئے ان کے بارے میں ابھی تک معلوم

نہیں ہو سکا کہ ان میں بالآخر کیا تبدیلی آئی۔ لیکن ہم جو انسانی فطرت کو بخوبی جانتے ہیں تھوڑا بہت اندازہ کر سکتے ہیں قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ چوہے کیا ہو گئے ہوں گے۔ مثلاً ایک چوہا ہیں ”ٹکی“ نام کا اور دوسرے چوہا صاحب ہیں ”مکی“ جن میں انسانی جراثیم داخل ہو چکے ہیں۔ اگر دونوں میں ملاقات ہو جائے تو کچھ اس قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔

”ہیلو مکی کیا حال ہے؟“

”ہیلو ٹکی تم کیسے ہو؟“

”یار تم بڑے دنوں سے غائب تھے کونسی اور کس کی بل میں گھسے ہوئے تھے؟..... کسی چوبیا کے چکر میں تو نہیں ہو؟“

”نہیں ٹکی تمہیں پتہ ہے کہ میں بہت مشریت قسم کا چوہا ہوں..... دراصل میں..... بہر حال پھر بتاؤں گا..... کچھ کھانے پینے کو مل رہا ہے ان دنوں؟“

”ہاں شکریہ خدا کا..... تم سناؤ“

”بڑا برا حال ہے یار..... آج صبح گھر سے نکلا تو ایک چوبیا جا رہی تھی میں نے اس کا پرس چھین لیا.....“

”یار تم تو ایسے نہیں تھے“

”پرس میں سے ایک لپ اسٹک نکلی اور پانچ روپے کا ایک نوٹ پھر ایک چھوٹا سا بچہ مل گیا سکول جاتا ہوا اسے اغوا کیا“

”یار تم تو ایسے نہیں تھے“

اس کے والدین کو فون کیا کہ فوراً ایک لاکھ روپے کا انتظام کر دو ورنہ بچے کو مار دوں گا کل کا وعدہ ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے؟

”یار مکی“

”یار مکی میراجی چاہتا ہے کہ میں چوہوں کے گھر لوٹ لوں۔ چوہوں کو اٹھا کر لے جاؤں سب لوگ میری دہشت سے کانپنے لگیں۔ میرے ایک ہاتھ میں گنڈا سا ہوا اور دوسرے میں ٹوکا اور میں ہر چوہے سے پوچھوں نوال آیا اس سوہنیا؟“

”میراجی چاہتا ہے کہ میں ہیروئن کی سنگٹنگ شروع کر دوں۔ ملک بدنام ہو تو ہو لیکن میرے پاس مال ہونا چاہیئے۔ کاریں، جنگے، لندن اور پیرس میں فلیٹ... یار تم تو بالکل ایسے نہیں تھے اچھے بھلے چوہے تھے کیا ہو گیا ہے..... تمہیں.....“

”مکی میں کس کو خوش نہیں دیکھ سکتا۔ کسی کو ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتا.....“

میراجی چاہتا ہے..... میراجی چاہتا ہے کہ مکا مار کر تمہاری بتیسی بھی باہر نکال دوں۔

”مکی اولڈ بوائے آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم تو ایسے نہیں تھے“

”میں اب تک نہیں تھا لیکن اب ہوں کیونکہ میرے جسم میں انسانی جراثیم داخل ہو گئے ہیں“

مُنّے کی سالگرہ مبارک

جس طرح پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر بندے کی شکل و صورت پر ایک عجیب ہونق پن طاری ہو جاتا ہے خوشی کے ساتھ ساتھ اس کے اعصاب جواب دے رہے ہوتے ہیں اور اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا۔ بلکہ بعض اوقات تو شک ہونے لگتا ہے کہ کچھ ہوگا بھی یا نہیں اور اگر ہوگا تو لڑکا یا لڑکی اور اس کی شکل و صورت کیسی ہوگی گورا ہوگا یا کالا ہوگا یا کیا ہوگا۔ اور کیسے ہوگا۔ یہی صورتحال اس وقت وجود میں آتی ہے جب آپ کو زندگی کا پہلا اخباری کالم لکھنا ہوتا ہے آج سے ٹھیک ایک برس پیشتر جب ”مشرق“ کی انتظامیہ نے مجھے کالم نگاری کے میدان میں آجانے کی دعوت دی تو اس وقت تو میں نے کمال خود اعتمادی سے یہ دعوت قبول کر لی لیکن جب قلم ہاتھ میں لے کر سفید کاغذ کی طرف دیکھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے غالب کے ہاتھ پاؤں تو خوشی سے پھول گئے تھے لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ میری شکل و صورت پر بھی ایک عجیب ہونق پن طاری ہو گیا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ اعصاب جواب دے گئے اور مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ہوگا بھی یا نہیں اور اگر ہوگا تو کیسا ہوگا..... سب سے پہلے تو مجھے یہ تعین کرنا تھا کہ میرے آئندہ کالموں کا دائرہ کار کیا ہوگا۔ ان کا موڈ کیا ہوگا اور وہ جو انفرادیت پیدا کی جاتی ہے، اپنے سائل اور زبان میں وہ کس طرح پیدا ہوگی..... بس وہی پہلے بچے کی پیدائش سے پیشتر پیدا ہونے والے دوسرے

اور خدشات اس دوران مجھے وہ صاحب بے حد یاد آئے جنہیں ایک مقامی روزنامے میں ایک چھوٹا موٹا ادبی کالم لکھنے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ اپنا پہلا کالم لکھنے سے پیشتر انہوں نے ٹی ہاؤس کی میز پر کئے چلاتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اب ہمارے پاس بھی کالم کی تلوار آگئی ہے۔ پرنٹ لیں گے انتظار حسین سے پتہ نہیں وہ چچا انتظار سے پرنٹ سکے یا نہیں البتہ ان کے اخبار نے چند کالموں کے بعد انہیں ختم کر دیا۔ مجھے چونکہ خون خرابہ پسند نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب ہمارے پاس بھی کالم کی تلوار آگئی ہے اور ویسے بھی انتظار حسین ہمارے بزرگوں میں سے ہیں اور مشرق کے دریا میں بہت دیر سے رستے ہیں بہر حال بہت زور مارا لیکن کالم نہ بن سکا یا یوں کہہ دیجئے کہ کالم باندھنا نہ جاسکا۔ اس پر صوفی ذوالفقار احمد تابش نے مشورہ دیا کہ تم فی الحال اپنے سے سینئر کالم نگاروں کے کالم انتہائی دیدہ ویزی سے پڑھو اور ان کے سٹائل میں لکھنے کی کوشش کرو آہستہ آہستہ ان سب کے مکسر میں سے تمہارا اپنا ایک جداگانہ سٹائل ابھرائے گا میں نے کہا کہ اگر نہ ابھر تو؟ تابش کہنے لگا کمال ہے سمندر میں سے بزمیر سے ابھر آتے ہیں۔ نئی اداکارییں اگر سیانی ہوں تو وہ ابھر آتی ہیں۔ تمہارا سٹائل بھی ابھر آئے گا۔ چنانچہ میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور سب پہلے نیکی کا آغاز گھر سے شروع کیا۔ یعنی چچا انتظار کے سٹائل میں لکھنے کی کوشش کی۔ کالم کا آغاز کچھ یوں ہوا۔

”صاحبو! ہمارے ان دنوں گرمی کی وہ شدت ہے کہ الامان الحفیظ چیل انڈو جھوڑ دیتی ہے۔ سارے شہر میں چھاؤں کا نام و نشان نہیں۔ ہم نے کارپوریشن والوں سے درخواست گزار دی تھی کہ جناب یہاں نیم کے چند بیڑ بھی لگوا دیجئے انہوں نے سنی ان سنی کر دی۔ ہماری بات پر کان ہی نہیں دے رہا حالانکہ مئی کا مہینہ ہے اور اس مہینے کے بارے میں مولوی اسماعیل میرٹھی نے کیا خوب کہا ہے کہ مئی کا آن

پہنچا ہے مہینہ اور رکشوں والوں کو بھی گرمیوں کی آمد کی خبر ہو چکی ہے ان کے مزاج سا تو اس آسمان پر ہیں۔ کیا خوب دن تھے جب لاہور میں تانگے چلا کرتے تھے اور ہم دو آنے دے کر بھائی سے اسٹیشن تک چلے جایا کرتے تھے۔ پچھلے دنوں مشکور حسین یاد نے یہاں یاد کیا اور ایک خاص دعاء ”پارٹی پر بلا کر فرشتہ کھلا لیکن کٹ کر اور بیڈوں میں سجا کر گھٹلیاں غائب تھیں۔ اب صاحبو آپ ہی اصرار کرو کہ آم کھانے کے ساتھ ساتھ اگر گھٹلیاں چوستے کو نہ ملیں تو خاک مڑا آئے گا۔ یعنی صرف آم کے آم تھے گھٹلیاں !.....“

میں انتظار حسین کے تفتیح میں کالم لکھتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک غلطی کا احساس ہوا وہ یہ کہ مجھے جو کالم لکھنا تھا وہ مادہ انگست کے لئے تھا اور اس میں مئی کا مہینہ آگیا تھا اور آموں کا تذکرہ بیچ میں پتہ نہیں کہاں سے آن چکا کہ ان دنوں ٹپکے کا آم جوتا ہی نہیں۔ تب میں نے انتظار حسین کی نقالی کا بھاری پتھر چوم کر رکھ دیا اور محترم ضمیر جعفری صاحب کی بھاری بھر کم شخصیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے کالم کا آغاز کیا جو کچھ یوں تھا۔

”یہ ان دنوں کا تذکرہ ہے جب ہم برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اپنے مرشد مولانا چراغ حسن حسرت اپنے فیض سے نکلے اور“

ضمیر صاحب کو میں نے فوراً ہی چھوڑ دیا کیونکہ برما اور حسرت صاحب دونوں سے ہی میری یاد اللہ نہیں تھی ضمیر صاحب کے محاذ پر مجھے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب عبدالقادر حسن کی طرف آیا تو ان کے کالم کا عنوان دیکھ کر ہی چپکے سے واپس آگیا۔ میں سیاسی کالم نگار نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ اس میں ہر حکومت کی تبدیلی سے مشکل مقام آجاتے ہیں اور اس کے لئے بے شمار پاپڑھینے پڑتے ہیں اور ان پاپڑوں میں نمک مرچ کا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے ورنہ سب

کا حساب کتاب کر دیا جاتا ہے۔

رفیق ڈوگر کے کاموں میں غصہ بہت تھا۔ بیباکی اور بے غوفی بہت تھی اور میں یہ سب کچھ انورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

تب میں نے منو بھائی کے کاموں کو سامنے رکھا اور اپنے کالم کا آغاز کر دیا۔
”شور کوٹ سے میری ایک بہن ثمنہ خاں نے لکھا ہے..... منو بھائی! میں آپ کو آج اسی طرح آواز دے رہی ہوں جس طرح آج سے کئی سو برس پہلے ایک مظلوم بہن نے محمد بن قاسم کو آواز دی تھی۔ کیا آپ اپنی بہن کی آواز پر اس کی پکار پر کان دھریں گے۔ میرے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوا ہے میں ایک مقامی سکول میں استانی ہوں اور تین ماہ سے مجھے محکمہ تعلیم کی طرف سے تنخواہ کی ایک پائی ادا نہیں کی گئی۔ خدا ارے انصاف دلایئے بلکہ انصاف نہ بھی دلایئے تو کم از کم تنخواہ دلایئے۔ آپ کی دیکھی بہن..... ثمنہ خاں شور کوٹ روڈ۔“

بہن ثمنہ میں آپ کا خط پڑھ کر خون کے آنسو روپا چنا پچھ میری واحد سفید قیض کا ستیا ناس ہو گیا۔ کیونکہ اب اس پر ان آنسوؤں کے سرخ دھبے ہیں..... اس پر مجھے ایک لاطینی شاعر ابراہن تو انتونیو گارسیا توچینی کا ایک شعر یاد آ گیا جس میں وہ کہتا ہے کہ

”یہ خون کے آنسو

میرے آنسو ہیں۔

تمہارے آنسو ہیں۔

کل کائنات کے آنسو ہیں۔

آنے والا کل ان کی سرخی آسمانوں پر لکھ دے گا؟

تو بہن ثمنہ خاں وہ دن دور نہیں جب میرے ملک کی مائیں بہنیں ایک

ایسی صبح دیکھیں گی جب.....

یہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے احساس ہوا کہ پھر غلطی ہو گئی ہے کیونکہ مجھے تو قارئین کے خط اس وقت وصول ہوں گے جب میرا کوئی کالم چھپے گا اور اگر نہیں بھی وصول ہوں گے تو بناوٹوں کا لیکن اپنے کالم کے لئے یہ انداز ہرگز مناسب نہیں ہو گا چنانچہ آخر میں میں نے برادر اظہر جاوید کے انداز تحریر کو اپنانے کی کوشش کی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

”قارئین آپ سے کیا عرض کروں آج صبح صبح منانگیشگر کا ایک گانا سن لیا نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں..... بس کچھ مت پوچھیے کہ اس غنیف کی سرسبیلی شرمیلی، فزیکلی، بیکریلی اور البیلی آواز نے دل ناتواں پہ کیا کیا ستم ڈھائے کیا ہوا دل پہ ستم تم نہ سمجھو گے بلکہ۔ عجیب زمانہ آگیا ہے لوگ کیسے شاعروں اور ادیبوں کو بھول گئے ہمیں کون یاد رکھے گا ہم تو ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں کرچی کرچی ہو گئے ہیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے ہیں درست ساتھ چھوڑ گئے بیگانے تو پھر بیگانے تھے آؤ نہ گئی کیا ہے غم کا دریا ہے اس جینے کے ہاتھوں ہم تو مر چلے.....“

اظہر جاوید کے سائل میں لکھتے لکھتے یہاں تک پہنچا تھا تو خیال آیا کہ اس قسم کا آہ زاری سے بھرپور کالم لکھوں گا تو یہ نہ ہو کہ ”مشرق“ کی انتظامیہ پہلے کالم کی اشاعت کے بعد ہی ہماری چھٹی کراؤ سے کہمیاں کیوں لوگوں کو صبح صبح اشک بار کرتے ہو ہمارے پرچے کا مزاج یہ نہیں ہے.....

خواتین و حضرات تب مجھ پر یہ کھلا کہ کالم نگار بھی ایک اداکار کی طرح ہوتا ہے جب وہ اخبار کی سیٹج پر جاتا ہے تو وہ بالکل اکیلا ہوتا ہے اگر اس میں کچھ ٹیلنٹ ہو تو وہ داد وصول کر لیتا ہے ورنہ اس پر ٹائٹل اور انڈوں کے چھلکے پھینکے جاتے ہیں..... وہ دوسرے کامیاب اداکاروں کی نقل کرے گا تو مارا جائے گا

چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر قلم پکڑا اور آج سے ایک برس پیشتر اپنا پہلا کالم لکھنے لگا اور آج میں اپنا سواں کالم لکھ رہا ہوں کالم نمبر ایک سے لے کر کالم نمبر سو تک قارئین کی طرف سے بے شمار ثنائی اور گندے انڈے بھی پھینکے گئے لیکن ہم ڈھیٹ بن کر لکھتے گئے اور "مشرق" کی انتظامیہ اپنی شرافت میں چھاپتی گئی ورنہ کیا پدی کیا پدی کا شور بہ..... البتہ ان ثنائیوں گندے انڈوں میں کبھی کبھار ایک آدھ پھول بھی آجایا کرتا ہے جو مجھے بہت دیتا ہے کہ ہر سیاہ بادل کے کناروں پر ایک روپہلی لکیر بھی ہوتی ہے قارئین کیا آپ کا رواں سرائے کو ساگرہ مبارک نہیں کہیں گے؟..... بہت بہت شکریہ۔

آئی بسنت

دنیا کے مختلف ملکوں میں عمر عزیز کے گزرنے کا حوالہ مختلف موسم بنتے ہیں مثلاً یورپ میں اگر ایک بوڑھا پچھلے زمانوں کو یاد کرے گا تو کہے گا کہ اتنے موسم سرما پہلے کی بات ہے یا یہ کہ میں نے ان آنکھوں سے اتنی سردیاں دیکھی ہیں۔ یورپ میں چونکہ موسم سرما بے حد قہر ہوتا ہے اس لئے بوڑھے ہمیشہ اسی کا حوالہ دیتے ہیں جب کہ نوجوان لوگ یہ کہیں گے کہ آہ یہ فلاں موسم گرمائی بات ہے کہ ساحل سمندر پر مجھے فلاں سے عشق ہو گیا..... یا یہ کہ زندگی کو ایک طویل موسم گرما ہونا چاہیے جس میں گرم دھوپ چمکتی رہی.....

اپنے اس پاکستان میں اور اس کے گرد و نواح میں ہم موسم گرما یا سرما کا تذکرہ نہیں کرتے کیونکہ ہر دو عذاب ہوتے ہیں چنانچہ یہاں موسم بہار کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ فلاں نے زندگی کی اتنی بہاریں دیکھیں یا یہ کہ جیابے قرار ہے آئی بہار ہے وغیرہ وغیرہ..... لیکن ہمارے دوست نواز شعلی کا پیمانہ وقت سب سے جدا ہے..... فلاں کام اگلی بسنت سے پہلے پہلے کرنے کا ارادہ ہے یوں بھی وہ خاصے "بسنتی" واقع ہوئے ہیں..... بسنت کے دوسرے روز ملیں گے تو کہیں گے "پتہ نہیں اب اگلی بسنت دیکھنی نصیب ہوتی ہے یا نہیں..... یا اس مرتبہ استاد بسا امرتسری نے کام ٹھیک نہیں کیا پتنگوں میں سنگاپور کے بانس کی بجائے ملا یا کا بانس استعمال کیا اور یوں میری ساری

ایک مرتبہ مجھے بھی اندرون شہر ان کے گھر پر بسنت دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا یہ ایک چار منزلہ پرانا مکان تھا جو مسجد وزیر خان کے نواح میں واقع ہے۔ میں جب چاروں منزلوں کی تاریک سیڑھیاں طے کر کے کونٹے پر پہنچا تو نوازش صاحب اپنے درجنوں پتوں اور سینکڑوں پتنگوں اور گدوں اور کم از کم ایک درجن دوستوں کے ہمراہ ایک آٹھ فٹ ضرب آٹھ فٹ بلند مٹی پر معلق تھے۔ ان کے علاوہ اس مٹی پر چادروں کی ایک دیگ، ایک بھونپو اور ٹیپ ریکارڈر بھی رکھا ہوا تھا مجھے دیکھ کر کہنے لگے "آجاؤ آجاؤ"

میں نے پوچھا جگہ ہے؟
کہنے لگے "تم آؤ تو سہی"

میں بانس کی سیڑھی پر قدم جاتا جب مٹی کے کنارے تک پہنچا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر کھینچ لیا۔ میں بمشکل کھڑا ہوا اور بیٹھ گیا۔ کہنے لگے "اٹھو بسنت دیکھو"

میں نے کہا نہیں جناب مجھے اسی طرح بیٹھا رہنے دیں.....

انہوں نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑا اور کھڑا کر دیا..... میرے پاؤں کے نیچے جو مٹی تھی وہ لرز رہی تھی میری ٹانگیں لرز رہی تھیں اور لاہور شہر کا منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے میں شاہی مسجد کے مینار کے گنبد کے اوپر بیٹھ کر دیکھ رہا ہوں..... فضا میں ہر طرف پتنگیں ہی پتنگیں تھیں۔ نوازش صاحب سرخوشی اور مستی کے ایسے عالم میں تھے جہاں ان کو کچھ خبر نہیں تھی کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ میرا کیا حال ہے۔ میرا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے۔ جس کنارے پر میں جھول رہا ہوں اس کے عین نیچے کئی سو فٹ کی گہرائی میں مسجد وزیر خان سے ملحقہ بازار بہہ رہا ہے..... وہ میرے وجود کو بھول چکے تھے چنانچہ میں

پتنگیں "جب" مارتی تھیں، اگلی بسنت پر..... اور یوں اگلی بسنت کے لئے تیاری شروع ہو جاتی ہے..... بسنت سے تقریباً چھ سات ہفتے قبل وہ دنیا سے غائب ہو جاتے ہیں یعنی اس دنیا سے جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں۔ ان دنوں وہ رات گئے تک سڑکوں کے کنارے گیس کی روشنی میں بیٹھ کر ذاتی نگہانی میں ڈوبی لگواتے ہیں۔ دھاگرہ خود درآمد کرتے ہیں کبھی ہندوستان سے اور کبھی انگلستان سے۔ "گڈی میکر" استادوں کے گھروں میں قیام کرتے ہیں اور حسب پسند مال تیار کرتے ہیں بسنت سے چند روز پہلے ادھر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے "یار کوئی زسری والا واقف ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ بیشتر اپنے جاننے والے ہیں فرمائیے کیا کام ہے..... کوئی نایاب نسل کا پودہ یا پھول وغیرہ درکار ہے؟
کہنے لگے "نہیں بھئی بانس کے پودے درکار ہیں..... سنا ہے کہ تازہ بانس کی بنی ہوئی پتنگ میں پکاک بہت ہوتی ہے..... اور ہاں جھڑبیری کے پودے بھی خریدنا ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ ان کا کیا کیجئے گا؟ کہنے لگے وہ دھانگوں کے آگے باندھ کر کٹی ہوئی گڈیاں لٹائیں گے۔
میں نے کہا کہ حضرت آپ تو اڑانے والوں میں سے ہیں کونٹے والوں میں کب سے شامل ہو گئے؟

تب انہوں نے نہایت رازداری سے بتایا کہ اس مرتبہ انہوں نے محلے کے چند نوجوانوں کو صرف بسنت کے لئے ملازم رکھ لیا ہے تاکہ وہ ان کی کٹی ہوئی پتنگیں اور گڈے لوٹ لیں۔ یہ اہتمام اس لئے کیا گیا ہے تاکہ فریق مخالف بسنت کے بعد ان کی کٹی ہوئی پتنگوں کی نمائش کر کے ان کو شرمندہ نہ کر سکے۔

نے موقع غنیمت جانا اور فوراً بیٹھ گیا۔

نوازش صاحب ایک بڑی پتنگ اڑانا چاہتے تھے لیکن اگلے کوٹھے پر بٹول ان کے چند اناڑی گڈی باز چھوٹی چھوٹی گڈیاں اڑا رہے تھے اور پتنگ کے ٹیک آف میں دشواری ہو رہی تھی چنانچہ دو تین حضرات کو اس کا رنیر پر مامور کیا گیا کہ وہ ان کوٹھوں پر جائیں اور اول تو ان کو معمولی قسم کی پھینٹی لگائیں اور اگر اصرار سے بھی مقابلے کا خطرہ ہو تو ان کی خدمت میں دس دس روپے کے نوٹ بطور رشوت پیش کئے جائیں..... صرف چند منٹ کے لئے وہ اپنا ہاتھ روک لیں تاکہ نوازش صاحب کی پتنگ ٹیک آف کر جائے..... اس کام پر مامور حضرات نے اس مٹی پر سے چھلانگ لگائی اور بازار کو چار منزلہ مٹی سے عبور کر کے ان کوٹھوں پر پہنچ گئے جہاں اناڑی حضرات کا قبضہ تھا..... تھوڑی سی گفتگو اور گھسن مٹی کے بعد تصفیہ ہو گیا اور نوازش صاحب کی پتنگ ٹیک آف کر کے پرواز کرنے لگی۔ اس مٹی پر صرف نوازش صاحب ہی سرگرم عمل نہیں تھے بلکہ دو تین دوست ذیلی پتنگیں بھی اڑا رہے تھے تاکہ بڑی پتنگ کے نزدیک آنے والے چھوٹے گڈے اور گڈیوں کو کاٹ دیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد نوازش صاحب کو میری موجودگی کا احساس ہوا۔

کنے لگے "اڑاؤ گے؟"

میں نے کہا "نہیں صرف دیکھوں گا۔"

"چھوڑ یا رہسنت کون سا روز رز آتی ہے..... یہ لو فوراً اسے پکڑو۔"

انہوں نے پتنگ کی ڈور میرے ہاتھ میں دے دی..... ڈور پکڑتے ہی مجھے ایک دھچکا سا لگا اور میں مٹی سے گرنا گرتا بچا۔ پتنگ بل فائننگ والے بھیسنے کی طرح منہ زور اور وحشی ہو رہی تھی۔ بار بار میرے قدم اکھڑتے اور نوازش صاحب

بے سہارا دیتے "اُوئے ڈھیل دو" میں ڈھیل دیتا تو وہ کہتے "اُوئے بس....." اسے اٹھا "میں اٹھاتا تو وہ مجھے اٹھانے لگتی۔

"بہت بہت شکریہ" میں نے ڈور نوازش صاحب کو تنہائی اور پھر مٹی پر دھک کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد وہ پھر سیر افلاک کو چلے گئے..... بہت دیر بعد واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران سے ہوئے "اُوئے تم کب آئے؟"

میں نے بتایا کہ بھئی بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔

کنے لگے "تو پھر بیٹھے کیوں ہو؟ کچھ کرو۔"

"کیا کروں" میں نے پوچھا "اس مٹی پر کھڑا تو میں نہیں ہوں گا۔ بیٹھ کر کیا کروں؟"

"بھونپو بجاؤ۔"

"بھونپو؟"

"ہاں ہاں یہ بگل..... جب میں کوئی پتنگ کاٹوں گا تم اسے بجانا....."

... ٹھیک ہے؟

"ٹھیک ہے" میں نے بگل سنبھال لیا۔

ہر طرف شور تھا جو شہر کے پرانے مکانوں عیسیوں اور کوٹھوں پر گونج رہا تھا اور تیز ہوا تھی۔

نوازش صاحب نے ایک دو رافتا وہ پتنگ کے ساتھ اپنی پتنگ کے ذریعے تھوڑی سی گفت و شنید کی اور پھر پیچا لڑا دیا..... اب ساری مٹی نے مشورے دینے شروع کر دیئے۔

"اُوئے اٹھا اسے..... اٹھا..... تنکا مار..... تنکا..... نہیں نہیں اب اسے یہیں رکھ..... نہ نہ بے ہوائی نہ کر..... ہوا میں رکھ....."

اس دوران نوازش صاحب کی انگلیوں سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے لیکن اس مرد میدان نے اٹ تک نہ کی۔ فرض کی ادائیگی میں مشغول رہا اور میدان میں ڈٹا رہا..... پتنگیں اتنی دور جا چکیں تھیں کہ ان کو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا بلکہ کچھ عرصہ نوازش صاحب کسی اور پتنگ کو اپنی سمجھ کر ڈھیل دیتے رہے..... یکدم نوازش صاحب چخنے "اوسے بو..... اوسے بو کاٹا" اور ممٹی پر موجود حضرات نے جگہ کی کمی کے باوجود ایک مخدوش سا بھنگا اڑالا۔

"یار بگل بجا" مجھے حکم ہوا۔

میں نے بگل میں بھونک ماری تو کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کوشش کی تو ایک ہلکی سی "شرز" ہوئی..... بالآخر جب متعدد کوششوں کے بعد بگل میں سے ایک "بھاں" کی آواز برآمد ہوئی تو نوازش صاحب کہنے لگے "یاراب نہ بھا..... ہماری بھی کٹ گئی ہے.....؟"

میں نے بگل زمین پر رکھا اور بیٹھ گیا..... اس کے بعد وہ پھر مگن ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ اپنی انگلیوں پر ٹیپ لگانے کے لئے رکے تو مجھے دیکھ کر پھر حیران ہوئے "یار تو کب آیا؟"

"میں صبح سے یہاں ہوں" میں نے عرض کیا۔

"ہاں ہاں..... یار آج کا دن مجھے معاف کر دینا..... تو بیٹھا کیوں ہے کچھ کر؟"

"کیا کروں؟"

"اس لکھنؤ کاٹ میں تناویں ڈال دے"

میں نے تناویں ڈال کر دیں۔ انہوں نے گڈے کے سینے پر انگلیاں رکھ کر اس کا بلیش دیکھا اور پھر ہوا میں لہرا کر بولے "یہ سُدھ نہیں ہے"

میں نے کہا "بے سُدھ ہے؟"
کہنے لگے "نہیں چھوڑ کر کوئی اور کام کر؟"
"کیا کام کروں؟"

"تو..... اس دیگ میں پلاؤ ہے..... تو بیٹھ کر پلاؤ کھا"
چنانچہ میں اس بلند مقام پر بیٹھا سا راون پلاؤ کھاتا رہا۔

اس برس ارادہ ہے کہ میں بھی دھوم دھام سے بسنت مناؤں گا بلکہ جس وقت آپ یہ کالم پڑھ رہے ہوں گے۔ اس لمحے میں اپنے کونٹے پر چڑھ کر پتنگیں اڑا رہا ہوں گا۔ البتہ ایک چھوٹی سی دشواری ہے ان دنوں بازار میں مختلف قسم کی پتنگیں فروخت ہو رہی ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بسنت کے لئے کونسی پتنگ منتخب کروں..... چند اقسام درج کر رہا ہوں آپ مشورہ دیجئے گا۔

سُدھ پتنگ..... یہ پتنگ بے حد شریف النفس قسم کی ہوتی ہے..... نشیات سے اجتناب کرتی ہے۔ اڑنے والا جلدھر چاہے اڑا سکتا ہے اور یہ اڑتی باقی ہے۔

بے سُدھ پتنگ..... نام سے ظاہر ہے کہ اس پر شرعی قوانین کا نفاذ ہو سکتا ہے اس لئے اس سے اجتناب برتا جائے۔

سیاسی پتنگ..... ان دنوں بہت مقبول ہے۔ لیکن کئی بہت کھاتی ہے..... دائیں ہاتھ مڑتی ہے تو مڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ بائیں جانب جانے لگے تو جاتی ہی چلی جاتی ہے..... کہنے پر آئے تو کشتی ہی چلی جاتی ہے..... البتہ اس کا ایک فائدہ ہے کہ اگر کٹ بھی جائے تو اڑانے والا یہی سمجھتا ہے کہ ابھی اڑ رہی ہے اور وہ خالی ہوا میں ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔

تازہ ترین ماڈل کے شتر مرغ

چند برس پیشتر میں صبح کی سیر کا "مریض" تھا میں اس مرض کے ہاتھوں لاچار تھا مجبور تھا اور اس کے آگے بے بس ہو چکا تھا منہ اندھیرے اٹھتا جو گر شوز اور ٹریک سوٹ پہنتا اور اچھلتا کودتا باغ جناح کی تازہ صبح میں داخل ہو جاتا... جس روز کسی مجبوری کے باعث سیر کو نہ جاسکتا اس روز میری حالت اس عادی ایفونی کی سی ہوتی جسے ایفون نہ ملی ہو میری اس عادت میں صبح کی سیر کے فوائد اور صحت بنانے کا کوئی عمل دخل نہ تھا بس میں مریض ہو چکا تھا یہ مرض کس طرح دور ہوا یہ الگ داستان ہے لیکن باغ جناح کی سیر کے دوران جہاں طرح طرح کے پرندے دیکھنے میں آتے وہاں مختلف قسم کے سیر کے مریض بھی دکھائی دیتے جو پرندوں سے کم دلچسپ نہ ہوتے تھے ان میں سے چند ایک کا تذکرہ اس کالم میں آچکا ہے بلکہ ایک مرتبہ جب میں نے باغ جناح میں دوڑتے ہوئے اور مسلسل دوڑتے ہوئے ایک صاحب کے بارے میں یہ لکھا کہ انہیں عرف عام میں بھنبیری کہا جاتا تھا کیونکہ ہم نے انہیں کبھی آرام سے سیر کرتے یا کہیں سستاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا تو اگلی صبح ایک فون آیا میں نے فون اٹھا کر پوچھا "جی کون صاحب بول رہے ہیں؟" "جی میں بھنبیری بول رہا ہوں" ادھر سے جواب آیا۔

"بھنبیری؟"

"جی ہاں..... دیے تو مجھے قریشی صاحب کہا جاتا ہے لیکن آپ نے

ایکشن پٹنگ..... ہر کوئی اسے خرید رہا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس ڈور کے کم از کم پچاس پنے موجود ہوں..... اس کی غولی یہ ہے کہ ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسے اڑانے کا اور اس کے حواری یہ کہتے ہیں کہ کہ جناب آپ کی پٹنگ اس وقت سب سے اونچی ہے..... جب کتنی ہے تو آپ کو بھی کاٹ کر جاتی ہے۔

چکری پٹنگ..... اس میں بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ ہوا میں جاتے ہی گھومنے لگتی ہے چکر کھاتی ہے اور اڑانے والے کو چکر دیتی ہے..... دیکھنے والوں کو چکر دے جاتی ہے۔ لیڈر حضرات میں بہت مقبول ہے۔ ڈسکو پٹنگ..... اس کے اڑنے کا انداز بے حد قابل اعتراض ہوتا ہے اور فحاشی کے زمرے میں آسکتا ہے اڑتی کم ہے منگتی زیادہ ہے..... کئی پٹنگ..... اسے آپ خرید نہیں سکتے لوٹ سکتے ہیں، طرح طرح کے دعوؤں سے پکڑ سکتے ہیں..... لیڈر حضرات اپنے بانس لئے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہیں..... یہ کچھ کچھ عوام الناس کی طرح ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بسنت پر مجھے کونسی پٹنگ اڑانی چاہیے؟

اپنے کالم میں ہمیں بھنبیری لکھ دیا ہے اس لئے ہم بھنبیری ہیں۔

ظاہر ہے میں بے حد شرمندہ ہوا لیکن بھنبیری صاحب میرا مطلب ہے قریشی صاحب کا ظرف ملاحظہ کیجئے کہ انہوں نے اس خطاب کا بالکل بڑا مانا بلکہ کالم کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا بہر حال باغ جناح میں گھومنے والے ان کرداروں میں سے ایک پہلوان محمد دین تھے جو چڑیا گھر کے پہلو میں واقع ایک ویران سبزہ زار میں دیکھے جاتے تھے ویران اس لئے کہ یہ علاقہ عام سیر کرنے والوں کی زد سے باہر تھا وہاں شاید باغ میں کام کرنے والے مالیوں کے گوارے تھے اور ان کے ساتھ گورنمنٹ کا لچ لاہور کا ہائٹی گارڈن تھا یہ گارڈن اب ختم ہو چکا ہے سوائے ایک دوسو کھے ہوئے تالابوں کے جن کے کنول اب بھی موسمِ برسات میں پھول دے جاتے ہیں میں اکثر اس پرائیویٹ باغ میں ورزش کیا کرتا تھا ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ ایک منحنی سا شخص ایک مرغ کے ساتھ سیر کر رہا ہے مرغ اصل قسم کا تھا اور گردن اگڑائے مڑ گشت کر رہا تھا ان صاحب کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جس کی مدد سے وہ مرغ کو سیر کروا رہے تھے مرغ ایک جگہ رکتا تو وہ چھڑی سے اسے چھوتے یا اس کا رخ موڑ دیتے یہ پہلوان محمد دین تھے ان دونوں کی تفصیل میں جانے سے پیشتر میں آپ کو وہ خبر سنائے دیتا ہوں جس کی وجہ سے آج پہلوان محمد دین اور ان کا مرغ میرے کالم میں آئے ہیں۔

”چینی صبح کی سیر پرندوں کے ساتھ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ہے خبر کا عنوان اور اس کی تفصیل کچھ یوں درج ہے کہ چین میں پالتو جانوروں کی بجائے پرندے پالنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے چین میں عام طور پر صبح کے وقت یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک ضعیف شخص ہاتھ میں پتھر لئے جا رہا ہے جس میں گانے والا ایک پرندہ

مقید ہوتا ہے اور یہ شخص صبح کی سیر کے لئے گھر سے نکلتا ہے چین میں اس طرح مختلف لوگ صبح کی سیر کے بعد یہ پتھر سانبھل کے پیچھے رکھ لیتے ہیں اور گھر چلے آتے ہیں ان پتھروں پر رنگ برنگے علاف چڑھے ہوتے ہیں بیجنگ کے ایک اخبار کا کہنا ہے کہ شہر کے سپاس ہزار افراد نے گانے والے پرندے رکھے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے اپنے شہر لاہور میں سینکڑوں برسوں سے لوگ پرندوں کے ساتھ سیر کرتے آئے ہیں لیکن اس کی خبر کہیں نہیں چھپی یہ بھی درست ہے کہ اہل لاہور کو زیادہ تربخشے ہوئے پرندے پسند ہیں لیکن کبوتروں اور تیروں سے ان کا لگاؤ تو ایک تاریخی حقیقت ہے بہر حال میں ان صاحب کو جو اپنے مرغ کو جناح باغ میں سیر کر رہے تھے روزانہ دیکھتا تھا ایک روز میں نے قریب جا کر زور سے ”اسلام علیکم“ کہا تو وہ چونک گئے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آہستہ بولنے کی تلقین کی اور پھر کہنے لگے ”آہستہ بولو میرا لکڑ ڈر جائے گا“

میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا ”یہ آپ کا لکڑ ہے؟“
کہنے لگے ”تمہارا خیال ہے کہ یہ اکیلا سیر کرنے آگیا ہے؟“ پھر وہ چھڑی کے ساتھ مرغ کے ساتھ چلنے لگے۔

اگلے روز پھر ملاقات ہو گئی بلکہ میں جان بوجھ کر ان کی پرائیویٹ سیر گاہ میں چلا گیا انہوں نے بتایا کہ ان کا نام پہلوان محمد دین ہے دبے پتلے ہونے کے باوجود پہلوان اس لئے ہیں کہ ان کا سادہ خاندان کسی زمانے میں پہلوانی کیا کرتا تھا اور سب کے ناموں کے ساتھ ”پہلوان“ کا لاحقہ بہت ضروری ہوتا تھا یوں وہ بھی پہلوان ہو گئے میں نے پوچھا کہ پہلوان جی یہ مرغ انہوں نے فوراً ٹوک دیا ”ناں ناں اسے مرغ نہ کہو یہ لکڑ ہے لکڑ۔۔۔ اور اس کا نام پھڑا ہے“

میں نے پوچھا کہ پہلوان جی یہ جو آپ کا لکڑ ہے آپ اس کے ساتھ سیر کو آتے ہو یا یہ آپ کے ساتھ سیر کو آتا ہے؟
وہ کہنے لگے "بادجی دراصل یہ بڑا نسلی لکڑ ہے چوک نواب صاحب ہیں اس کا راج ہے، مجال ہے کوئی لکڑ اس کے مقابلے پر آجائے لیکن پچھلے مہینے یہ بیمار ہو گیا آپ کو معلوم ہے آج کل ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے بس اس کے دانے پانی کا خیال نہ رکھا اور یہ کمزور ہو گیا مافی قصائی کے لکڑ کو دیکھ کر ذرا زورس ہو گیا میں اسی دن ڈنگر ڈاکٹر کے پاس لے گیا اس نے بتایا کہ خوراک ٹھیک رکھو اور صبح کو اسے سیر کرایا کرو تاکہ ذرا اس کا بدن کھل جائے.... اب دو مہینے ہو گئے ہیں اس کے ساتھ آتے ہوئے...."

"تو پھر کچھ فرق پڑا؟ میں نے پوچھا

"آہوجی" پہلوان خوش ہو کر بولے "اب تو طاقتوں میں ہے پر جناب بے حد شریف ہے مجال ہے کسی لکڑی کو دیکھ کر بانگ دے آنکھیں نیچی کر لیتا ہے.... میں پہلوان محمد دین اور ان کے لکڑ کو اکثر باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھتا ہوں دو دنوں غائب ہو گئے کچھ عرصہ بعد جب میں موچی دروازے کی طرف بھیجی ہوئی مونگ پھلی خریدنے گیا تو وہاں اتفاقاً پہلوان سے ملاقات ہو گئی میں نے پوچھا کہ ان دنوں آپ باغ میں دکھائی نہیں دیتے کیا بات ہے؟
پہلوان آزرده ہو کر بولے "بس اس نامانیم لکڑ نے بے عزتی خراب کر دی مافی قصائی کے لکڑ سے مار گیا"

"چلنے کوئی بات نہیں اگلی مرتبہ جیت جائے گا ہماری کرکٹ ٹیم بھی تو مار جاتی ہے" میں نے ان کا دل رکھنے کی خاطر کہا۔

"ناجی لکڑوں کی لڑائی میں کوئی اگلی مرتبہ نہیں ہوتی ایک مرتبہ جو لکڑ بار

جائے وہ دل چھوڑ جاتا ہے میدان کا.... ہوتا ہے میں نے تو جس دن وہ بار ہے اسی شام اس کے مرغ چھولے پکائے تھے پر جی خود نہیں کھائے بال بچوں کو کھلا دیئے تھے.... پہلوان محمد دین باقاعدہ آبدیدہ ہو گئے.... یہ ان کے ساتھ میری آخری ملاقات تھی۔

یوں تو جناح باغ میں کئی افراد پرندوں کے ساتھ سیر کے لئے آتے ہیں لیکن ان کا حوالہ یہاں نہیں آسکتا کیونکہ یہ "پرندے" دراصل پرندے نہیں ہوتے بلکہ انگریزی زبان کے "برڈ" ہوتے ہیں اور عام طور پر نوجوان ہوتے ہیں اور خوبصورت ہوتے ہیں۔

چین کی طرح اگر پاکستان میں بھی پرندوں کے ساتھ سیر کرنے کا رجحان عام ہو جائے تو ہم سوچ سکتے ہیں کہ صورت حال کیا ہوگی.... لوگ اپنے کبوتروں اور بیڑوں کے ساتھ باغوں میں آئیں گے بلکہ شہر کے دوسری جانب حضوری باغ میں تو ایسے لوگ اب بھی مل جائیں گے البتہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی مالی استطاعت کے مطابق اپنا پرندہ ساتھ لائے گا.... مثلاً عزیز غریب کے پاس کوئی چھوٹی موٹی چڑیا ہوگی جسے وہ مستحق میں دبا لے سیر کو نکلیں گے شاعر حضرات عام طور پر بلبوں کے ساتھ دیکھے جائیں گے اور اگر بلبیل سیر سپاٹے کی وجہ سے تنگ کر سوجائے تو وہ اس کے سر ہانے بیٹھ کر قریب سے گزرنے والوں سے درخواست کریں گے کہ میرا بلبیل سو رہا ہے شور و غل نہ مچا.... کچھ ایسے لوگ ہوں گے جن کی شخصیت کے حوالے سے گدھ مناسب ترین پرندہ ہوگا اور آہستہ آہستہ موٹر کاروں کی طرح پرندے بھی سیٹس سمبل میں شامل ہو جائیں گے اور مصلوں میں کچھ اس قسم کی گفتگو بھی سننے میں آئے گی۔

بھئی ناصر کو آج صبح دیکھا تھا؛ کتنے فاقہ زدہ قسم کے طوطے کے ساتھ سیر

مرغ مسٹر ٹوٹی

اگلے روز کسی مرغ یا مرغی کی تلاش میں پرندوں کے شہر ٹولنٹن مارکیٹ میں جان نکلا۔

ہر سو پرندے چپا رہے تھے۔ کبوتر مرغیوں، طوطے میں میں اسٹریلوی چڑیاں، چوں چوں..... مرغی کہ عجب دل بہا رہا تھا۔ ان مرغیوں میں کی چپا ہٹ میں اگر ایک خاص قسم کی بدبو نہ ہوتی تو گمان گذرتا کہ کسی ایرانی گلشن میں وارد ہو گئے ہیں۔ اس پر بہار منظر میں ایک مقتل بھی نظر آیا۔ جہاں مرغیاں "قتل" ہو رہی تھیں۔ کوئی صاحب بارات کے کھانے کے لئے گوشت خریدنے آئے تھے اور دو چار سو معصوم قسم کی مرغیوں کو ذبح کر رہے تھے۔ ذبح کرنے والے حضرات کے ہاتھ میں ایک طویل چھری تھی۔ وہ مرغی کو دبھتے، چھری اس کی گردن پر پھرتے، کبھی چلاتے کبھی رکھتے۔ اور پھر خون آلود پرندے کو ایک ڈرم کی طرف اچھال دیتے کبھی نشانہ خطا جاتا کہ مرغی ڈرم میں گرنے کی بجائے فٹ پاتھ پر جا گرتی یا دراکٹر اوقات بقیہ ماندہ جان بچانے کے لئے بھاگ اٹھتی۔ اس ہنگامی صورت حال کے لئے ایک آٹھ سالہ بچہ ہمہ وقت چوکس رہتا۔ اور مرغی کا گرم تعاقب کر کے اسے پکڑ لیتا اور ڈرم میں پھینک دیتا۔ ذبح کرنے والے حضرت سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ باتیں بھی کر رہے تھے اور فٹ پاتھ سے گزرنے والے حسین پہروں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ مرغی کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیتے یا خفیف سا زخمی کر کے اچھال دیتے۔ ظاہر ہے یہ سارا کام تمکیر کے بغیر ہو رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ اس

کر رہا تھا..... بھلے آدمی اگر تم کوئی اچھی اور مہنگی قسم کا پرندہ افورڈ نہیں کر سکتے تو کم از کم طوطے کی خوراک کا ہی خیال رکھا کرو؟

اور راشد صاحب ان دنوں بیروں کے ساتھ سیر کرتے ہیں.....
"میں نے تو انکل سے کہہ دیا تھا کہ امریکہ سے واپسی پر کوئی اچھا سا برڈ لیتے آنا وہ ایک نئی چچی جان لے آئے اور کہنے لگے یہ بھی برڈ ہے"
بھئی مرزا صاحب امیر آدمی ہیں ہر دوسرے سبھتے اپنا پرندہ بدل ڈالتے ہیں کہتے ہیں ماڈل پرانا ہو گیا ہے ان دنوں کو سنا پرندہ ہے ان کے پاس.....
"شتر مرغ"

"اچھا..... امپورنڈ ہو گا"

"ہاں شتر مرغ کا تازہ ترین ماڈل ہے جب اس کے ساتھ صبح کو میرے لئے نکلتے ہیں تو پوری دنیا دیکھتی ہے۔"

"سنا ہے شتر مرغ انڈے بھی دیتا ہے"

"بیوقوف شتر مرغ نہیں بلکہ شتر مرغی انڈے دیتی ہے....."

"بس جی پیسے کی بات ہے..... کبھی تو فینق ہوئی تو ہم بھی شتر مرغ سے کوئی بڑا پرندہ خریدیں گے اور اسے ساتھ لے کر مرزا صاحب کے گھر کے سامنے سے گزریں گے۔ میں بھی اسی سوچ میں ہوں کہ اگر کل کلاں پرندوں کے ساتھ سیر کرنے کا دلچ ہو گیا تو میں کونے پرندے کے ساتھ سیر کرنا پسند کروں گا صرف آؤ ذہن میں آتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے..... کہیں دیکھنے والے یہ نہ کہیں کہ دیکھو دو! تو سیر کو جا رہے ہیں۔"

طور ذبح کی ہوئی مرغی حلال ہوتی ہے یا نہیں..... اتنے میں چھری والے صاحب نے ایک مرغی کو بظاہر حلال کر کے ڈرم کی جانب پھینکا نشانہ چوک گیا۔ اور مرغی فٹ پاتھ پر دوڑنے لگی معلوم ہوا کہ گردن بالکل سلامت ہے۔ اور چھری صرف پروں کو کاٹ کر ہی اٹھ گئی تھی۔ چونکہ بالکل صحت مند اور نارمل مرغی تھی اس لئے ہمچہ اس کا تعاقب نہ کر سکا اور وہ خوش قسمت مال روڈ عبور کر کے انارکلی کی جانب چمپت ہو گئی وقتی طور پر اس کی گردن اور جان محفوظ تھیں لیکن مرغی بے چاری کو کیا پتہ کہ اس کی جان تو جانی ہی جانی ہے۔ پھری اسے خود بخود ڈھونڈ لے گی..... اس عارضی طور پر خوش قسمت مرغی کو دیکھ کر مجھے ایک سدا کا خوش نصیب مرغ مسٹر ٹی یاد آ گیا۔ زمانہ قدیم میں جب میں انگلستان میں رہائش پذیر تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چٹیاں ہوئیں تو میں تبدیلی آب و ہوا کی خاطر لندن سے مانچسٹر چلا گیا جہاں ڈور کے ایک عزیز عظمت صاحب ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتے تھے۔ اس بوسیدہ و کتورین ہاؤس کو بورڈنگ ہاؤس ہی کہنا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں رہائش پذیر پاکستانی اجتماعی طور پر کھانے پکاتے اور گھر کے فرشوں والوں اور ستوروں میں رات کو سوجاتے صبح ہوتی تو رات کی شفٹ پر کام کرنے والے واپس آتے اور انہیں بیدار کر کے ان کے گرم بتروں میں گھس جاتے۔ یہ پاکستانی مذہب کے بارے میں بے حد حساس تھے۔ بھول چوک ہو جاتی تو فوراً کانوں کو ہاتھ لگا کر شروع و خضوع کے ساتھ اللہ میاں سے معافی مانگ لیتے۔ البتہ ایک مسئلہ ایسا تھا کہ اس میں وہ کبھی بھول چوک نہ کرتے اور وہ تھا حلال گوشت کا مسئلہ۔ ستوروں میں بکنے والا گوشت ظاہر ہے جھکے کا ہوتا ہے اور یہودیوں کی کوثر گوشت کی دکانیں ان دنوں بہت کم تھیں چنانچہ چھٹی کے روز ان میں سے کوئی ایک دین پر سوار ہو کر شہر سے باہر کسی گاؤں میں جاتا اور چار پانچ درجن زندہ مرغیاں خرید کر لے آتا اب مسئلہ یہ تھا کہ ان مرغیوں کو کہاں

چھپایا جائے کیونکہ برطانوی قانون کے مطابق آپ کوئی بھی جانور بغیر لائسنس کے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے۔ اور اگر آپ اس کی جان بیٹے ہیں تو آپ پر جانوروں کی حفاظت کے قانون کے تحت مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان مرغیوں کو گھر کے تاریک تہہ خانے میں رکھا جاتا اور روزانہ ان میں سے چند ایک کو چوری چھپے حلال کر کے ان کے بال دپر زمین میں دفن کر دیئے جاتے۔ اس دوران کسی انگریز ہمسائے نے شکایت کر دی کہ ان ظالم پاکستانیوں نے اپنے تہ خانے میں مرغیوں کو قید کر رکھا ہے اور مزید یہ کہ ان بے چارے پرندوں کو قتل بھی کیا جاتا ہے۔ اس لئے تحقیق کی جائے۔

تحقیق کرنے کے لئے ایک نہایت مستعلیق قسم کے انگریز صاحب بہادر تشریف لائے۔ سیاہ قمیضیں پس سوت، باؤلر ہیٹ اور ہاتھ میں چھتری۔ تمام پاکستانی بھائیوں کی نظروں کے سامنے جیل کی سلاخیں گھوم گئیں۔ کیونکہ اگر ازام ثابت ہو جاتا تو وہ سب کے سب گرفتار کیے جاسکتے تھے۔ چنانچہ جل تو حلال تو کا شروع ہو گیا۔ انگریز صاحب نے تہ خانے کو اترتی ہوئی میسرھیوں کا دروازہ کھولا اور تحقیق کی خاطر نیچے اترنے لگے تہ خانے میں ظاہر ہے مکمل تاریکی تھی۔ سب حضرات بے حد پریشان تھے کہ صاحب ہماری مرغیاں ڈھونڈ لے گا اور ہمیں تھانے لے جائے گا اتنے میں تہ خانے میں سے ایک دلدوز چیخ سانی دی جو حیوانی بھی تھی اور انسانی بھی اور ساتھ ہی انگریز صاحب بہادر لرزتے اور مقدس دعاؤں کا ورد کرتے ہوئے گرتے پڑتے باہر آگئے ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے نکلے اور صرف اتنا کہا کہ مقدس مریم کی قسم اس تہ خانے میں کوئی بھوت براجمان ہے اور پھر وہاں سے ایسے بھاگے کہ اپنا چھاتا بھی بھول گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ تہ خانے کی آخری میسرھی پر ایک مرغ عموماً ستراحت تھا۔ جو نہی

گیوگی

یہ معراج پتھر کو ہو گیا گیا ہے، میں نے سوچا۔ وہ کئی روز سے میری دکان کی طرف بھی نہیں آیا تھا۔ معراج پتھر کا نسبت روڈیاس ہے۔ اپنا جگر تو نہیں البتہ جاننے والا ضرور ہے، جسم بہت پکا پیڈا نقد نکلتا دکھتا رہ گیا ہے۔ پیرا بن کر تہ اور چست پا جامہ اور چہرے پر قرون وسطی کے فرانسیسی بادشاہوں ایسی تراشی ہوئی دائمی، آواز میں ایسی کھرچ کا گرا انگریزی بول سکتا تو مشہور شیکسپیرین اداکار جان گلکو کو مات کر دیتا۔ ملان معراج بھی کہلاتا ہے اور گلی محلے میں اتنا رعب ہے کہ گواہ منڈی کے آس پاس رہنے کے باوجود ابھی تک معراج ہے ساجھا نہیں بنا۔ پتھر کی ایسی پہچان رکھتا ہے کہ جو ہر حضرات اس کے پاؤں چھوتے ہیں اور یہی اس کا پیشہ ہے۔ مہینے میں ایک آدم مرتبہ کسی میلے ٹیبلے میں جائے گا۔ ایک چکر لگائے گا اور وہاں پر لگی دکانوں میں سے نگ اور پتھر خریدتا جائے گا۔ دوسرا چکر لگائے گا اور وہی پتھر دگنے داجون پر انہی دکانداروں کے ہاتھ فروخت کر آئے گا۔ پہلے پھیرے پر وہ ایک اجڈ اور جاہل خریدار ہو گا اور دوسرے

نولنٹن مارکیٹ سے فرار ہوتی ہوئی مرغی کو دیکھ کر مجھے مسٹر ٹوٹی یاد آ گیا تھا اور میں نے اس کی یاد کے احترام میں اس روز مرغ یا مرغی کھانے کا فیصلہ ترک کر دیا اور خالی ہاتھ گھر واپس آ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر ٹوٹی کی روح مجھ سے بہت خوش ہوگی۔

پھیرے پر وہ انہی دکانداروں کو تہائے گاہے میاں یہ پتھر فلاں ہے اور یہ نگ اتنی قیمت کا ہے جو تم نے پہچان نہ ہونے کی بنا پر ابھی ابھی میرے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔ بتاؤ اب کیا دام دیتے ہو۔ چنانچہ معراج پتھر ایک ماہ میں صرف ایک مرتبہ باہر نکلتا ہے اور اپنی پتھر شناسی کی بدولت پورے مہینے کا خرچ جیب میں ڈال کر گھر واپس آجاتا ہے۔ باقی سارا مہینہ وہ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو میں کرتا ہے "مشرق کے دفتر کے پہلو میں واقع ہوٹل میں چائے پیتا ہے اور آپ کسی بھی موضوع کو چھیڑ دیں وہ بیٹے پر مکا مار کر کہتا ہے "ایہہ سا ہنوں بچھو" ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ معراج پتھر گوالمنڈی کی ایک گلی میں سے نمودار ہوا، اپنے کھٹارا موٹر سائیکل کو روک کر بڑی احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر جلدی سے سڑک پار کر کے سامنے والی گلی میں گھس گیا.... یہ معراج پتھر کو ہو کیا گیا ہے، میں نے سوچا۔

ایک روز میں گوالمنڈی چوک میں سے گذر رہا تھا کہ معراج پتھر حسب معمول ایک گلی میں سے نکلا، لیکن سیدھا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا "بادشاہ آج پیدل ہو" میں نے کہا "موٹر سائیکل بھر پتھر ہو گیا ہے" کہنے لگا "بیٹھو فٹاٹ" میں بیٹھ گیا میں نے لوہاری جانا تھا اس نے پہلے موٹر سائیکل کو کرشنا گلی کی بھول جلیوں میں ڈالا اور پھر لمحہ بھر کے لئے بڑی سڑک پر آیا اور پھر ایک دم شراب سے گوردار جن نگر کی ایک گلی میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوہاری چوک میں نکلتی ہوئی ایک گلی میں تھے اس نے مجھے اتارا اور نزدیک ترین گلی میں روپوش ہو گیا یہ معراج پتھر کو ہو کیا گیا ہے، میں نے سوچا۔

میرا موٹر سائیکل بدستور پتھر تھا اور میں شہر آنے کے لئے بس سٹاپ پر کھڑا رہا تھا۔ اتنی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ معراج پتھر نہر کے کنارے ایک چھوٹے سے راستے میں سے نکلتا ہے اور میرے پاس آجاتا ہے "شہر جانا ہے تاڑڑ صاحب"۔

میں پھر اس کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اس نے موٹر سائیکل ظفر علی روڈ پر ڈالا، مال پر آنے کی بجائے ہوٹل انٹرنیشنل کے پہلو میں سے نکل کر جانے کوئی آبادی میں آگیا۔ پھر وہی گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہیں میں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا، ایک طویل سفر کے بعد اس نے مجھے نسبت روڈ کے چوک میں لاتا مارا.... وہ حسب عادت موٹر سائیکل سے اتر کر مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں اسے اسی عالم بغلیگری میں کھینچتا ہوا سامنے کے ہوٹل میں لے گیا "یاد تازہ صاحب جانے دو مجھے بہت ضروری کام ہیں" میں نے کہا "نہیں معراج آج نہیں جانے دوں گا۔ مجھے بتاؤ کہ یہ اتنے مشکوک سے کیوں ہوئے جا رہے ہو بڑی سڑکیں اور شاہراہیں چھوڑ کر گلیوں اور تنگ راستوں میں موٹر سائیکل کیوں چلاتے ہو؟"

معراج کھسیا نہ سا ہو کر، ولہ، یار میں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیوں؟

کہنے لگا "بھائی میرے ہر سیدھے راستے پر پولیس کھڑی ہے۔ ریڈیں لگی ہوئی ہیں چیکنگ ہو رہی ہے، میرے پاس کاغذات بھی مکمل ہیں لیکن اتنا وقت نہیں کہہ پانچ منٹ کے بعد پیشی جگھتا پھروں اور خواہ مخواہ خبرم مسوس کروں...."

میں نے اسے بہت لعن طعن کی کہ معراج پتھر یہ بہت غلط بات ہے۔ انسان کو ہمیشہ سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے چاہے اسے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ کہنے لگا، تم بڑے کئے ادیب لوگ ہو تم چلو سیدھے راستے پر، میں تو گلیوں کی سی چلوں گا۔ کاغذات مکمل ہوں تو بھی چیکنگ والے کوئی نہ کوئی دفعہ دور لگا دیتے ہیں، کوئی نہ کوئی غلطی نکال لیتے ہیں کہ نمبر پلیٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔ انڈی کیٹر نہیں چل رہا وغیرہ وغیرہ.... معراج پتھر نے چائے ختم کی، موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور ایک گلی میں روپوش ہو گیا اس پر میرے یکپہر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا.... ہمارے معاشرے

کالے کبوتر سفید کبوتر

جہاں میں بیٹھا ہوں۔ اس عمارت کی چھت کے شہیروں میں کالے کبوتر بٹے ہیں اور کبوتر چاہے کالے ہوں یا سفید وہ بیٹ ضرور کرتے ہیں اور یہ بیٹ ہر آدمہ پون گھنٹے کے بعد چھپک سے میرے کوٹ یا سویٹر پر برس پڑتی ہے کبھی سر کے بالوں میں نمی کا احساس ہوا ہے تو بالوں پر ہاتھ پھیرنے سے انکشاف ہوتا ہے کہ وہاں بھی کبوتر کریم کا ایک لیپ موجود ہے ہر حملے کے بعد میں اپنی پوزیشن بدل لیتا ہوں۔ لیکن معینہ وقفے کے بعد بیٹ مجھے تلاش کر کے میرے اوپر آن گرتی ہے ان کالے کبوتروں کی وجہ سے میری گھریلو زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ خاتون خانہ میرے کپڑوں کو برش کرتی ہے۔ پانی میں بھگو کر صاف کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر تیزابی بیٹ کے اثرات نمایاں نظر آتے رہتے ہیں اور وہ تنگ آکر کہتی ہے کہ تم خاص طور پر ایسی جگہ ہی کیوں بیٹھتے ہو جہاں تمہارے سر کے عین اوپر ایک عدد کبوتر اس لمحے میں معلق ہو جب اس نے ہر صورت بیٹ کرنی ہوتی ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ اسے نیک بخت میں جس جگہ بھی بیٹھتا ہوں وہاں پر یہی حشر ہوتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ صرف میری نالائقی کی وجہ سے ہوتا ہے چنانچہ ایک روز وہ کافی دیر تک اس جگہ پر بیٹھی رہی۔ جہاں عام حالات میں مجھ پر ہر بیس منٹ کے بعد ایک بیٹ وار دھو جاتی ہے مگر اس روز میں نے اوپر دیکھا تو تمام شہیر خالی تھے پتہ نہیں وہ کبوتر کہاں چلے گئے۔ بہر حال میری خاتون خانہ کا یہ واسطہ تقویت پکڑ

میں صرف معراج پتھر ہی نہیں جس نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے اور ”گلیوگلی“ سفر کرتا ہے بلکہ اس فہرست میں تو افسر ملازم۔ دکاندار۔ دانشور۔ ادیب اور دولت مند طبقہ بھی شامل ہے جو چینگ کے غوث سے بڑی شاہراہوں کو چھوڑ کر چھوٹے راستوں پر چل نکلا ہے۔ کچھ کے پاس تو پورے ”کافذات“ ہیں لیکن بیشتر بغیر رجسٹریشن کے ہیں اور ڈرائیونگ لائسنس کی غیر موجودگی میں بھی اپنی اپنی سواریوں پر دندناتے پھرتے ہیں بہر حال میں چونکہ معراج پتھر کی طرح بزدل نہیں تھا اور سیدھے راستے پر چلنے کا خواہش مند تھا اس لئے جس روز میرا موٹر سائیکل ٹھیک ہوا میں اسے شارٹ کر کے بڑے اطمینان سے جیل روڈ پر جا رہا تھا کہ روک لیا گیا۔ ایک دوٹرینک سار جنت سپاہی اور بے شمار موٹر سائیکلین، پریشان چہرے اور سیاہ ہوتی ہوئی چالان کاپیاں میرے کافذات تقریباً مکمل تھے۔ البتہ سپاہی کو میرا نام لکھنے میں خود شکاری پیش آئی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال بڑی مشکل سے جان چھوٹی اور جتنی دیر میں جان چھوٹی اتنی دیر میں میرے بچوں کو سکول سے چھٹی ہو چکی تھی اور وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں بھوکے پیاسے فٹ پاتھ پر بیٹھے میری راہ تک رہے تھے۔۔۔۔۔ شام کو شہر سے گھر کی جانب چلا تو جیل روڈ پر ہی ایک اور مورچے کا سامنا ہو گیا۔ عرض کیا کہ کافذات چیک ہو چکے ہیں لیکن۔۔۔۔۔ جتنی دیر میں یہاں سے جان چھوٹی اتنی دیر میں وہ کباب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ جو میں رات کے کھانے کے لئے گھر لے جا رہا تھا مجھے تو پھر بھی مختلف حوالوں سے لوگ پہچان جاتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا جو بالکل بے نام ہیں، عام لوگ ہیں؟

اگلے روز میں اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہوا اور جیل روڈ، مال روڈ کے سیدھے راستے چھوڑ کر معراج پتھر کے دریا منت کردہ پوشیدہ راستوں پر چل نکلا اور ”گلیوگلی“ ہو گیا اللہ بھلا کرے معراج پتھر کا جس نے مجھے یہ سیدھا راستہ دکھایا۔

گیا ہے کہ یہ بیت بزنس صرف میری نالائق کی وجہ سے مجھ پر برستا ہے۔ تب میں نے ان کبوتروں سے گلو خلاصی کروانے کے لئے چند ہنگامی نوعیت کی تدابیر سوچیں سب سے پہلے تو میں نے ردی کاغذ کے گیند بنا کر ان کی آماجگا ہوں کی جانب پھینکے اور اس روز مجھے معلوم ہوا کہ پتھر پھینکا کتنا آسان کام ہے اور کاغذ کی گیندیں پھینکا کتنا مشکل شاید میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور دیگر زردوں کے علاوہ میرا زور بازو بھی کم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ بیشتر گیندیں ہدف پر پہنچنے کی بجائے میرے چہرے پر آکر گر گئیں تھوڑی دیر کی مشق کے بعد چند گیندیں کبوتروں کو لگیں لیکن وہ پر پھیلا کر پھر پھٹنے لگیں اور وہیں بیٹھے رہے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ کسی بچے کی شاٹ گن مانگ کر ان بدبختوں کو ہلاک کر دیا جائے لیکن میں چونکہ مرقم کی غریزی کے خلاف ہوں اس لئے اس مشورے پر عمل کرنے کی ہمت نہ کر سکا اب حالت یہ ہو گئی کہ میں ہمہ وقت ان کالے کبوتروں سے جھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچتا رہتا دوستانہ کے ساتھ بھی کبوتروں کے بارے میں ہی گفتگو کرتا اور گھر میں توغا ہر ہے یہی موضوع زیر بحث رہتا کیونکہ میرے کوٹ اور سویٹر اب باقاعدہ سفید ہوتے چلے جا رہے تھے ایک اور دوست نے کہا کہ وہ ان کالے کبوتروں کا قلع قمع کر دے گا میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیسے کریں گے؟ وہ کہنے لگا میں ان کو کھا جاؤں گا۔ میں نے کہا سو بہم اللہ کھا جائے۔ اس نے کہا کھاؤں گیسیس؛ تم پکڑ کر دے دو میں کھا لوں گا..... بہ بیگے کے سر پر موم رکھ کر اسے پکڑنے والی بات تھی۔ اس لئے اس پر بھی عمل نہ ہو سکا۔

انہی دنوں ایک شام نسبت روڈ کے چوک میں معراج پتھر سے ملاقات ہو گئی وہ صبح کی بنہاری کو شام کے وقت کھا رہا تھا اور اس کا چہرہ مرحوں کی تیزی کے باعث سرخ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا: "تا رخص صاحب مرزا گیا؟"

پچھلی شب میرا کھانا ہوا ایک ڈرامہ ٹیلی ویژن پر چلا تھا اس نے میں نے سوچا کہ معراج پتھر اس کی تعریف کر رہا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا اچھا تھا؟

کہنے لگا: اچھی ہے؟

میں نے کہا کون؟

کہنے لگا: ”یہی ہنہاری جو میں کھار رہا ہوں صرف مرچیں کم ہیں۔“

اس کے بعد معراج پتھر نے ایک طویل لیکچر میں مجھے بتایا کہ نہاری کے اہل
ترکیبی کیا ہوتے ہیں اسے کس طرح پکایا جاتا ہے اور اس کے کھانے کے بعد اگلی
صبح کھانے والے کو کیا کیا "مشکلات" پیش آتی ہیں اور اگر دیگ میں ایک دو کبوتر بھی
ڈال دیئے جاتے تو کتنی مزیدار ہو سکتی ہے کیوتروں کے نام پر میں چونکا اور معراج پتھر
کا بازو پکڑ لیا۔ "یار معراج ایک دو نہیں دو جنوں کبوتر میرے پاس ہیں میرا مطلب
ہے شہتیروں میں بیٹھے ہیں خدا کے لئے تم ان کو پکڑ کر ان کی نہاری پکالو"
اس پر وہ قدرے حیران ہوا اور مجھ سے تفصیل اس اجمال کی پوچھی جو میں
نے بیان کر دی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہنے لگا کبوتر کالے ہیں ناں؟ میں نے
کہا بالکل۔ تقریباً میرے رنگ کے۔

وہ بولا: پھر تو باقاعدہ کالے سیاہ ہوئے۔ آپ جناب ایسا کریں کہ کہیں سے سفید کبوتروں کے انڈے حاصل کریں۔ انڈے صرف سفید کبوتروں کے ہونے چاہئیں پھر ان انڈوں کو ان شہتیروں کے درمیان رکھ دیں۔ جہاں یہ کالے کبوتر رہتے ہیں..... کبوتران انڈوں پر بیٹھ جائیں گے اور جب ان میں سے بچے نکلیں گے تو وہ سفید ہوں گے۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا معراج پتھر میں ان کبوتروں کو شتم کرنا چاہتا ہوں اور تم ان کی افزائش نسل کی ترکیبیں بتا رہے ہو.....

معراج پتھر ہوا۔ بادشاہ ہنستے جاؤ۔ جو بھی انڈوں میں سے سفید بچے نکلیں گے کالے کبوتران کو دیکھ کر اتنے ہراساں ہوں گے کہ فوراً اس جگہ سے ہمیشہ کے لئے

چلے جائیں گے۔ ہمارے چچا کبوتر باز کا نسخہ ہے بے شک آزمالو۔

اب میں سوچ میں ہوں کہ سفید کبوتروں کے انڈے کہاں سے حاصل کروں۔ یہ نہ ہو کہ وہ کالے کبوتروں کے ہی ہوں انڈے کے اندر جھانک کر تو دیکھا نہیں جاسکتا۔ ویسے عجیب بات ہے کہ کالے کبوتر محنت کر کے وقت ضائع کرتے ہیں اور انڈوں پر بیٹھتے ہیں اور اگر ان میں سے سفید بچے نکل آئیں تو انہیں دیکھ کر جھاگ جاتے ہیں حالانکہ دنیا کی ترقی پذیر اقوام میں تو ایسے کالے کبوتر ہیں جو محنت کرتے ہیں۔ مشقت کرتے ہیں اور جب بچے نکلتے ہیں تو وہ سفید ہوتے ہیں اور انہیں ترقی یافتہ اقوام اپنے ہم نسل قرار دے کر لے جاتے ہیں۔ کالے کبوتروں کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے انڈوں پر ہی بیٹھا کریں۔

بائی پاس کے آس پاس

”تمہارے دل کا کیا حال ہے؟“

”دھڑکتا ہے۔“

”کس کو دیکھ کر؟“

”ڈاکٹر کے بل کو دیکھ کر۔“

”یار فرقان امراض قلب کے اس ڈاکٹر کے بارے میں پڑھا ہے جو اپنی تمام

آمدنی اپنے ہسپتال کے مریضوں پر خرچ کر دیتا ہے؟“

”اور پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ پاکستانی ڈاکٹر سبھی انسانیت کو دکھی بنارہے ہیں۔“

”وہ ڈاکٹر پاکستانی نہیں ہے انگلستان کے ایک امراض قلب کے خصوصی ہسپتال

کا ڈاکٹر ہے۔“

”گویا انگریز ہوا۔“

”ہاں۔“

”بس یہ کافر لوگ اسی قسم کی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں..... پہلے بھی

کرتے تھے، اب بھی کرتے ہیں۔“

”پہلے بھی کرتے تھے؟“

”اور کیا؟..... لاہور کے سارے بڑے ہسپتال دیکھ لو انہی کافر لوگوں کے ہاتھ

ہوئے ہیں۔ گلاب دیوی، گنگا رام، جاکھی دیوی، لیڈی ولنگٹن، میو ہسپتال وغیرہ۔“

”لیکن بھائی یرقان یہ ہم مسلمانوں کے لئے شرم کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو عنایات کر رکھی ہیں ہم شکرانے کے طور پر ان عنایات کا کچھ حصہ بیماروں اور لاچاروں کے لئے نہ وقف کر دیں؟“

”بھائی فرقان تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہم لوگ ہسپتال نہیں بنواتے.... ذرا گھبراؤ، شادمان اور جیل روڈ پر ابھرتے ہوئے جدید ترین کلنک بھی تو دیکھو۔ کیا ایر کنڈیشننگ ہے۔ کیا سائز و سافٹن ہے؟“

”بھائی یرقان وہاں مفت علاج ہوتا ہے؟“

”حماقت کی باتیں مت کیا کرو بھائی فرقان۔ ان کلنکوں میں تازہ ترین درآمدی مشینیں نصب ہوتی ہیں، سپیشلسٹ حضرات کی فوجیں ہوتی ہیں۔ نرسیں ہوتی ہیں۔ اب بوشنس اتنی لمبی چوڑی انوسٹمنٹ کرے گا وہ کچھ کمائے گا بھی، خالی جیب تو گھر نہیں جائے گا۔“

”یعنی کلنک کھولنا بھی انڈسٹری لگانے کے مترادف ہے؟“

”اس سے کہیں زیادہ منافع بخش..... میرے ایک دوست کی انگلی پرچوٹ آگئی وہ ایک ایسے ہی کلنک میں جانکلا۔ انگلی کا بڑا تفصیلی معائنہ کیا گیا اور پھر پٹی باندھ دی گئی۔ اور تمہیں پتہ ہے بل کیا تھا؟ صرف ساڑھے چار سو روپے.....“

”ہاں زیادہ تو نہیں ہے۔ انگلی اگر سپٹیک ہو جاتی تو جان کا خطرہ تھا۔ یوں سمجھو کہ ساڑھے چار سو روپے میں جان بچ گئی۔ مہنگا سودا تو نہیں ہے۔“

”پھر بھی یرقان بھائی آپ جیسے لوگ جو ماشائے اللہ کروڑوں میں کھیلتے ہیں کیا کھیلتے ہیں۔ اس کا مجھے علم نہیں لیکن کیسے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ غریب غرباء اور مدلل کلاس لوگوں کے لئے گنگا رام جتنا ہی ایک ہسپتال بنوادیں؟“

”جی ہاں یہ حکومتوں کا کام ہے ہم اس میں دخل اندازی نہیں کرتے.....“

”کیوں حکومتوں کا کیوں کام ہے؟“

”ہم انہیں ٹیکس جو دے دیتے ہیں۔ بنوائی پھر ہسپتال وغیرہ.....؟“

”ہاں“

”ایمان سے کہتے ہو“

”یار فرقان اتنی چھوٹی سی بات کے لئے ایمان کو بیچ میں مت لاؤ..... اور پھر ہم لوگوں کے خرچے بھی تو بہت ہیں.....؟“

”کم کر دو خرچے“

”جاپان والے کم نہیں کرنے دیتے“

”جاپان والے؟“

”ہاں کم بخت ہر دوسرے روز ایسا ایسا شاندار ماڈل بنا کر بھیج دیتے ہیں کہ پہلی کاریں چھوڑ کر نئے ماڈل والی خریدنا پڑتی ہیں۔ خرچ کیسے کم ہوں اور پھر ہمارے علاج معالجے کا خرچ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے اور امریکہ جاکر ایک بائی پاس آپریشن کرواؤ تو پانچ چھ لاکھ نکل جاتے ہیں۔“

”بھائی یرقان اگر عام آدمی یعنی کسی چھوٹے موٹے افسر، ادیب، صحافی یا کم آمدن والے شخص کو اس قسم کی خطرناک بیماری لگ جائے تو وہ کیا کرتا ہے؟“

”انہیں ایسی بیماری لگتی ہی نہیں؟“

”کیوں؟“

”بھئی نہ وہ سپیشلسٹ کے پاس جاتے ہیں۔ کیونکہ جیب میں رقم نہیں ہوتی۔ نہ ہی ٹیٹ وغیرہ کروا سکتے ہیں اس لئے انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کو کیا بیماری ہے چنانچہ مزے سے آرام سے فوت جاتے ہیں..... میں بھی اگلے ماہ امریکہ جا رہا ہوں۔“

گلشیر پگھلانے کا صحیح طریقہ

ہمارے بیشتر گلوکار بے حد بیجے اور سادہ دل ہوتے ہیں انہیں پوچھنے کہ آپ نے گلوکاری کب شروع کی تو جواب ملے گا۔ جی بچپن سے ہی شوق تھا گھر میں بھی ماحول تھا والد اور والدہ صاحبہ نے حوصلہ افزائی کی اور پھر جی پبلک نے پسند کیا تو اللہ کے فضل سے یہ مقام مل گیا..... البتہ ہمارے کچھ گلوکار ایسے ہیں جو گانے کے علاوہ گنگو بھی اچھی کرتے ہیں اور ان میں ریشماں، عطار اللہ عیسیٰ خیلوی، مہدی حسن نور بہاں وغیرہ شامل ہیں۔

ٹیلی ویژن پر موسیقی کے ایک پروگرام کی میزبانی کے دوران جب میں نے مہدی حسن صاحب سے ان کے "گلاس توڑ" بیان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے وہ بیان سینے پر ہاتھ رکھ کر دہرایا ان کا کہنا تھا کہ اگر آواز ایک خاص فریکوئنسی پر لگائی جائے تو ہوا میں ارتعاش کی وجہ سے گلاس ٹوٹ جاتا ہے میں نے عرض کیا کہ پھر یہ کمال تو کوئی بھی کر سکتا ہے اس میں گلوکار یا اعلیٰ درجہ کا گلوکار ہونا تو شرط نہیں اس پر انہوں نے فرمایا کہ آواز اگر سر میں نہیں ہوگی تو ہوا میں ارتعاش پیدا نہیں ہوگا حالانکہ کئی عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ سلطان راہی کی بڑھک اور مصطفیٰ قریشی کی گرج سے سینا گھروں کے شیشے ٹوٹتے انہوں نے خود دیکھے ہیں مہدی حسن صاحب نے کچھ ایسے واقعات بھی سنائے کہ بارش نہیں ہو رہی تھی اور کسی استاد نے تان لگا کر رم جھم رم جھم پڑے پھوار کر دی اسی پروگرام کے دوران ثریا ملتانیکر نے بتایا کہ ان کے ایک بزرگ جو ماہی بادل کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے ایسے گنتی تھے کہ جب

کیا کرنے؟

بائی پاس سرجری کروانے

لیکن بھائی یرقان آپ تو ماشاء اللہ بالکل صحت مند ہیں..... آپ دل

کے مریض تو نہیں؟

"اگر میں دل کا مریض نہیں ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں بائی پاس سرجری کے لئے امریکہ نہ جاؤں..... بھائی میرے ان دنوں جو شخص بھی امریکہ یا یورپ جا کر بائی پاس سرجری نہیں کروانا اسے نکل اور چپڑ کنا تیا سمجھا جاتا ہے میرے تقریباً سبھی جاننے والے یہ آپریشن کروا چکے ہیں اور بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہم بائی پاس کروا کے آئے ہیں سچ پوچھو تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے چنانچہ اب میں نے اعلان کر دیا ہے کہ صاحبو میں بھی بائی پاس کروانے جا رہا ہوں وہاں جا کر کسی پریوینٹ کانک میں داخل ہو کر چند ہفتے آرام کریں گے۔ دو چار لاکھ کی کیا بات ہے۔ ذرا شغل رہے گا۔"

کبھی ملتان میں بارش نہیں ہوتی تھی تو پبلک ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرتی تھی کچھ کیجئے۔ اور جب وہ گاتے تھے تو بادل آجاتے تھے ظاہر ہے موصوف کو ملتان میں رہتے ہوئے تو دن رات گانا پڑتا ہوگا.....

ہمارے گلوکار ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ جی پبلک کی مہربانی سے..... جی پبلک نے پسند کیا تو..... جی ہم تو پبلک کے خادم ہیں..... تو جناب اب پبلک نے انہیں ایک چھوٹی سی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق پبلک نے گلوکاروں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بارش کے لئے پکے راگ گائیں تاکہ دریائوں میں پانی کی قلت دور ہو اور لوڈ شیڈنگ سے نجات ملے اور اس کے علاوہ یہ پہاڑوں پر جا کر ویک راگ گائیں تاکہ حرارت سے گیٹھیر گھل جائیں چنانچہ اب یہ ہمارے گلوکاروں کا فرض ہے کہ وہ طبلے سرنگیاں اٹھائیں اور پہاڑوں پر چڑھ کر ویک راگ کا الپ شروع کر دیں۔ درست راگ کے چناؤ کے لئے وہ بے شک اپنے ایوب رومانی صاحب کو بھی ساتھ لے جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تمہارے حسن کارکردگی حاصل کرنے والے گلوکاروں کو اس معاملے میں مہل کرنی چاہیے۔ شنید ہے کہ پکے راگ سن کر گیٹھیر پاش پاش ہو جاتے ہیں گیٹھیر کیا ہم نے ایک محفل میں پکارا راگ سن کر ایک صاحب کو دھڑیں مار مار کر روتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور بعد ازاں بے ہوش ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے بھلا گیٹھیر کی کیا مجال کہ نہ گھلے۔

امید ہے کہ ہمارے گلوکار اس قومی فریضے سے پہلو تہی نہیں کریں گے بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ پاکستان کے تمام ”فنکاروں“ کو یہ موقع ملنا چاہیے اور پاکستان میں بڑا بڑا ”فنکار“ پڑا ہے۔ گیٹھیر گھلنے کا صحیح طریقہ صرف یہی نہیں ہے کہ پکے راگ گانے والوں کو ہمیشہ کے لئے پہاڑوں پر بھیج دیا جائے بلکہ کچھ اور لوگ

بھی یہی کام بطریق احسن کر سکتے ہیں..... مثلاً۔

ہمارے ہاں شعلہ بیاں مقررین کی بہتات ہے چند ایک کو کسی گیٹھیر پر کھڑا کر کے کہہ دیا جائے کہ بھائی صاحب ایک دو تین..... شروع ہو جائے۔ کچھ شام ہوتے ہیں جو شاعری سے قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور کچھ آگ لگا دیتے ہیں بس یہ آگ لگانے والے کچھ حضرات کو بھی پہاڑوں پر بھیج دیا جائے اور جی بانو اور عظمیٰ گیلانی سے درخواست کی جائے کہ وہ کسی گیٹھیر کو سٹیج سمجھ کر اس پر المیہ اداکاری شروع کر دیں تاکہ گیٹھیر آبدیدہ ہو جائے اور ہر جانب آب ہی آب ہو جائے۔

ادیب حضرات وہاں جا کر چند ایک انشائیے اور جدید افسانے گیٹھیروں کو سنائیں ان کی مجال ہے نہ گھلے۔

سلطان راہی لاچا باندھ کر وہاں کھڑے ہو جائیں اور ایک زوردار آواز میں آگیا آں ”کانرہ لگانیں اور مصطفیٰ قریشی آرام سے گیٹھیر کے کان میں جا کر کہیں ”زرا آیاں ایں سو ہنیا“..... گیٹھیر تھرتھر کانپنے لگے گا اور گھل جائے گا۔ تو یہ ہیں گیٹھیر کو گھلانے کے صحیح طریقے۔

اپنے کارپوریشن والوں کو امپورٹ کر لینا چاہیے۔ مسئلہ صرف یہ ہوگا کہ ایک عدلیہ کون کون کینا گری کے تحت درآمد کیا جائے تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ اسے ان ملکوں کے ساتھ ہی امپورٹ کر لیا جائے جن کا آرڈر بھجوا دیا جا چکا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لاہور شہر کے گلی کوچوں میں محو خرام اور محو ہادی ہزاروں بھینسوں کی موجودگی میں ایک اور بھینس کا کارپوریشن کیا کرے گی؟ اس کا جواب بھی بہت آسان ہے کہ جناب یہ بھینس کارپوریشن کی پیاری اور چہیتی بھینسوں سے بہت مختلف ہے یعنی بولتی ہے، گفتگو کرتی ہے اس جواب سے ایک اور سوال پیدا ہوگا کہ آخر کارپوریشن ایک چرب زبان بھینس کا کرے گی کیا۔ میں عرض کرتا ہوں دیکھئے اس وقت شہر میں مقیم بھینسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور انہیں سوائے لوگوں کو غمی کرنے کے، سکوتر اور ریڑھیاں اٹانے کے سڑکوں پر گندگی پھیلانے کے اور کوئی حقوق حاصل نہیں۔ آخر تو وہ بھی لاہور شہر کی "باشندیاں" ہیں انہیں بھی کچھ شہری حقوق ملنے چاہئیں۔ ان کی بھی کوئی آواز ہونی چاہیے اور یہ "آواز" اس فلیپائن سے درآمد شدہ بھینس کی ہوگی جو نہ صرف یہ کہ منہ میں زبان رکھتی ہے بلکہ اس زبان کو چلا بھی سکتی ہے۔ چنانچہ کارپوریشن اس بھینس کو لاہور شہر میں دندانی بھینسوں کی نمائندہ کے طور پر نامزد کر دے (کیونکہ بھینسیں دوت نہیں ڈال سکتیں) اور اسے اپنے ایوان میں جگہ دے کر یہ ثابت کر دے کہ لاہور میں مقیم تمام انسانوں اور جانوروں کی نمائندگی کی جا رہی ہے۔..... بھینسوں سے ہم گدھوں کے میلے تک آتے ہیں جو بھارت میں بڑی دھوم دھام سے لگا یا گیا گدھوں سے بات کنواروں تک پہنچتی ہے جن کا ایک میلہ آئرلینڈ میں منعقد کیا گیا یعنی جس ملک میں جس چیز کی بہتات ہوتی ہے اسی کے میلے ملتے ہیں۔ ٹھیک ہے بھارت میں ہماری نسبت گدھوں کی افراط ہوگی لیکن ہم اتنے گئے گذرے بھی نہیں گدھوں کے سلسلے میں بھارت سے کمیت

یہ گدھوں کے میلے کم نہ ہوں گے

میں بہت شرمندہ ہوں۔ بے حد نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنے دوستوں سے پڑھنے والوں سے کہ میں ایک مرتبہ پھر انسانوں کی بجائے جانوروں پر کالم باندھ رہا ہوں مثلاً ایک رسی کے۔ دراصل میں بہت مجبور ہوں۔ کالم کی رسی دراز ہوتی ہے۔ جب آپ کے آس پاس کوئی "دقوعہ" ہو اخبار میں کوئی دقوعہ خبر ہو یا آپ کے اندر سے کوئی شعلہ اٹھے۔ اب میرے آس پاس سوائے ٹریفک کے حادثوں کے اور کچھ نہیں ہو رہا اندر کے شعلے بھی سرد پڑے ہیں اور اخباروں میں بھی انسانوں سے زیادہ جانوروں کے بارے میں خبریں چھپ رہی ہیں جی نہیں میں صرف جانوروں پر لکھنے کے لئے یہ بہانہ نہیں بنا رہا..... مثلاً یہ کہ فلیپائن میں ایک کسان کی بھینس باقاعدہ گفتگو کرنے لگی ہے اور خبردار کرتی ہے کہ جانوروں سے اچھا سلوک کرو ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا اور اگر تم ایسا کرو گے تو بارش ہو گی اور تمہاری فصلیں بہت بھری بھری ہو جائیں گی..... براہ راست" کے راستے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حکومت پاکستان دوسو گرہچہ درآمد کر رہی ہے تاکہ مگر مچھوں کی کمی پر قابو پایا جائے..... اور یہ کہ بھارت کے کسی شہر میں گدھوں کا میلہ منعقد ہوا ہے اور یہ میلہ پچھلے بارہ سو برس سے بڑی باقاعدگی سے منعقد ہوتا چلا آیا ہے..... یعنی ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ آپ خود ہی اخبار دیکھ لیجئے اسی قسم کی خبریں آرہی ہیں۔ فلیپائن کی بولنے والی بھینس کو تو فی الفور

نہ کر سکیں۔ دیسے بھی گدھوں پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں یعنی اپنا سارا بوجھ ان پر لاد دیا۔ کھانے کو سوائے ڈنڈوں کے کچھ نہ دیا اور کھونٹے سے باندھے رکھا تو اس کا مداوا یہ ہوا ہے کہ ہر برس ان کا ایک میلہ لگا کر ان کو خوش رکھا جائے۔ فرض کیجئے اگر گدھے بوجھ اٹھانے سے اور ڈنڈے کھانے سے انکار کر دیں تو آپ ان کا کیا کر لیں گے؟ مار مار کر ان کو گدھا تو بننا نہیں۔ سکتے کیونکہ وہ تو ہیں ہی گدھے۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی گدھوں کا میلہ ضرور لگنا چاہیے۔ اس کے انتظامات کسی سرکاری محکمے کے سپرد کئے جاسکتے ہیں جو پہلے تو اس موضوع پر ایک گدھا سیمانہ کر لے گا پھر اپنے کسی اہلکار کو غیر ممالک میں گدھا ٹریننگ کے لئے بھجوائے گا اور بالآخر جب میلے کے انتظامات کو آخری شکل دی جا رہی ہوگی تو کوئی ایکسپٹ یہ سوال اٹھائے گا کہ پہلے یہ سٹے کر لیا جائے کہ گدھے کی ذہنی نیشن کیا ہے۔ یعنی فائل میں کیا لکھا جائے کہ گدھا کس کو کہتے ہیں۔ اس پر مختلف ذہنی نیشنز سامنے آئیں گی۔ مثلاً... گدھا وہی ہوتا ہے جو گدھا ہوتا ہے وہ جو گدھا نہیں ہوتا، وہ نہیں ہوتا... گدھا، گدھا، گدھا، گدھا دیتا ہے... گدھا بیوقوف ہوتا ہے۔ گدھے کے کان لمبے ہوتے ہیں۔ وہ اگر کان نیچے کر دے تو موسم کا حال بتا یا جاسکتا ہے... گدھا تب تک کام نہیں کرتا جب تک اسے ڈنڈے نہ مارے جائیں۔ ہر گدھا اپنے آپ کو گدھا نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو گدھا سمجھتا ہے۔ اس پر نبیلہ یہ کیا جائے گا کہ فی الحال گدھوں کا میلہ ملٹری کر دیا جائے۔ کیونکہ گدھے کی ان تقریبوں پر یا ذہنی نیشنز پر معاشرے کے مختلف طبقوں کو شدید اعتراض ہو گا کہ جناب زبان سنہال کر بات کیجئے آپ تو ذاتیات پر اتر آئے ہیں۔

تم نور جہاں ہو؟

شاہراہ قائد اعظم سے جب میں نہر کنارے ہوا تو موٹر پر ایک بزرگ نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سی "بابا جی ہیں اس لئے نظر شرک پر ہمارے سیدھا چلتا گیا۔ اگرچہ یہ حرکت کچھ کچھ مجرمانہ تھی کہ ایک ادھیڑ عمر انسان آپ سے لفٹ کا سوال کرے اور آپ رکے بغیر قریب سے گزر جائیں لیکن میں ان "بابا جی سے چھپتا پھرتا تھا۔

لاہور میں اب لفٹ لینے کا رواج ہے، اور یہ ایک خوشگوار تبدیلی ہے۔ اگر آپ خالی کار یا دین میں جا رہے ہیں تو چند مسافروں کو بٹھا لینے میں آپ کا کوئی اضافی خرچہ تو نہیں ہو گا۔ البتہ وہ لوگ رکشوں اور دیکھنوں کے پیچھے دھکے کھانے سے بچ جاتے ہیں اور آپ کو ان کی دعائیں بوس میں مل جاتی ہیں۔ آپ اپنی خوش نصیبی میں ان لوگوں کو حصہ دار بناتے ہیں جو بالکل آپ ہی کی طرح کے لوگ ہیں، اور ابھی اتنے خوش نصیب نہیں ہوئے کہ ذاتی سواری خرید سکیں۔ اس کے علاوہ تمام راستوں پر بسوں کے روٹ بھی نہیں ہوتے، اور یہاں پر لفٹ دینے سے خلق خدا کو سکھ دیا جاسکتا ہے۔ یہ رواج آج اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ کاریں رکھنے والے حضرات کو بھی لفٹ لیتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ پٹرول کے لئے جیب میں پیسے نہ ہوئے تو اس روز کسی اور کی کاریں بیٹھ کر سفر کر لیا۔ لفٹ لینے والے حضرات بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض تو صرف اپنی من پسند سواری میں سفر کرتے ہیں۔ اگر کوئی موٹر سائیکل والا انہیں دیکھ کر رُک گیا تو بے حد ناراض ہوں گے کہ کیا ہم اسی قابل ہیں میاں جانو؟

ہدایات دیتے رہے۔۔۔۔۔ دیکھ کر چلاؤ۔۔۔۔۔ آہستہ چلاؤ، مجھے مارنا ہے۔۔۔۔۔
گلن کا خیال رکھو۔۔۔۔۔ تمہاری پچھلی نشتر کچھ اتنی آرام دہ نہیں ہے۔۔۔۔۔
کیوں نہیں ہے؟ جیل روڈ پر پہنچ کر ایک دم کہنے لگے "کدھر جا رہے ہو؟"
میں نے عرض کیا کہ گلبرگ مارکیٹ کی طرف۔۔۔۔۔ تو مجھے گلبرگ لے جا رہے ہو
۔۔۔۔۔ میں نے تو ٹاؤن شپ جانا ہے۔

مختصر یہ کہ میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ باباجی کا ڈرائیور بن رہا تھا اور انہیں ٹاؤن
شپ چھوڑ کر آیا۔۔۔۔۔ دوسری مرتبہ بھی خیال نہ رہا اور انہیں نہر کے پل پر سے
اٹھالیا۔۔۔۔۔ میں ان کی شکل بھول چکا تھا۔ اس لئے پوچھ بیٹھا کہ بزرگو کہاں جانا
ہے؟ چمک کر کہنے لگے "بھول گئے۔۔۔۔۔" ٹاؤن شپ جانا ہے اور کہاں جانا
ہے؟ چلا "اس مرتبہ انہوں نے کرم کیا اور دوائی نہیں خریدی۔۔۔۔۔ اس کے
بعد میں چرکنا ہو گیا۔ لیکن کبھی کبھار پکڑا جاتا۔ ان کی نعن نعن بھی سنتا اور ٹاؤن شپ
چھوڑنے بھی جاتا۔۔۔۔۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ نہر کے کنارے کھڑے یہ بزرگ "وہ" باباجی
نہیں ہیں۔ کوئی اور ہیں۔ چنانچہ میں نے بریک پر پاؤں رکھا اور موٹر سائیکل موڑ کر
واپس لے آیا۔ ان کے قریب جا کھڑا ہوا تو نہ انہوں نے لفٹ لی اور نہ مجھے کسی
قسم کی لفٹ دی بس منہ اٹھائے شاہراہ قائد اعظم کی طرف دیکھتے رہے۔
میں نے پوچھا "بزرگو چلنا ہے؟"

انہوں نے مجھ پر صرف ایک نگاہ ڈالی اور خاموش کھڑے رہے۔ میں نے سوچا
موصوف بہرے ہیں اس لئے مزید قریب ہو کر زور سے کہا "بزرگو چلنا ہے؟"
تب بزرگوں نے مجھے خشکیوں لگا ہوں سے دیکھا اور کہنے لگے "تم نور جہاں ہو؟"
موصوف نہ صرف بہرے تھے بلکہ کچھ ڈھیلے بھی تھے "میں نور جہاں کیسے ہو

اپنا راستہ لو۔ ہم کسی ہونڈا کار میں سفر کریں گے۔ اور بعض مساکین تو سائیکل سواروں
کی پیشکش بھی قبول کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔ میں بھی اکثر اوقات رک جاتا ہوں اور سواروں
بٹھالیتا ہوں۔ لیکن "ان" باباجی سے خائف رہتا ہوں کہ کہیں وہ نہ مل جائیں۔ وہ
باباجی پہلی مرتبہ فیصل چوک کے قریب ملے۔ انہوں نے اشارہ دیا، میں رکا۔ اور
انہیں بٹھالیا۔ خاصے ضعیف تھے۔ ہاتھ میں چھڑی اور بڑی بڑی سفید مونچھیں تھیں۔
بیٹھتے ہی کہنے لگے "برطور وار موٹر سائیکل زیادہ تیز نہ چلانا۔"

میں نے عرض کیا "آپ فکر نہ کریں۔ صرف چوڑیاں پیچھے رہ جائیں گی، باقی
ہر شے ہم سے آگے نکل جائے گی۔"
تھوڑی دیر کے بعد بولے "تم جا کہاں رہے ہو؟" میں نے بتایا کہ گلبرگ میں گھر
ہے، ادھر جا رہا ہوں۔

ناراض ہو گئے اور چھڑی کو میری پسلیوں پر بجاتے ہوئے کہنے لگے "لیکن ابھی تو
مجھے دوائی خریدنی ہے میوہ ہسپتال چوک سے۔۔۔۔۔ اس وقت ہم گورنمنٹ ہاؤس سے
آگے جا چکے تھے۔ میں نے کہا "بزرگو! پہلے بتایا ہوتا۔۔۔۔۔ یہاں بس سٹاپ پر اتار
دوں؟"

وہ تو جلال میں آگئے "بٹھایا کیوں تھا۔ بوڑھے آدمی کو غار کرتے ہو؟ اتنا
نہیں کر سکتے کہ پانچ منٹ کے لئے میوہ ہسپتال چلے چلو۔ مجبوراً میں نے اپنا رخ
بدلا اور واپس شہر کی طرف آیا اور میوہ ہسپتال کے پاس انہیں دوائیوں کی دکان
کے باہر اتار دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں چپکے سے کھسک جاؤں گا کیونکہ میرے ہاں
اس شام مہمان آرہے تھے۔ لیکن دوائی خریدتے ہوئے انہوں نے مجھ پر کڑی نظر
رکھی اور بار بار پیچھے دیکھ کر اطمینان کر لیتے کہ میں بھاگ تو نہیں گیا۔ دوائی خریدنے
کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر شاہراہ قائد اعظم پر آگئے۔۔۔۔۔ باباجی مجھے پیچھے بیٹھے

سکتا ہوں بزرگو؟

وہ مسکراتے تو پھر جاؤ..... میں تو فوراً جہاں کی کار کا انتظار کر رہا ہوں
..... اخبار میں نہیں پڑھا کہ وہ نیک دل بی بی جہاں کہیں مجھ ایسے جھوٹے
بھٹکے مسافر نظر آئیں انہیں اپنی کار پر گھر چھوڑ آتی ہے۔



یہ کیا ہے؟ کتنے کا ہے؟

ان دنوں لاہور آنے والے مسافر جب رائے ونڈ یا کالا شاہ کاکو کے قریب
پہنچتے ہیں تو انہیں اس شہر کے اوپر گرد و غبار کا ایک بادل سا نظر آتا ہے تب وہ
جان جاتے ہیں کہ یہ فورٹریس سٹیڈیم کے پھولوں میں ایسا وہ صنعتی نمائش میں بھٹکنے
والے لڑکھوں کے افراد کے پاؤں کی دھول ہے جو کسی ایسی دھماکے کے بعد ظہور
میں آنے والے مشر دم نما بادل کی طرح شہر پر معلق ہے پچھلی شب چند دوستوں کے
ہمراہ میں بھی اس کو چہ گرد میں خاک چھاننے کو داخل ہوا۔

نمائش کے دروازے پر "غزاکوں" کے شال اور تھوکتا تھیں نصب تھیں امرغ
چھوٹے امرغ حلیم مرغ درست اور مرغ بریانی کو اہل لاہور اپنے شکموں میں اس
بیدردی سے اتار رہے تھے جیسے آج کی شام کے بعد مرغ کی نسل ختم ہونے والی
ہے۔ یہاں روایتی خوش دلی کے ساتھ ساتھ روایتی خوش خوراک کی کا بھی مظاہرہ
ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہر مرغ کے ہمراہ اتنے ہی وزن کی مکھیاں بھی زندہ
دلوں کے پٹیوں میں اتر رہی تھیں لیکن زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے اندر داخل
ہوتے ہی پانچ بے سہائے ہاتھ روم نظر آئے۔ نظامی صاحب جو ایک مقامی کالج
میں لیکچرر ہیں اور جنہیں نامعلوم وجوہات کی بنا پر گروڈ کہا جاتا ہے اپنے خصوصی جہلی
انداز میں بولے "یہ کیا ہے، نہانے کا کمر ہے؟ کتنے کا ہے؟ دباں سے جواب
ملائیں بزرگ! میں نے کہا: یہ تو بہت سستا ہے..... کیا تائیں ہیں، کیا نفاست
ہے، جی یا بتا ہے انسان ساری عمر نہاتا ہی رہے..... پھر ترکیبوں کا ایک

ہالی وڈ میں ایک ریتوران ہے جس کے فٹ پاتھ پر ان فلمی ستاروں کے پاؤں اور ہاتھوں کے نشان ثبت ہیں جنہوں نے وہاں قدم رنجہ فرمایا۔ صنعتی نمائش کے منتظرین کا بھی یہی ارادہ ہے کہ وہاں جانے والے تمام افراد کے پاؤں کے نشانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا جائے اور اسی نیک مقصد کے لئے انہوں نے تمام راستے کچے رکھے ہیں جن پر آپ دھول اڑاتے ہوئے چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم بھی دھول اڑاتے ہوئے چلتے رہے۔ ایڈن راک کے سٹال سے خوشبو نہیں اٹھ رہی تھیں اور ایک باریش بزرگ نہایت خوش اخلاقی سے گاہکوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ ہجوم اتنا تھا کہ نظامی صاحب کہنے لگے "یہ سرخی پوڈر ہے... مفت ہے؟" جواب ملا "نہیں... آپ مال خریدیں ہم آپ کو تحائف دیں گے"... پرویز نے پوچھا "صرف تحائف نہیں مل سکتے؟" انہوں نے صرف گھورنے پر اکتفا کیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ مطیع الرحمن جو ایک ہمہ وقت انشورنس سیلز مین ہے نہایت آزدگی سے بولا یا ران لوگوں کو سمجھانا چاہیے کہ جتنی رقم یہ پاؤں دلوں اور گھاسوں پر برباد

ایک مقام پر گھر بلو دروازوں کے علاوہ پورا پورا باورچی خانہ ایستادہ تھا۔
 ”یہ کیا ہے؟ روٹی ٹکڑ پکانے والی جگہ ہے؟ کتنے کی ہے؟..... مطیع الرحمن تنگ
 آکر بولا ”نظامی صاحب آپ نے کچھ لینا تو ہے نہیں خواجہ قیتمیں پوچھ رہے ہیں۔“
 ”نظامی صاحب اطمینان سے کہنے لگے ”نہ تو کیا حرج ہے؟ انہوں نے نمائش کس لیے لگائی
 ہے..... ہاں بھی کتنے کا ہے یہ باورچی خانے کا سامان؟ معلوم ہوا کہ صرف پچیس
 ہزار کا ہے اس پر بھی میرا بھی رد عمل تھا کہ یا رو پلائی وڈ اور فارمیکا کا بنا ہوا یہ کچن
 تمام گھروں کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جو باورچی خانے ہوتے ہیں
 ان میں وال چادل، مٹی کی روٹی اور گو بھی گوشت تو پک سکتے ہیں لیکن سٹیک چاب
 سوئی اور فرنیچ فرائی تو نہیں پک سکتے چنانچہ تہذیب یافتہ خوراک پکانے کے لئے
 یہ کچن بہت ضروری ہے اور ۲۵ ہزار میں کوڑیوں کے مول ہے۔۔۔۔۔ رات بھیگنے
 لگی تو ہمیں اپنے اپنے کچن اور خاص طور پر ہاتھ روم یا دائے اور ہم واپسی کے لئے
 پر تو لے لگے..... باہر آتے ہوئے ایک قالین دیکھا جو بیس ہزار کا تھا اور جو نہی میں
 نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ بھی سستا ہے تو تمام حضرات مجھ پر برس پڑے۔ ٹھیک
 ہے تمہارے پاس ڈھیروں دولت ہے۔ نوٹ ہی نوٹ ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہر
 گز نہیں کہ تم ہمیں متاثر کرنے کے لئے ہر شے کو سستی قرار دیتے رہو..... اس
 پر میں نے اپنی جیب ٹٹولی اور پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ہوا میں لہرایا حضرت
 دراصل آج شام جب میں نمائش پر آنے کے لئے گھر سے نکلا تو میری بیوی نے مجھے
 یہ خطیر رقم اس لئے عطا کی تھی کہ میں یہاں سے گھر بلو ضرورت کے لئے کوئی مناسب
 چیز خرید لوں۔ اب پچاس اور پچیس ہزار میں بہت فرق ہے چنانچہ جوشے میں
 کبھی خرید ہی نہیں سکتا وہ تو میرے لئے سستی ہوگی مجھے اس کی کوئی پرواہ ہی
 نہیں ہوگی؟

نظامی صاحب سوچ میں ڈوب گئے اور پھر خاصی دیر کے بعد سرائی کرکھنے لگے
 یہ سب کیا ہے؟
 نمائش..... نمائش کا مطلب ہے دکھاوے کی چیز ہم سب نے اسے دیکھ
 لیا، آڈاب گھر چلیں.....
 میں واپس گھر آیا تو میرے پاس نمائش سے حاصل کردہ وہ وصول تھی جو میرے
 چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

مینڈک خوری اور بیگ صاحب

میرے ایک عزیز دوست ہیں جنہیں ہم پوشیدہ رکھنے کے لئے بیگ صاحب کہہ سکتے ہیں۔ بیگ صاحب فلسفہ کے آدمی ہیں اور دیگر علوم کو محض فضولیات سمجھتے ہیں شکل سے فلسفی کی بجائے لائٹ بول دیٹ بکسر دکھائی دیتے ہیں اور ماشاء اللہ خوش خوراک میں اپنی مثال آپ ہیں ملازمت کے سلسلہ میں روزانہ لاہور آتے ہیں اور اشیا خورونی سے لدرے پھندے اپنے قصبہ کو لوٹ جاتے ہیں لاہور میں مرغ کس کا خستہ ہوتا ہے۔ گوشت کون اچھا بناتا ہے کہا ب کون سی گلی میں ایسے ملتے ہیں کہ منہ میں رکھتے ہی گھل جائیں اور کس حلوائی کی رس ملائی میں رس بھی ہوتا ہے اور ملائی بھی یہ سب آپ بیگ صاحب سے پوچھنے ان کی زندگی کی دوسری خوشیاں ہیں فلسفے کی کتاب اور مزیدار خوراک۔

ایک روز میرے پاس تشریف رکھتے تھے کہ ایک اور جاننے والے آئے بیگ صاحب کو دیکھ کر چپکے قدرے خوفزدہ ہوئے اور ابھی آیا کہہ کر غائب ہو گئے دو تین ماہ بعد ان غائب ہو جانے والے حضرت سے مال روڈ پر ملاقات ہو گئی میں نے شکایت کی کہ آپ پہلے تو آتے جاتے رہتے تھے اب اتنے دنوں سے کیوں غائب ہیں۔

کہنے لگے وہ بیگ صاحب آپ کے دوست ہیں؟ میں نے کہا ہاں بہت ہی قریبی دوست۔

وہ بولے بس میں ان سے خوفزدہ ہوں اس لئے آپ کی طرف نہیں آیا۔

بیگ صاحب اپنے دوستوں میں ایک اور خصوصیت کی بنا پر جانے جاتے ہیں اور وہ ہے ان کی پیش گوئی کی صلاحیت اور پیش گوئی بھی ہمیشہ سبز قدم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی ہوم مل والے نے ان کی بریانی میں مرغ کی مناسب بوٹی نہیں ڈالی تو سمجھ لیجئے کہ اس کی دکان کی خیر نہیں اگر کسی شخص کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کریں تو چند دنوں بعد اس کی فوتیہ گئی کی خبر آجائے گی بہر حال میں نے ان خوفزدہ صاحب کو تسلی دی کہ بیگ صاحب دوستوں کا خیال رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں کبھی کوئی ایسی سیدھی پیش گوئی نہیں کرتے وہ صاحب حیران ہو کر کہنے لگے جناب تارڑ صاحب آپ کو بالکل نہیں پتہ کہ بیگ صاحب دراصل کیا ہیں؟

میں نے پوچھا کیا ہیں؟ انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر میرے کان میں آہستہ سے کہا وہ مینڈک کھاتے ہیں۔

.....

میں اچھل پڑا۔ مینڈک! آپ یقیناً مذاق کرتے ہیں بیگ صاحب یقیناً خوش خوراک ہیں لیکن مینڈک؟ لا حول ولا.... نہیں صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ صاحب مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے بیگ صاحب اور میں ایک ہی قصبے کے رہنے والے ہیں اور تمام اہالیان قصبہ جانتے ہیں کہ وہ مینڈک خور ہیں اس روز آپ کے ہاں انہیں دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا تارڑ صاحب کہیں آپ بھی تو شوق نہیں کرتے؟

میں نے ایک مرتبہ پھر لا حول پڑھی اور انہیں یقین دلایا کہ میں نے زندگی میں بہت سارے شوق پورے کیے ہیں لیکن مینڈک خوری سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگلی مرتبہ جب بیگ صاحب میرے ہاں تشریف لائے تو مجھے وہ کچھ بدلے

چنانچہ ہم نے ایک توے اور نمک مرچ کا انتظام کیا اور قصبے سے کچھ دور درختوں کے ایک جھنڈ میں چلے گئے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور مرغ حلال کر کے توے پر رکھ دیا۔۔۔۔۔ ہم اپنے تئیں اس کی بوتلیاں دوست کر رہے تھے کہ ہمارا ایک محلے دار چاچا محکم دین اُدھر آنکلا۔ اسے دیکھ کر عارف کے چہرے پر ہوائیاں اُٹنے لگیں محکم دین نے دور سے ہی پوچھا، ادے کہیں میرا مرغ دیکھا ہے؟ اس نے قریب کر توے پر دوست ہوتے گوشت کو سونگھا اور غصے سے بولا، یہ کیا ہے؟ عارف نے سنبھلتے ہوئے کہا، چاچا اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے تو تم سے کیا چھپا، ہم دونوں مینڈک کھانے کے بے حد شوقین ہیں اسی لئے یہاں درختوں میں چھپ کر مینڈک بھون رہے ہیں۔ قسم سے بڑے مزیدار ہوتے ہیں، کھاؤ گے!۔۔۔۔۔ یہ سن کر چاچا محکم دین ابکیاں لیتا ہوا قصبے کی جانب بھاگ گیا۔۔۔۔۔ بعد میں پورے قصبے میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ بیگ اور عارف مینڈک کھاتے ہیں۔ ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے تھے کہ اس روز ہم چوری کا مرغ دوست کر رہے تھے اس لئے خاموش ہو گئے اور آج تک ہمیں مینڈک خوری کا طعنہ دیا جاتا ہے؟

بیگ صاحب کی مینڈک خوری کی داستان یوں یاد آگئیں کہ انہی دنوں پاکستانی مینڈک فرانس برآمد کیے جا رہے ہیں اور ایک مرتبہ پھر بیگ صاحب کے قصبے میں یہ خبر مشہور ہو گئی ہے کہ دراصل بیگ صاحب ہی ان مینڈکوں کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔

بدلے دکائی دے رہے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی جریب میں سے دست مینڈک کی ایک ٹانگ نکالیں گے اور پختارے لے کر کھانے لگیں گے تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے بھوک لگی ہے کچھ کھانے کے لئے منگائیے۔

میں نے کہا کیا کھائیں گے؟ کباب پکوڑے یا میں۔۔۔۔۔ میں مینڈک کہتے کہتے رک گیا بیگ صاحب فلسفے کے ساتھ ساتھ علم انبیات کو بھی کھنگالتے ہیں تاڑ گئے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے کھانس کر پوچھنے لگے آج آپ کچھ کھڑے کھڑے نظر آ رہے ہیں کیا بات ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا بیگ صاحب آپ مینڈک کھاتے ہیں؟
بیگ صاحب میرا سوال سن کر بے حد رنجیدہ ہوئے کچھ دیر تک سر جھکا کر بیٹھے رہے اور پھر انتہائی گلوگیر آواز میں کہنے لگے آپ کو بھی معلوم ہو گیا؟
تو آپ کھاتے ہیں؟ میں گھبرا گیا۔

تب بیگ صاحب نے اپنی مینڈک خوری کا جو قصہ بیان کیا، وہ کچھ یوں ہے۔۔۔۔۔ ہم سکول میں پڑھتے تھے اور اس عمر میں انسان کو جو شرارتیں کرنی چاہئیں وہ کرتے تھے، جتنی مار کھانی چاہتے وہ بھی کھاتے تھے۔ مار کے علاوہ ویسے بھی کھانے پیئے کا شوق تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں نے اپنے جگری دوست عارف وقار سے کہا یار آج تو مرغ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ عارف نے میری بات سنی اور چٹکی بجا کر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نمودار ہوا تو اس کی بغل میں ایک صحت مند لیکن قدرے پریشان مرغ تھا۔ میں نے پوچھا، کہاں سے لائے ہو؟ کہنے لگا میں آوارہ گھوم رہا تھا میں نے اُدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ آہستہ آوازیں دیں کہ بھئی کس کا ہے؟ کس کا ہے؟ جب کوئی جواب نہ ملا تو میں اٹھا لایا میں نے کہا۔ چوری کر کے لائے ہو کہنے لگا، نہیں کسی کے گھر سے تھوڑا لایا ہوں، گلی میں لاوارث گھوم رہا تھا۔۔۔۔۔

بکرا بخار

عید سے تقریباً دو ہفتے پیشتر یہ سلسلہ شروع ہوا تھا کہ جو بہی میں شہر آنے کے لئے گھر سے باہر قدم رکھتا ہجہ لوگ پیچھے سے نعرہ لگاتے کہ "ابو بکرا" میرے بچے ماشاء اللہ بے حد سمجھدار اور ماں باپ کی عزت کرنے والے ہیں اس لئے جب وہ "ابو بکرا" کا نعرہ بلند کرتے تھے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ خدا نخواستہ ابو جو ہیں وہ بکرا ہیں بلکہ وہ تو مختصراً یہ کہنا چاہتے تھے کہ ابو ایک عدد بکرا خرید لائے گا چنانچہ ایک روز ابو نے اپنے تئیں خاصی بھاری رقم جیب میں ڈال کر ان مقامات کا رخ کیا، جہاں ان دنوں ڈرائیو ان قسم کی بکر منڈیاں وجود میں آچکی تھیں بیشتر بکروں کی صحت کا معیار خاصا رقت انگیز تھا۔ بعض اتنے ناتواں اور مختصر تھے کہ اگر بھونکتے تو یقیناً کتے ہوتے۔ بہر حال ان کی توانائی دیکھ کر مجھے توانائی حاصل ہوئی کیونکہ میری جیب میں اتنی رقم تھی جس سے میں اس قسم کے تین چار "بھیڑ" بآسانی خرید سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان میں سے ایک بکرا فروش کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کر دیا جس کے گلے میں چھ بکرے تھے۔ قیمت دریافت کی تو وہ بھلا مانس عاجزی سے بولا، صاحب جو مرضی میں آئے دے دیں میں نے کہا کہ بھائی میرے آپ قیمت بتائیں گے تو میں فیصلہ کر سکوں گا کہ مجھے کتنے بکرے خریدنے میں کہنے لگا، صاحب جی دو ہزار دس دیکھئے گا۔ میں نے کہا کہ نہیں بھائی میں چھ بکروں کا کیا کروں گا، زیادہ سے زیادہ دو خرید لوں گا۔ اس پر اس بھلے مانس کی تمام عاجزی

کا فور ہوئی اور اس کی جگہ خشونت نے لے لی۔ اور انتہائی درشتگی سے بولا صاحب جی گلے خریدنے آئے ہو یا بکرے.... دو ہزار ایک بکرے کی قیمت ہے؟ میں نے جانا کہ یہ بندہ خدا نافرمان عقل ہے کہ ایک حالیہ سردے کے مطابق پاکستان کی تقریباً دس فیصد آبادی ذہنی امراض کا شکار ہے یعنی عام لفظوں میں پاگل ہے اس لئے ایک اور بکرا فروش سے رجوع کیا۔ وہ بے چارہ بھی اسی دس فیصد آبادی کا ایک فرد نکلا اس کے بعد ایک اور بکرا فروش سے رجوع کیا.... اور شام تک "رجوع" ہی کرتا رہا اور بالآخر یہ عقدہ کھلا کہ تمام بکرا فروش حضرات بالکل نادمل اور صحیح العقل ہیں اور صرف میں اس دس فیصدی آبادی کا ایک فرد ہوں جو پاگل ہے چنانچہ شام کو ہم بے بکرا بے مراد گھر واپس آ گئے.... میری طرح اور لوگ بھی اپنی جیب میں "بھاری رقم" ڈال کر ان بکر منڈیوں میں سرگرداں تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو جب ایک بکرے کی قیمت تین ہزار بتائی گئی تو کہنے لگے، کیوں اس میں موٹر لگی ہوئی ہے، چونکہ بکرا فروش اس قسم کے فقرے گا کہوں کا عادی تھا اس لئے فوراً بولا، وہ بولندہ روڈ سے لگوا لیجئے گا، پونے چار سو روپے کی؟ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ اچھا بھائی جان یہ تین ہزار کا جو بکرا ہے تو کیا صرف اس عید پر کام آئے گا یا اسے اگلے برس بھی فربح کیا جاسکتا ہے؟ جواب ملا کہ اگلی عید پر بھی کام آجائے گا اگر اس عید پر آپ اسے فربح نہ کریں تو، وہ صاحب کچھ اور کہنے کے لئے ابھی پر توں رہے تھے کہ بکرا فروش بولا "صاحب جی گھوم پھر کے تماشہ دیکھو جاؤ اللہ بھلا کرے۔"

بکرا خریدنے سے ہی آپ کی آزمائش ختم نہیں ہوتی۔ عید کے روز عمران خان سے ہاتھ ملانا یا روحی بانو کو چھٹی عید مبارک کہنا زیادہ آسان ہے اور قصائی کا حصول زیادہ مشکل۔ پچھلے عید پر میں نے قصائیوں کے ناز و خیر برداشت کرنے کی بجائے اپنے ایک بابا جی کی مدد سے خود ہی بکرا فربح کر ڈالا۔ اگرچہ مناسبہ کہ درست محاورہ بکرا کاٹنا

ہے لیکن اس طرح یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کسی تلوار سے بکری کا جھٹکا کر رہے ہوں، یہاں تک تو کام آسان تھا لیکن جب اسے کندھے سے لٹکا کر کھال اتارنے کی کوشش کی تو پسینے آ گئے، یہاں تک کہ تمام بچہ لوگ کو بھی اس کام میں مدد دینے کے لئے اکٹھا کر لیا گیا۔ اب تقریباً پورا خاندان کھال کے ساتھ لٹکا ہوا ہے اور کھال ہے کہ اترتی ہی نہیں۔ تھک ہار کر پھر قصائی کو بلا لیا گیا جس نے پہلے سے بھی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ بقول اس کے ہم نے بکری کا ناس مار دیا تھا۔ البتہ ہمارے ایک عزیز اس کام میں بہت ماہر ہیں۔ وہ لیڈیا سے واپسی پر جانوروں کو حلال کرنے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے چھریوں اور کلہاڑیوں کا ایک پورا سیٹ خرید لائے تھے اس سیٹ میں تقریباً پچاس سے زائد مختلف سائزوں کی چھریاں اور کلہاڑیاں شامل ہیں۔ چنانچہ وہ بکرا ذبح کرنے سے پیشتر اس اسلحے کی باقاعدہ نمائش کرتے ہیں اور پھر گردن پر چھری رکھتے ہیں شنید ہے کہ اس نمائش کی وجہ سے ان کے محلے میں آج تک کوئی چوری نہیں ہوئی۔ کوئی بھی چور بکرا ہٹنا پسند نہیں کرتا۔

بہر حال قصائی تو بکری سے بعد کی بات ہے فی الحال تو یہ ہے کہ روزانہ "ابو بکرا" کے غریبے سننے پڑتے ہیں اور حالات بے حد تشویشناک ہیں۔ کوشش تو یہی ہے کہ جو نہی یہ بکرا بخارا اترے تو ہم مناسب قیمت کا کسی بھی سائز کا روصرف اس کی گردن نظر آتی چاہیے، ایک عدد بکرا خریدیں ورنہ ہم الفٹ نے ابو کے ساتھ ساتھ بے سے بکرا ہو جائیں گے میں تمام بکروں..... میرا مطلب ہے ابوؤں کی جانب سے آپ سب کو عید مبارک کہتا ہوں۔ باآ۔ باآ۔ باآ۔

لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟

میں جب بھی کسی شادی میں شمولیت کی خاطر گھر سے نکلتا ہوں تو گھر والی سے یہ کہہ کر نکلتا ہوں کہ نیک بخت آج کھانے میں جو کچھ بچے گا وہ وفادار جانور کو کھلانے کی بجائے اپنے وفادار خاوند کے لئے بچا رکھنا۔ ہو سکتا ہے، بھوکے پیٹ واپسی ہو، کیونکہ شادی کی اکثر دعوتوں میں جو دھماچو کڑی مچتی ہے اور جس طرح "شرفا" زور بازو سے اپنی پلیٹوں پر مرغوں اور چاندلوں کے اہرام تعمیر کر کے شور بے کے چھینے اڑاتے ہیں وہاں ہم جیسے غیر شرفا دامن بچاتے رہتے ہیں اور ہاتھ میں فقیروں کی طرح پلیٹ پکڑے کھڑے رہتے ہیں، اور بالآخر کھیر کھا کر گھر لوٹ جاتے اور پھر چپکے چپکے باورچی خانے میں گھس کر کچی کھجی نوراک کی تلاش میں ہنڈیاں دیگے کھڑکاتے ہیں تو خاتون خانہ آنکھیں ملتی ہوئی نمودار ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ کھانے کے لئے تو کچھ نہیں بڑا شوق ہے شادیوں میں جانے کا۔ میں پوچھتی ہوں، ساری دنیا وہاں جاتی ہے، کھانا کھاتی ہے، سیون اپ پیتی ہے، اور تم بدصوؤں کی طرح ایک طرف کھڑے رہتے ہو۔ ڈبل روٹی پر مکھن لگا دوں، شادی کی دعوتوں سے نامزد لوٹنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ جب سے "کھڑے کھانے" کا رواج ہوا ہے، یعنی کھڑے ہو کر کھانے کا رواج ہوا ہے میں کوئی نا تو اس قسم کی بوٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاؤں تو بھی اسے مکمل طور پر کھا نہیں سکتا کیونکہ کھانے کے لئے بوٹی کا حلق تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے اور اسے وہاں تک پہنچانے کے

”کھاؤ کھاؤ“

میں نے کہا ”کیسے کھاؤں اور کیا کھاؤں؟“

شاہ جی کہنے لگے ”بیڑے“

”بیڑے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا ”وہ بھی ہیں؟“

”یہ جو تمہاری پلیٹ میں پڑا ایک روٹ پرندہ سوکھ رہا ہے یہ بیڑہ ہی تو ہے“

”اچھا! میں بھی کہوں یہ مرغ اتنا مخنی سا کیوں ہے۔ شاید شاعر ہے اس لئے؟“
”شاعر مخنی ہوتے ہیں“ شاہ صاحب غصے میں آگئے ”کیا میں شاعر نہیں ہوں؟“
اب میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اصغر ندیم شاہ بہت اچھا شاعر ہے۔ لیکن اس کے باوجود قوت و قوش مناسب رکھتا ہے۔ اس دوران شاہ جی پھر غائب ہوئے اور فوراً ہی نمودار ہو گئے۔ ان کی پلیٹ میں بیڑے ہی بیڑے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ جال پھینک کر انہیں پکڑ لائے ہیں۔ انہوں نے چند بیڑے میری پلیٹ میں لڑھکا دیئے ”کھاؤ“

میں نے حسب معمول ان بیڑوں کے پیچھے اپنا چھ لگانے کی کوشش کی تو شاہ جی نے وہ آکر خوراک میرے ہاتھ سے چھین لیا اور کہنے لگے ”تارڑ ہو کر چھپ استعمال کرتے ہو۔ بھائی جان بیڑے ہاتھ سے کھائے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے عملی منکھارے کے طور پر ایک بیڑے کو قابو کیا منہ میں ڈالا اور چبا گئے۔ میں نے کہا ”شاہ جی یہ ہڈیاں اس کی کچھ گڑبڑ نہیں کریں گی پیٹ میں؟“
شاہ جی زیر مونچھے مسکرائے اور کہنے لگے ”سائیں شاید آپ نے کبھی بیڑے نہیں کھائے، انہیں ہڈیوں سمیت کھایا جاتا ہے۔“
میں نے شاہ جی کے مشورہ پر عمل کیا اور جوں توں کر کے ایک چھوٹا سا بیڑہ

لئے بندے کی حالت کچھ یوں ہوتی ہے کہ ایک ہاتھ میں پلیٹ کو چینی بازی گروں کی طرح معلق کیا ہوتا ہے، دوسرے ہاتھ میں چھپچھپا کا شمار اب اس حالت میں آپ چاول تو کسی نہ کسی طرح چھپچھپ پر سمیٹ کر حلق میں اتار دیتے ہیں، لیکن جب بوٹی کی باری آتی ہے تو وہ چھپچھپ کے چٹ سے بدکنے لگتی ہے بلکہ پھسلنے لگتی ہے۔ آپ کو ان دھکوں کا خیال بھی رکھنا پڑتا ہے جو ہارات میں شریف شرفا کی تلاش مرغ کے دوران پڑتے رہتے ہیں۔ پلیٹ کو بدستور تھیلی پر چھانے رکھنا ہوتا ہے اور چھپچھپ کے ساتھ بڑی سے گوشت الگ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اب آپ کسی سکھ کی طرح اس بوٹی کے پیچھے چھپچھپ لگا دیتے ہیں تاکہ وہ بالآخر ”ح“ جائے اور آپ اسے یوں تھکا کر قابو کر لیں۔ میں ایسے موقعوں پر کسی میز یا کرسی کا سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن تو بہ کرسی، بھلا ماڈرن دعوتوں میں میز کرسی کہاں سے آئے گی۔ چنانچہ آپ صحن چاول کھا کر لوٹ آتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک گرینڈ قسم کی شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہاں خوراک تو گرینڈ قسم کی تھی لیکن آداب خوراک وہی تھے جو ہمارے گلی محلے کی شادیوں میں ہوا کرتے ہیں۔ چونکہ اس شادی میں آنے سے پیشتر بیگم نے وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر وہاں جانا ہے تو کچھ کھا کر آنا واپسی میں گھر میں کچھ نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں نے نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی ایک ایک سپرٹ کھانے والے کی طرح ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جس کے عین سامنے اس دروازے کو کھلنا تھا جس کے پیچھے میں نے پھر کہا ”شاہ“
وہ اسی طرح جھکے رہے اور بڑبڑائے ”ہاں“

”اوئے اصغر ندیم شاہ تو بولنا کیوں نہیں“ میں نے تنگ آکر کہا۔
اس پر سید بادشاہ چونکے اور مجھے دیکھ کر مسکرائے لگے۔

منہ میں ڈال لیا۔ اب میں نے اسے منہ میں تو ڈال لیا لیکن چونکہ منہ میں مکمل طور پر
بیشیرہ داخل ہو چکا تھا اس لئے اسے چبانہ سکا۔ بہت کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا تھوڑی
دیر بعد شاہ جی پھر مہری طرف آئے اور کہنے لگے "کیا منہ کھولے کھڑے ہو کھاتے کیوں نہیں؟
میں نے اشارے سے بتایا کہ جناب کھا ہی نہیں سکتا۔ جبراً پیشے سے مقفل ہو
چکا ہے۔ تب انہوں نے میرے گالوں کو ہلکے ہلکے تھپکا اور تھوڑی سی جگہ سید اکی اور
میں نے بمشکل منہ چلا کر اس عظیم بشیر کو نوش کر لیا۔ اگلے دو روز مجھے یہی احساس ہوتا
رہا کہ وہ بیشیر میرے پیٹ میں پھڑپھڑا رہا ہے۔

پلیٹوں کے کھڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جو نہی "حضرات کھانے کے لئے
تشریف لائیں" کا بگل بجا میں ایک ندیدے بچے کی طرح لوگوں کو دھکے دیتا کرسیاں
پھلا گلتا طعام گاہ کے اندر جا پہنچا اور ایک پلیٹ اور چھچھوٹا بکری کے خوراک کے ڈیسروں
کی جانب لپکا۔ اب چونکہ شادی گرینڈ قسم کی تھی اس لئے خوراک بھی ذرا مختلف تھی۔ اور
کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ جو ڈش ہے یہ دال کی ہے یا کوئی غیر ملکی طرز کی سویٹ ہے۔
بہر حال میں نے بھی جلدی جلدی اپنی پلیٹ پر ایک چھوٹا موٹا ابرام تعمیر کر لیا۔ اتنی
دیر میں بقیہ پبلک بھی پہنچ گئی اور مجھے وہ مقام چھوڑنا پڑا۔ چاول کھانے کے بعد
میں نے اس چھوٹے سے مرغ کی طرف دھیان کیا جو میں ٹوٹ کر لایا تھا۔ بہر حال
میں اس کے ایک دو ٹکڑے علیحدہ کر کے کھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران کیا
دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اپنی پلیٹ پر اس سفید گی اور دانش وراثہ انداز میں
جھکے ہوئے ہیں جیسے ٹیلی ویژن کا کوئی سکرپٹ لکھ رہے ہوں۔ کافی دیر بعد انہوں نے
سراٹھایا۔ اس سے پیشتر کہ میں ان سے بات کرتا، وہ غائب ہوئے اور چند سیکنڈوں
میں واپس آکر پھر پلیٹ پر جھک گئے جو اس مرتبہ پھر بھری ہوئی تھی۔ میں نے ان کے

کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "شاہ جی؟"

"ہاں جی" وہ پلیٹ سے مخاطب ہو کر بولے۔

آج کے کالم میں خوراک کے تذکرے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھلوں دنوں انہا میں ایک
خبر تھی کہ پتہ نہیں کونسا محکمہ ایک سرورے کر رہا ہے کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے
ہیں۔ اس سرورے کے بعد پتہ نہیں کیا ہو گا تب میں نے سوچا کہ ابھی وہ محکمہ اس
منصوبے کی فائل بنانے گا۔ پھر شیعوں کا انتخاب ہو گا۔ پھر یہ شیعیں لاہور شہر میں
گھوم پھر کر سرورے کریں گی۔ پھر سرورے رپورٹ تیار کی جائے گی، تو کیوں نہ اس
محکمے کی مشکل آسان کر دی جائے۔ اور میں ہی ایک مختصر سا سرورے کروں کہ لاہور
کے شہری کیا کھاتے ہیں۔ بار اتوں میں لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں اور کیسے کھاتے
ہیں۔ اس کی تفصیل تو میں نے عرض کر دی سب سے پہلے میں نے اس سلسلے میں کچی
پانفروش سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ بھئی لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟ کچی نے
فورا کہا "لاہور کے شہری جناب عالی! پان کھاتے ہیں۔"

"اس کے علاوہ؟"

"اس کے علاوہ کتھا کھاتے ہیں؟"

"ہں اور کچھ نہیں کھاتے؟"

"جناب عالی؟ میرے پاس تو بس پان کھانے ہی آتے ہیں یا

پھر صنعت کی لالچیاں؟"

"لیکن کچی! تم خود کیا کھاتے ہو؟"

"میں جی؟ کبھی نان چھوٹے، کبھی پکوڑے۔"

"یعنی تمہیں معلوم ہی نہیں کہ بہتر صحت کے لئے متوازن غذا کیا ہوتی ہے، پروٹین
کے کہتے ہیں اور دودھ، اندہ سلا، دھنیاں، چینی کھانے وغیرہ۔"

چکی نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا میں تو جی نان چھوے ہی کھاتا ہوں۔
اتنی دیر میں بابا پہلوان پان کھانے آگیا اور اس سے بھی میں نے یہی سوال کیا
کہ آپ کیا کھاتے ہیں؟
بابا پہلوان نے ایک زوردار ڈکار مارا اور کہنے لگا: "باؤجی لوگ جو بھی کھاتے ہیں
کھا لیتے ہیں۔ پٹھورے، دہی بھلے، نہاری...."
میں نے کہا: "بابا.... وہ باداموں والے شربت کھوے کی لسی اور کچا دودھ
وغیرہ کیا ہوئے؟"

"بزرگ کھاتے تھے باؤجی۔ اب تو ہم پٹھورے وغیرہ کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔
تب میں میکوڈر وڈ کی جانب گیا جہاں لاہور کے شہری تھکے کباب، مرغ چھوے
مرغ دوست، چائیں اور گردے کھینچ کھانے میں مشغول تھے۔ لیکن یہاں پر معلوم ہوا
کہ یہ لاہور کے شہری نہیں ہیں بلکہ مختلف محکموں کے افسر اور ٹیکیدار وغیرہ ہیں کیونکہ
عام شہری ان خوردگوں کو افرڈ نہیں کر سکتے۔"

ایک جدید خاتون سے پوچھا کہ آپ محترمہ کیا کھاتی ہیں؟ انہوں نے ناک
سکیر کر کہا: "میں کچھ نہیں کھاتی.... میں ڈانٹنگ کر رہی ہوں۔"
میں سارا دن ان کوائف کو جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن خاطر خواہ کامیابی
نہ ہوئی۔ تب میں نے بھولے ریڑھی والے کو بلایا اور کہا: "یار بھولے! تو پھلوں
کی ریڑھی لگاتا ہے تو یہی بتا دے کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟" بھولے نے
ناک پونچھ کر کہا: "باؤجی! کچھ لوگ تو پھل فروٹ کھاتے ہیں اور جن کی جیب میں
مال ہے وہ تلی ہوئی مچھلی اور مرغے کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "اور باقی لوگ کیا کھاتے ہیں؟"
"باقی لوگ باؤجی!.... وہ سب کھیہہ کھاتے ہیں۔"

"کھیہہ؟ یعنی مٹی یا دھول؟"
"نہیں باؤجی! مٹی اور دھول اور چیز ہوتی ہے۔ کھیہہ اور چیز ہوتی ہے۔ اس
میں مٹی اور دھول بھی ہے۔ کوڑے کے ڈھیروں کی بو بھی ہے۔ اور گھوڑوں کی لہد
بھی ہے۔ لاہور کے شہری زیادہ تر یہی کھاتے ہیں۔"
مجھے امید ہے کہ لاہور کے شہری کیا کھاتے ہیں؟ کا سروے کرنے والا محکمہ
ان حقائق کو مد نظر رکھے گا اور اس کا کام آسان ہو جائے گا۔ یعنی لاہور کے شہری
شادیوں میں مرغ اور بیٹر کھاتے ہیں اور عام زندگی میں عام طور پر صرف "کھیہہ"
کھاتے ہیں۔

انجمن کیدا فروشاں کی حلف برداری

پچھلے دنوں مجھے ایک عجیب و غریب محفل میں شرکت کرنے کا موقع ملا.... اور آج بھولے نے کہا کہ جی ہجاری دستار واپس کر دو۔

دراصل ہوا یہ کہ بھولا جو گوالمنڈی بازار میں ریڑھی لگا کر پھل فروٹ بیچتا ہے۔ میرے پاس آیا.... وہ روزانہ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے "باؤجی لے لو.... آج سستے ہیں.... باؤجی آج میں نے کیلے لگائے ہیں۔ دو درجن بھیج دوں.... سیب بڑے سرخ لایا ہوں منڈی سے...." اور میں اس روز کی اپنی مالی پوزیشن کے مطابق کبھی کچھ خرید لیتا ہوں اور اکثر اوقات بھولے آج نہیں کہہ کر اسے مال دیتا ہوں.... لیکن اس روز جب بھولا میرے پاس آیا تو کہنے لگا "باؤجی حلف لے لو.... میں نے پوچھا سستے ہیں؟"

کہنے لگا "باؤجی میں پھل فروٹ کی بات نہیں کر رہا.... حلف کی بات کرتا ہوں۔"

"حلف؟ میں نے پریشان ہو کر کہا "کس قسم کا حلف؟"

"اوجی آپ اخباروں میں نہیں دیکھتے.... تصویریں چھپتی ہیں کہ فلاں انجمن کے عہدیداروں سے فلاں باؤجی حلف لے رہے ہیں اور ان باؤجی کی دستار بندی ہو رہی ہے...."

مجھے معلوم نہیں تھا کہ بھولا حالات حاضرہ پر اتنی گہری نظر رکھتا ہے۔ اس قسم کی دوچار تصویریں تقریباً ہر روز اخباروں میں چھپتی تھیں۔ میں نے بھولے سے ذرا وضاحت طلب کی تو کہنے لگا "باؤجی ہم نے ایک انجمن کیدا فروشاں بنائی ہے کھ اس کی حلف برداری

ہو رہی ہے آپ آؤ اور ہم سے حلف لے لو یہ شہرت حاصل کرنے کا ایک نادر موقع تھا اور میں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا چنانچہ فوراً حامی بھر لی۔

اگلے روز میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کے لئے پہنچا جو بھولے کے گھر میں منعقد ہو رہی تھی وہاں انجمن کیدا فروشاں کے دیگر عہدیدار بھی موجود تھے جنہوں نے مجھے گیندے کے بار پہنائے اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ان عہدیداروں میں شیدا، باؤٹوٹی، مولوی، اچھا وغیرہ شامل تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا لڈوؤں کا ایک ڈبہ اٹھائے اندر آیا بھولے نے ڈبہ لیا اور کہا "پیسے باؤجی سے لے لو خوش قسمتی سے کچھ رقم جیب میں موجود تھی اس لئے ادائیگی کر دی پھر ایک صاحب "دہی بھلے" لے کر آئے۔ بھولے نے دہی بھلے قابو کر کے کہا "باؤجی اسے بھی فارغ کر دو" مجھے فوراً اسے بھی فارغ کرنا پڑا.... پھر باؤٹوٹی نے کہا "درجن گٹے کے بار جو لائے ہیں لو ہاری سے تو باؤجی ان کی پے منٹ بھی کر دو...." اس پر میں نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو بھولا کہنے لگا "باؤجی یہ تو رواج ہے جی.... جو بھی حلف لینے آتا ہے خرچہ اسی کا ہوتا ہے...." میں شہرت کی حرص میں پھنس چکا تھا اس لئے ہاروں کے پیسے بھی ادا کر دیے.... پھر سب حضرات میرے گرد کھڑے ہو گئے ان کے ہاتھوں میں ایک ایک سادہ ورق تھا۔ ایک ورق انہوں نے مجھے بھی تھا دیا اور کہا "اوجی بسم اللہ کرو حلف لو" مقامی فوڈ گر افرا پنا کیمبرہ تان کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بھولے اس کا غڈ پر تو کچھ لکھا ہی نہیں ہوا.... میں کیا حلف لوں؟"

"بس جی تم لے لو"

"لیکن کیسے لے لوں؟"

"آپ بھی بھولے بادشاہ ہو۔ آپ کا غڈ کو دیکھو۔ اور ہم سب کیسے کو دیکھتے ہیں"

اس طرح حلف لے لو چنانچہ میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور تصویر اتر گئی۔
پھر میری دستار بندی کی تقریب ہوئی۔ میوہ ہسپتال کے باہر فر دست ہونے والے
پرانے پردے کے ٹکڑے کو میرے سر پر باندھ دیا گیا اور تصویریں اتاریں گئیں۔ پھر لٹروں
اور وہی بھلوں کی دعوت ہوئی۔

اگلے روز بھولا میرے پاس آیا اور تقریب کی تصاویر میرے سامنے رکھ دیں لو باؤجی
انہیں اخبار میں چھپوا دو۔

”بھئی یہ میرا کام تو نہیں۔ میں کیسے چھپوا دوں؟“

”باؤجی یہ کام بھی حلف لینے والے کا ہوتا ہے۔..... ہم نے تو پہلے پوچھ لیا تھا
”انجمن چکر چھوٹے فرد شان“ اور ”انجمن لڈو پیٹھیاں فرد شان“ والوں سے..... نہ ہم نے
آپ کی دستار بندی نہیں کی؟ اب فوٹو چھپواؤ۔“

یہ اب فوٹو چھپواؤ“ اس نے خاصے دھمکی آمیز لہجے میں کہا..... اور جاتے جاتے
اس نے فوٹو گرافر کا بل بھی وصول کر لیا۔

اب میں یہ چاہتا تھا کہ اخباروں میں تصویر چھپے اور میری شہرت کل عالم میں
پھیل جائے لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا..... اور اسی نے
بھولا آج میرے پاس آیا تھا اور وہ بے حد غصے میں تھا ”باؤجی اگر ہماری تصویریں
نہیں چھپا سکتے تو ہماری دستار واپس کر دو۔“

اب یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔ میں اپنی دستار واپس کر دوں؟..... اور اگر
واپس کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا کیونکہ پرانے پردے کا وہ ٹکڑا اب گھر کے جھاڑو
کے کام آتا ہے..... اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟ دستار واپس کر

دوں؟

اونٹ بھائی جان کا چالان ہوگا

کارواں سرائے میں آج اونٹ آگئے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق سعودی عرب میں عنقریب اونٹوں کو ریفلیکٹر پہنانے جائیں
گے تاکہ ڈرائیور انہیں اس وقت دیکھ سکیں جب وہ راہ بھٹک کر سڑک پر نکل آتے
ہیں۔ اس سلسلے میں تیار کیے جانے والے ریفلیکٹر کی آزمائش جاری ہے کہا جاتا ہے
کہ یہ بھولے بھالے اونٹ رات کے وقت کاروں کی زد میں آکر ہلاک ہو جاتے
ہیں اور ریفلیکٹر انہیں بچانے کے لئے پہنانے جائیں گے۔...

ابھی تک شاید یہ طے نہیں ہوا کہ ریفلیکٹر اونٹ کو کس طرح پہنانے جائیں
گے۔ اور اس کے جسم کے کونے حصے پر لگائے جائیں گے۔

ہمارے بچپن میں ریفلیکٹر کو سرخ بتی کہا جاتا تھا اور یہ سائیکلوں کے پچھلے منڈ گاڑ
پر لگے ہوتے تھے۔

گرمیوں کی تپتی دھپ میں ہمیں مال روڈ سنسان پڑی تھی اور میں اپنے کلاس فیلو
جمال کو اپنے سائیکل کے کیرئیر پر بٹھائے سکول سے واپس آ رہا تھا جی پی او کے چوک
میں ایک جانیٹا لیتا ہوا ٹریفک کانسٹیبل کھڑا تھا جسے دیکھ کر ہم فوری طور پر سائیکل
سے اتر گئے کیونکہ ان دونوں ڈبلنگ سے چالان ہو جایا کرتا تھا جب ہم کانسٹیبل کے
قریب سے گزرنے لگے تو اس نے ہمیں روک لیا ”اؤٹے ڈبلنگ کرتے ہو منڈیو“
اس نے پوچھا۔

”نہیں جی“ میں نے ہلکا کر کہا ”ہم تو سکول ہی سے واپس آ رہے ہیں۔“

سنتری بادشاہ صبح سے "فارغ" تھے اور کسی آسامی کی تلاش میں تھے اس لئے جب انہیں اونٹ نظر آئے تو انہوں نے ہم لومڑیوں کو ہی پکڑ لیا کہ ایس ہمدرد پشتر است..... انہوں نے ہماری سائیکل کو بغور دیکھا اور پھر گرجتے ہوئے کہنے لگے "اے تمہاری تو سرخ جتنی ہی نہیں ہے..... اور واقعی سائیکل کا ریٹیکٹر یعنی سرخ جتنی نہیں تھی۔"

جمال نے ہمت کی اور کہنے لگا "جناب سرخ جتنی تو رات کے وقت ہونی چاہیے اب تو دوپہر ہے؟"

سنتری بادشاہ کو یہ تکنیکی اعتراض بے حد ناگوار گذرا اور انہوں نے جیب میں سے کاپی نکالتے ہوئے کہا "یہ ہونی تو چاہیے نا..... اگر تمہیں یہاں سے گھر پہنچتے پہنچتے رات جو جائے تو پھر....."

میں نے عرض کیا ہم اگلے چوک میں رہتے ہیں اور اس وقت ڈیڑھ بج چکا ہے اور ہم اگلے پانچ منٹ میں گھر پہنچ جائیں گے اور پانچ منٹ تک سورج غروب ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے.....

"تمہارا تو ہو گا چالان منڈو اور ساتھ میں تمہیں لے جاؤں گا تمہانے..... تم بھی حالات میں اور تمہاری سائیکل بھی؟"

یہ خوفناک دھمکی سن کر ناگہان لرزے لگیں حلق خشک ہو گیا اور ہم دونوں کو اپنی اپنی امی جان یاد آنے لگیں کیونکہ ہم چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے اور اس زمانے میں چھٹی جماعت میں پڑھنے والے بچے اتنے "ہوشیار" نہیں ہوتے تھے خاصے بزدل اور مسکین ہوتے تھے ہماری جیب بھی بالکل خالی تھی کیونکہ ہم اپنے جیب خرچ کو آٹھ چوہوں پر خرچ کر چکے تھے ایک آنے کا نان اور ایک آنے کے چھوٹے..... سنتری بادشاہ کی "خدمت" بھی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ بڑی سنجیدگی سے کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا..... تب میں نے جمال کو اپنا

کمال دکھانے کا اشارہ کیا اور اس نے ایک طویل بچکی بھری آنکھوں کو ملا اور پورا منہ کھول کر ایک دلدوز "با آ" کیا اور پھر چھپا چھم رونے لگا اس کا گریہ اتنا یکخت اور اندوہناک تھا کہ سنتری بادشاہ بھی ہنسنے لگا کہ اس لڑکے کو کیا ہوا ہے..... اور یہی جمال کا کمال تھا تمام ماسٹر اور سکول کے بچے اس کی اس خود کار رونے کی عادت سے واقف تھے اور اس سے دور ہی رہتے تھے کیونکہ وہ اتنی شدت اور بے چارگی سے رونا چلا جاتا تھا کہ اسے چپ کرانا مشکل ہو جاتا تھا اور جمال اس خدا داد صلاحیت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ چنانچہ یہاں مال روڈ کے چوک میں سنان دوپہر میں جمال اپنے کمال کا پورا پورا مظاہرہ کر رہا تھا رورو کر ہلکان ہو رہا تھا اور دور نزدیک سے راگبیر بھاگے چلے آ رہے تھے کہ اس چھوٹے بچے پر سنانے کیا ظلم ڈھایا جا رہا ہے لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر جمال نے ہچکیاں لیتے ہوئے "امی امی" بھی پکارنا شروع کر دیا..... یہ صورت حال سنتری بادشاہ کے لئے انتہائی تشویشناک تھی اور وہ لوگوں کو یقین دلارہا تھا کہ میں نے ہرگز ہرگز اس بچے کو کچھ نہیں کہا اور عوام یہ کہہ رہے تھے کہ تم نے ضرور کچھ کہا ہو گا ورنہ اس بچے کا اتنا برا حال نہ ہوتا..... قصہ مختصر ہم دونوں اس چوک میں سے فتح منڈ نکلے اور ہمیں دو معزز راگبیر گھر تک چھوڑنے آئے..... اس کے بعد جب بھی سکول سے واپسی ہوتی ہم "ڈبلنگ" کرتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے سنتری بادشاہ کے قریب سے گزر جاتے اور وہ ہماری جانب دیکھنے کی بجائے جی پی او کی گھڑی کی طرف منہ اٹھائے ٹائم دیکھتا رہتا۔

سوال یہ ہے کہ اگر ادنتوں کو بھی ریٹیکٹر لگا دیئے گئے تو ان کی بھی تو چھینک ہو کرے گی کہ کونسا اونٹ ریٹیکٹر پہنے ہوئے ہے اور کونسا اس کے بغیر قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے انہیں چیک کرنے کے لئے اونٹ تو بھرتی نہیں کیے جائیں گے سنتری بادشاہ ہی ہوں گے چنانچہ اکثر اوقات اس قسم کی صورت حال ظہور پذیر

ہوگی کہ ایک اونٹ چلا جا رہا ہے اور سنتری بادشاہ نے اسے روک لیا ہے اور ان کی گفتگو کچھ اس طرح کی ہوگی۔

”اونٹ بھائی جان“

اونٹ بھائی جان کھڑے ہو جاتے ہیں۔

”آپ کا ریفلیکٹر نہیں ہے..... چالان ہوگا..... تمہارا نام کیا ہے؟“

”لیکن جناب عالی اس وقت تو صبح کی تپتی ہوئی دوپہر ہے میرے پاس ذاتی

ریفلیکٹر موجود ہے جو میں رات کے وقت پہن کر نکلتا ہوں..... اس وقت اس

کی کیا ضرورت ہے؟“

”میں کہتا ہوں نام بتاؤ اپنا“

”شتر بے مہار“ جواب ملتا ہے ”لیکن سنتری بادشاہ ٹھہریے میں آپ کو چند ایک

شتر غمزے دکھاتا ہوں“

اونٹ نہایت عمدہ قسم کے شتر غمزے پیش کرتا ہے لیکن سپاہی پر کچھ اثر نہیں

ہوتا اور وہ چالان کرنے پر مصر ہے..... تب اونٹ اپنی تھوٹھنی اس کے قریب

لاتا ہے اور کہتا ہے ”اگر تم میرے شتر غمزے نہیں دیکھتے تو میں تمہیں شتر کینڈہ دکھاتا ہوں“

اونٹ اپنے دانت نکالتا ہے منہ کھولتا ہے سپاہی کو دبوچ کر زمین سے اٹھاتا

ہے اسے چند ایک جھٹکے دیتا ہے سنتری بادشاہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اونٹ

لبے لبے ڈگ بھرتا چلا جاتا ہے۔

بچہ کٹر میں

ادارہ تخلیق کی جانب سے صحافی خاتون سلمیٰ جبین حال متیم برمنی کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا اور میں اس میں شامل ہونے کے لئے دکان سے باہر آکر اپنے بوسیدہ موٹر سائیکل کو لگبلیں لگا رہا تھا کہ معراج پتھر وارد ہو گیا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟ اس نے پوچھا۔

”کہیں بھی نہیں“ میں نے کہا میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

”یہ بچہ کیا ہے؟ اس نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اچھا ہے میں نے جواب دیا۔

”تمہارا بھتیجا ہے“ اس نے فخر سے کہا۔

میں نے بچے کو شتابی سے پیار کیا۔ شتابی سے اس لئے کہ مجھے پورے پانچ بجے

اس محفل میں پہنچنا تھا اور محفل انٹرکان ہوٹل میں تھی اور میں نے دوپہر کو بھی کچھ

نہیں کھایا تھا کہ گوالمنڈی میں بیچ کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ شام کا انتظار کیا جائے

اور انٹرکان کے خنک ہال میں کافی کے ہمراہ پیئیز، سینڈویچ اور پیٹریاں نوش کی

جائیں۔ چنانچہ میں چاہتا تھا کہ معراج پتھر جلد از جلد رخصت ہو جائے لیکن معراج

پتھر چپل اتار کر پاؤں کرسی کے اوپر رکھے بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا

رہا تھا وہ جلدی میں نہیں تھا۔

”اچھا تو یہ تمہارا بیٹا ہے“ میں نے ایک مرتبہ پھر بچے کو قدرے اطمینان سے

پیاد کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ کہنے لگا۔ پچھلے ہفتے پتہ ہے کیا ہوا۔ میں جناب اسے سکول سے واپس لا رہا تھا سکول پر یہ پیچھے بیٹھا کھیرے کھا رہا تھا گوروارجن نگر نہیں۔ یہ موٹر پر... وہاں پر جناب تارڑ صاحب ایک گٹر تھا سکول پر اچھلا پیچھے سے یہ اچھلا سیدھا جتنا نالی کھلے گٹر میں۔

”نہیں... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔ بچہ گٹر میں؟

”ہاں جی پورا کا پورا بچہ گٹر میں... کیوں اونے چپ کیوں بیٹھا ہے چلے کو بتاناں کہ گٹر میں چھال کس طرح ماری تھی؟ بچہ قدرے شرمندہ ہو کر کہنے لگا۔ ”آہو جی میں گٹر میں جا پڑا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔ دراصل معراج پتھر جس پر مسرت اور پُر لطف انداز میں یہ کتھا بیان کر رہا تھا اس سے لگتا یوں تھا کہ بچہ گٹر میں نہیں بلکہ انٹرکان کے سونگ پول میں جا گرا تھا۔ بہر حال اب تو گرنے والے نے بھی نصیحت کر دی تھی۔ معراج پتھر نے ایک طویل سوتا لگایا اور کہنے لگا۔ ”ہونا کیا تھا؟... مجھے تو جناب پتہ تھا کہ بندہ ڈوبنے سے پہلے دوسرے تہ پانی کے اوپر ضرور بر ضرور آتا ہے، میں سکول چھوڑ کر گٹر کے عین اوپر... تیار یہ پہلے تو گیا ہی گیا پھر ایک دم جو اس کا سر اوپر آیا تو میں نے بالوں سے پکڑا اور باہر گھر جا کر دیگ چڑھائی مسکرانے کی... کیوں اوسے پھر تو نہیں گرے گا گٹر میں؟

بچہ مسکرانے لگا۔

معراج پتھر خاصے دنوں کے بعد میری طرف آیا تھا اور میں اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میاں مجھے انٹرکان کی کافی اور سینڈ وچ بلا رہے ہیں تم جاؤ... چنانچہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا ”معراج اور کیا حال ہے؟“

معراج پتھر نے سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کیا حال ہے؟ میں نے دریافت کیا۔...

وہ اطمینان سے بیٹھا رہا اور کہنے لگا۔ ”اس کے علاوہ بھی ٹھیک ہے۔...

یوں لگتا تھا جیسے انٹرکان کا بیچ بستہ ہال اور کافی میری قسمت میں نہیں تھے

تھوڑی دیر کے بعد معراج پتھر تیوری چڑھا کر بولا۔ ”آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا تو میز پر لگے مار کر کہنے لگا۔ ”وہ خانہ خراب بچوں کے چالان

کر رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کون؟“ معراج نے ناراض ہو کر میری طرف دیکھا اور

بے حد اس ہو کر بولا۔ ”تم نے نہیں پڑھا اخبار... کراچی کی پولیس ان تمام لوگوں کا

چالان کر رہی ہے جو بچوں کو سکول اور موٹر سائیکلوں پر بٹھاتے ہیں ناں تارڑ صاحب

آپ بتاؤ... ہم جیسے غریب غربا اپنے بچوں کو گھر چھوڑ جائیں؟... ہمارا جی

نہیں چاہتا ہال بچے ساتھ لے کر آس کر یہیں کھانے کو... اور جناب کراچی پولیس

ذرا یہ بتائے کہ بچے جناب سکول کس طرح پہنچیں گے وہ واپس کیسے آئیں گے؟ سب

کے پاس تو کاریں نہیں ہوتیں... بسوں اور وگیزوں کا جو حال ہے تم کو معلوم ہے

وگیزوں والے تو بچوں کو بٹھاتے ہی نہیں کہ پیسے کم ملیں گے اور بس شاہوں پر جو حال

ہوتا ہے گرمی میں۔ ناں تم بتاؤ کہ ہم لوگ اپنے بچوں کے خلاف ہیں؟... ناں کس

پر جائیں یہ سکول؟ معراج پتھر قدرے غصے میں تھا اور میں جلد از جلد انٹرکان پہنچنا چاہتا

تھا۔ چنانچہ میں نے اسے سمجھایا کہ بھئی کراچی کی پولیس چالان کر رہی ہے ناں، لاہور میں

تو ایسا نہیں ہوا۔ اس نے سگریٹ فرش پر پھینکا اور بازو لہرا کر کہنے لگا۔ ”ہو جائے گا

لاہور میں بھی ایسا۔ ٹریفک پولیس کا اور کام کیا ہے۔ ہم جیسے غریب غریب کو تنگ کرنا اور

پھر میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ ہم پاکستانی اپنے بچوں کے سخت خلاف ہیں پرائیویٹ

سکولوں نے لوٹ چھائی ہوئی ہے اس کو دیکھو... چھٹی کے وقت جس طرح نئے نئے

بچے دگینوں اور بسوں کے پیچھے بھاگتے ہیں کبھی جا کر دیکھو.... کوئی گھسنے نہیں دیتا ان کو بسوں میں....؟

”تو میں کیا کروں؟“

”آپ! آپ نے کیا کرنا ہے میں تو ویسے ہی دل کی بھڑاس نکال رہا تھا لیکن تارڑ صاحب یہاں لاہور میں گر پولیس نے بچوں کے چالان کیے ناں تو بہت بڑا ہوگا۔ لڑائی ہو جائے گی چل اوسے گھر چلنے تیری بے بے انتظار کر رہی ہوگی، ساما بیگم، معراج پتھر نے اپنے بچے کو اٹھایا اور سکوتر پر بٹھایا اور بارن بجاتا ہوا چلا گیا میں بھی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھا اور بارن بجاتا انٹرکان پہنچ گیا ہاں میں پہنچا تو نشست کا آغاز ہو چکا تھا اور شہر کے ادیب سلعی جہیں سے ان کے قیام جرمنی کے بارے میں مختلف سوالات پوچھ رہے تھے میں گرمی سے بولایا ہوا تھا اور ایرکنڈیٹنگ کی ریخ بستہ ہوا کو اپنے بدن پر پھیلتے ہوئے راحت محسوس کر رہا تھا کہ یکدم عذرا اصغر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ”آپ بھی سلعی جہیں سے کوئی سوال پوچھیں گے؟“

”جی ہاں“ میں نے ہر بڑا کر کہا یہ فرمائیے کہ کیا جرمن قوم بھی اپنے بچوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو ہم کرتے ہیں؟

”سلعی جہیں مسکرائیں اور کہنے لگیں ”میرا خیال ہے آپ پر گرمی کا اثر ہو گیا ہے پہلے کچھ سینئر وچرز لیجئے کافی پیجئے پھر اطمینان سے پوچھئے گا؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں“ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جرمنی میں بچے گھڑوں میں گر جاتے ہیں؟ کیا ان کے چالان کیے جاتے ہیں؟

”آپ پہلے تھنڈا پانی پیجئے“ ویٹر نے میرے سامنے پانی کا گلاس رکھ دیا اور میں سر جھکا کر شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔

کٹا اخلاقیات

میرے ایک پڑوسی خان صاحب کا کہنا ہے کہ ایک کتے میں چاہے وہ اعلیٰ نسل کا اسیشن ہو یا بازاری قسم کا ڈگ کٹا سات ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اگر انسان اپنے اندر پیدا کر لے تو باقاعدہ ولی اللہ ہو جائے اور پہنچ جائے ”پہنچ“ جانے سے ان کی مراد فوت ہو جانا نہیں بلکہ مالک حقیقی کا قرب ہے۔ پہلے پہل تو میں نے اس بیان کو ان کی کٹا پسندی پر محمول کیا اور بعید از حقیقت جانا مگر کچھ عرصہ بعد جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کچھ سچائی بھی پائی جاتی ہے.... مثلاً مالک سے وفاداری... چاہے وہ کھانے کو دے یا نہ دے، بھوکا رکھے، پیاسا رکھے مگر وہ اس کا در نہیں چھوڑے گا۔ پھر مالک کے گھر کی پاسبانی.... تاکہ کوئی چور اچکا اندر نہ داخل ہو اور راتوں کو جاگنا.... تاکہ مالک کے آرام میں خلل نہ واقع ہو.... اور صبر.... جو مل گیا کھایا اور ہمیشہ دم ہلا کر تشکر کا اظہار کیا.... ہمارے صوفیائے کرام نے بھی اپنے مالک کے بارے میں یہی طریقہ کار اختیار کیا انہوں نے اپنے آپ کو اس کے در کی کٹی کہا.... بابا بلیے شاد نے صرف راتوں کو جاگنے کو ہی افضل قرار نہیں دیا۔

راتیں جاگن کتے بتیتھوں اُتے

میرے ایک دوست نے گھر کی رکھوالی کے لئے کہیں سے ایک عدد کتہ راہصل کیا اور اس کا نام فلسطینیوں کے قاتل اسرائیلی شیردن پر رکھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے نہایت شرمندگی سے اعلان کیا کہ بھئی میں نے اپنے کتے کا نام بدل دیا ہے اور ٹونی وغیرہ رکھ لیا ہے کیونکہ جانور تو اتنا پیار کرنے والا اور وفادار ہے کہ اس کا نام شیردن

رکھنا بہت ہی زیادتی ہے آج مجھے کتے اس لئے یاد نہیں آ رہے کہ میں خواجہ سگ پرست قسم کی کوئی چیز ہو گیا ہوں بلکہ اخبار میں ایک خبر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پیرس میں کتوں کے لئے ایک خصوصی ہوٹل کھولا گیا جس میں کتوں کے طعام و قیام کا مناسب بندوبست ہو گا۔ حسب پسند موسیقی سنوائی جائے گی اور کرسمس کے موقع پر اونی جرابوں کا تحفہ بھی دیا جائے گا۔ اہل مغرب کی ”کتا پسندی“ تو میرے علم میں تھی یہاں تک کہ امریکہ میں اب کتوں کی نفسیات کے ماہر باقاعدہ پریکٹس کرتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کا کتا بے حد اوس اور بخور بیٹھا رہتا ہے آپ کو دیکھ کر دم نہیں بلاتا تو ماہر نفسیات باقاعدہ اس کا نفسیاتی تجزیہ کر کے اس کا علاج کر دے گا۔ مگر ایک باقاعدہ ”کتا ہوٹل“ کا قیام میسر نہ ہو سکے گا بھی باعث حیرت تھا۔ کیونکہ کچھ سوال ہیں جو ذہن میں آتے ہیں مثلاً..... کیا اس ہوٹل میں ہر قسم اور ہر نسل کا کتا قیام کر سکتا ہے؟ کیا کتے بریوے اسٹیشن سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر خود ہی اس ہوٹل میں پہنچ جائیں گے یا انہیں وہاں پہنچایا جائے گا؟ اور ہوٹل پہنچنے پر وہاں کا مینجر کتا ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرے گا۔

شاید صورت حال کچھ اس قسم کا ہو کہ ایک بھاری بل ڈاگ بانپتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوتا ہے اور ریسپشن ڈیسک پر جا کر ایک زوردار ”بھوؤ بھوؤ“ کرتا ہے۔ مینجر جو ایک خوبصورت اور نازک سا فرانسسیسی پوڈل ہے قدرے ناگواری سے کہتا ہے: ”جناب بدتمیزی کا مظاہرہ مت کیجئے“

بل ڈاگ دانت نکوس کر غراتا ہے کہ کیا مطلب! یہ کوئی انسانوں کا ہوٹل تو نہیں، جہاں میں بھونک بھی نہیں سکتا..... پوڈل شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہے۔ نہیں جناب میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہمارے کمرے ساؤنڈ پروف ہیں وہاں جی بھر کر بھونک بیٹھے گا۔ اس کے بعد کچھ اس قسم کا مکالمہ ہوتا ہے۔

”یہ فرمائیے کہ آپ کے ہوٹل کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔“

”جی یہاں آپ کو گھر کا آرام ملے گا۔“

”وہ نہیں چاہیئے۔“

”تو پھر گھاٹ کا آرام ملے گا۔“

”یہ بھی نہیں چاہیئے کیونکہ میں دھوبی کا کتا نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ؟“

”اس کے علاوہ آپ کو ایک لوسے کی نلکی دی جائے گی تاکہ آپ دم سیدھی کر سکیں۔“

”وہ بھی نہیں چاہیئے..... میں دم کتا ہوں..... اور کچھ؟“

”ناشتے میں آپ کو ایک خشک بڑی دی جائے گی تاکہ آپ اسے چبا چبا کر اپنے تالو کو زخمی کر لیں اور اپنے ہی خون کے ذائقے کا لطف لیتے رہیں.....“

”یہ بھی نہیں چاہیئے کیونکہ میرے دانت نہیں ہیں۔ اور میں نقلی بٹیشی پہنتا ہوں۔ اس کے علاوہ؟“

”اس کے علاوہ ناشتے کے بعد ڈرائنگ روم میں ایک بلی چھوڑ دی جائے گی تاکہ اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر آپ اپنا نظام باضمہ درست رکھ سکیں۔“

”کونسی نسل کی بلی؟“

”کوئی بھی بلی۔“

”کوئی بھی بلی..... نہیں صاحب مجھے تو سیامی نسل کی بلی چاہیئے.....“

”وہ ہم نے رکھی تھی پچھلے دنوں مگر کتا حضرات اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے کی بجائے اسے دیکھ کر دم بلانے لگتے تھے اور ملاقات کا وقت مانگنے لگتے تھے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کے ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتا جہاں سیامی بلی نہ ہو۔“

بل ڈاگ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلا جاتا ہے۔

ایک نہایت متکبر بل ٹیر تر اندر داخل ہوتا ہے اور پوڈل سے پوچھتا ہے۔
”کیوں صاحب اس ہوٹل میں انسانوں کو ساتھ رکھنے کا بھی کوئی انتظام ہے؟“
”تو بہ تو بہ۔ یہاں انسانوں کا داخلہ ممنوع ہے جناب۔“

اچھا..... بل ٹیر ٹیر مایوس ہو کر کہتا ہے مجھے کوئی اور ہوٹل تلاش کرنا ہوگا
میرا مالک میرا سوٹ کیس اٹھائے باہر کھڑا ہے اور باہر بارش ہو رہی ہے یہ تو
نہیں ہو سکتا کہ میں مزے سے یہاں سو جاؤں اور وہ باہر کھڑا بھیگتا رہے... کتنا
اخلاقیات بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے اور بل ٹیر ٹیر باہر چلا جاتا ہے۔

اب ایک مہین سا خفیہ و زرار ہڈیوں کا ڈھانچہ کتا آتا ہے۔ جڑی لہجہ سے کمرے
کے بارے میں پوچھتا ہے پوڈل اسے ایک کمرے کی چابی دیتا ہے تب وہ مہین کتا ایک
سیٹی بجاتا ہے اور ہوٹل کے صدر دروازے کے پیچھے رد پوش کوئی درجن بھر کتورے ڈمیں ہلاتے
ہوئے اندر آتے ہیں اور اپنے والد کی معیت میں بیڑھیاں چڑھ جاتے ہیں۔ پوڈل آوازیں دیتا
رہتا ہے کہ جناب ایک کمرے میں اتنے بچے سلانے کی اجازت نہیں مگر مہین کتا دم
دبائے ہوئے اوپر جا چکا ہے۔

اس کے بعد ایک نہایت ہینڈم اور پراعتماد کتا اندر آتا ہے اور کمرے کے بارے
میں دریافت کرتا ہے پوڈل اس کی چال ڈھال اور شکل و صورت کا جائزہ لیتا اور پوچھتا ہے۔

”آپ فرانسیسی تو نہیں؟“ ————— ”نہیں“

”تو کیا آپ یورپین ہیں؟“ ————— ”نہیں“

”ایشیا یا افریقہ سے آئے ہیں؟“ ————— ”جی ہاں“

”تو پھر آپ کے لئے اس ہوٹل میں کوئی جگہ نہیں ہے آپ نے داخلے پر بورڈ نہیں پڑھا۔“

خوشگوار؟ شادی شدہ زندگی اور تاریخی بیویاں

عید الفطر کے موقع پر مجھے بھی عزیزوں دوستوں آتشہاؤں اور نادیدہ چاہنے والوں
نے رنگارنگ قسم کے عید کارڈ روانہ کیے ہیں۔ اور مجھے شرمندہ کیا ہے کیونکہ میں نے
حسب معمول اس مرتبہ بھی کارڈ بھیجنے سے پرہیز کی تھی۔ ان عید کارڈوں میں اسلامی
نیم اسلامی پھول پتیوں سے مزین ہلال عید اور اونٹ والے کارڈ بھی تھے اور شقائق احمد
بازو قد سید کا عید کارڈ بھی تھا۔ جس کے بارے میں منوجبانی نے پیبلک سے درخواست
کی ہے کہ اگر کوئی اس کارڈ کو سمجھ سکا ہو تو براہ کرم فوراً رابطہ قائم کرے اب یہ ضروری
تو نہیں کہ ہر بات سمجھ میں آجائے کل کلاں منوجبانی ”تو تا کہانی“ کے بارے میں بھی
یہی درخواست شائع کریں گے..... ویسے عید کارڈ بالکل سادہ ہے اس میں کوئی
پیچ یا گنجل نہیں ہے پیٹر وڈ الر کے بارے میں کچھ بیان کرنے کی کوشش ہے.....
بہر حال مجھے عید کے موقع پر جو سندیسے پہنچے ان میں سے ایک نہایت قیمتی اور مفید
دستاویز برآمد ہوئی ہے۔ یہ سائیکلو سٹائل کیا ہوا ایک پیغام عید ہے۔ جو سعید احمد
فارانی اسپر انٹرنیشنل مجیدیہ مکتب جہلم کی جانب سے روانہ کیا گیا ہے اس پیغام کے
مندرجات پڑھ کر یکدم میری زندگی کے خوشگوار ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں
ویسے میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ برغور دار سعید احمد فارانی نے اس قسم کا پیغام مجھے
ہی کیوں روانہ کیا ہے حالانکہ میں اور میری بیگم یا کم از کم میں تو بے حد مدھم آواز
میں اپنا نکتہ نظر بیان کیا کرتا ہوں۔ اب آپ بھی اس پیغام کی تفصیل پڑھ لیجئے ہو
سکتا ہے آپ کی زندگی بھی سنور جائے فارانی صاحب لکھتے ہیں۔

لکھا ہے محترمہ بیگم تارڑ تو نہیں لکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا کو علم ہے کہ تم کیسے خاوند ہو..... چنانچہ اس ہدایت نامے پر عمل شروع کرو تا کہ عید اچھی گزر جائے؟ یہ کہہ کر محترمہ واپس باوچی خانے میں چلی گئی۔

ہدایت نامہ چونکہ سا بیکوستان لکھا ہوا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ بے شمار خاوندوں کو پوسٹ کیا گیا ہے۔ اور مجھے شک ہے کہ یہ خاوندوں کے خلاف ایک گہری سازش ہے۔ اور اس کے پیچھے بھی کسی بیگم کا ہاتھ ہوگا۔ شاید بیگم سعید احمد فارانی کا..... یعنی فارانی صاحب نے سوچا کہ اپنی زندگی تو جیسے کیسے گزر رہی ہے۔ عید کے موقع پر دیگر پاکستانی خاوندوں کی زندگی بھی اجیرن کیوں نہ کی جائے حالانکہ میں تو ان بہادر خاوندوں میں سے ہوں جو بیویوں کا کہنا بالکل نہیں مانتے یعنی اگر میں اُس بی بی سے غورزدہ ہو کر پلنگ کے نیچے گھس جاؤں تو بے شک وہ لاکھ منتیں کریں لیکن میں کبھی باہر نہیں نکلتا..... اپنے فیصلے ہمیشہ میں خود کرتا ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ بیگم اس پیغام میں دس ایسی ہدایات ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے ہم ایک خوش گوار زندگی گزار سکتے ہیں۔

بیگم نے ناک چڑھا کر کہا کیوں اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میں نے جینپ کر کہا کہ بھئی تکلیف تو بالکل کوئی نہیں لیکن یہ جو کبھی کبھار ہفتے میں صرف سات آٹھ بار ہمارا خنیف سا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ یا تم میرا ڈٹی پانی بند کر دیتی ہو۔ یا دیر سے آنے پر گیٹ نہیں کھولتیں وغیرہ وغیرہ تو یہ والی صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں ایک ایک کر کے مندرجہ بالا اصول پڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی بیگم کا موڈ بہتر ہونے لگا۔ اور آخر میں وہ باقاعدہ مسکرانے لگی۔ کہنے لگی "اللہ بھلا کرے اس لافانی کا اس نے بہت اچھی باتیں کہی ہیں۔ تم فوراً ان پر عمل کرنا شروع کر دو"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "میں عمل کرنا شروع کر دوں؟"

"تو اور کیا..... یہ اصول تمہارے لئے ہی تو لکھے گئے ہیں"

"لیکن بھئی اس میں کہیں یہ نہیں لکھا گیا کہ یہ ہدایت نامہ خاوندوں کے لئے ہے۔ اس میں تو دوسرے فریق یا شریک زندگی کے حوالے سے بات کی گئی ہے؟"

"تو کیا تم میرے شریک زندگی نہیں ہو؟"

"کہہ سکتے ہیں"

"کیا مطلب کہہ سکتے ہیں..... ہو یا نہیں"

"ہوں؟ میں نے اقرار کیا۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا؟"

"تو پھر یہ اصول تمہارے لئے ہیں..... خط کے اوپر محترم جناب تارڑ صاحب

پراٹھانیں گے کہیں گے کہ ہمیں پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ جیتیں گے۔ پوری قوم کی دعاؤں کی دھر سے جیتے ہیں..... ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر بار جاتے تو کیا ہماری بد دعاؤں سے بار جاتے؟

”لیکن تم کو کیا اعتراض ہے ان کے جیتنے پر؟“

”یہی کہ میں اب ہوائی اڈے پر نہیں جاؤں گا۔ ان کو بار ڈالنے کے لئے.. میں نے سوچا ہوا تھا کہ اگر یہ بار گئے تو پھر جاؤں گا تاکہ ان کو پتہ لگے کہ ہاجیت تو ہوتی رہتی ہے ہم اپنے کھلاڑیوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں اگر وہ کوشش کے باوجود بار جائیں..... اب تو لوگ ان کے استقبال کو جائیں گے ہی۔“

”بس یہی نقصان ہوا ہے۔“

”نہیں ایک اور بھی ہوا ہے..... حرام ہے صبح کا ایک گاہک بھی آیا ہو۔ پورا لاہور رات بھر میچ دیکھتا رہا ہے۔ اور اب سب لوگ گھروں میں پڑے سو رہے ہیں..... میں نے تو میچ دیکھا اور منڈی چلا گیا۔ وہاں سے آموں کی دس پیٹیاں خریدیں جو ابھی تک بند پڑی ہیں بازار جو سونے پڑے ہیں۔“

”یار ہاکی ٹیم تو جیت گئی۔ باقی کھلاڑیوں نے کیا کیا؟“

”باقیوں نے عیش کیا۔ سیر سپاٹا کیا۔ امریکہ کی سیر کی اور کیا کیا۔“

”میں نے ایک پاکستانی کو دیکھا تھا باکسنگ ٹڑتے ہوئے؟“

”وہی موٹا سا بندہ جو پہلوانوں کی طرح باکسنگ ٹڑتا تھا؟“

”آہو..... اس نے تو بے عزتی خراب کر دی..... ٹیلی ویژن دیکھتے

ہوئے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اڑ کر لپک میں چلا جاؤں اور دوسرے ہاکس کو جا کر گھسن پھیر دوں.....“

اس کے بارے میں تو اخبار میں آگیا تھا۔ باکسنگ ٹیم کے مینجر نے کہا ہے کہ

لپک کھیل

”اوسے بھولے، آج گاہکی کا کیا حال ہے؟“

”یار پچی آج تو صبح سے گاہک تو کیا کبھی تک نہیں آئی ریڑھی پر تم سناؤ۔“

”میرا بھی یہی حال ہے۔ لگتا ہے لاہوریوں نے پان کھانے چھوڑ

دیئے ہیں..... کوئی بندہ سپاری بھی نہیں مانگنے آیا مفت میں۔“

”بھولے یہ ہاکی میچ جیتنے کا بڑا نقصان ہوا ہے ہمیں چار ماٹے سونے کے

تمغے کے لئے سارے پاکستان نے نیند حرام کر لی..... ساری رات جاگتے رہے۔“

”یار شکر کرو کہ ہم جیت گئے۔ ورنہ وہ جرمن بھی بڑی جبر جنگ ٹیم تھی بس

قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔“

”بھئی قسمت نے ایک کا ساتھ ہی دینا تھا..... ویسے واقعی بڑی جبر جنگ

ٹیم تھی خون تھکوا دیا ہمیں۔“

”ہم نے نہیں خون تھکوا یا انہیں؟ ہماری ٹیم بھی تو برابر کی تھی..... پر جیتنے

سے مجھے بڑا نقصان ہوا۔“

”تمہارا کیا نقصان ہوا بھولے؟“

”بھئی میں نے ہارے کر جانا تھا۔ ہاکی ٹیم کے لئے ان کی واپسی پر۔“

”تو اب تمہیں کون روکتا ہے۔“

”اب تو وہ جیت کر واپس آ رہے ہیں ساری دنیا پہنچی ہوگی۔ ان کو کندھوں

ہمارے باکسر اس لئے ہار گئے کہ ان کے قدم چھوٹے تھے اور وزن کم تھا۔
"تو بڑے قدم کے لے جاتے جن کا وزن زیادہ ہوتا۔"

"اگلی مرتبہ لے جائیں گے۔ یہ تو ابھی پتہ چلا ہے ناں کہ چھوٹے قدم کے اور کم وزن کے باکسروں کو نہیں لے جانا چاہیے تھا۔"

"پہلے نہیں پتہ تھا۔؟"

"نہیں۔"

"یار تمہ تو باکی ٹیم نے ہی جیتنا ہوتا ہے تو پھر یہ ساتھ میں دوسرے بے شمار بندوں کو کیوں لے جاتے ہیں۔؟"

"تجربہ حاصل کرنے کے لئے۔"

"ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں تجربہ ابھی حاصل نہیں ہوا؟ ہوتا یہ ہے کہ ہمیں بے عزتی حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے تجربہ لے جاتے ہیں ہم سے تو مراد کو دالے ہی اچھے رہے دو دوڑیں جیت کر سونے کے تمغے لے گئے؟"

"پراکٹیک توڑ کی کو دوڑا کر انہوں نے لیا..... یہ کوئی اچھی بات نہیں حرم تمغہ ہوا..... دوسرا ٹھیک ہے....."

"دیے سنا ہے امریکہ والوں نے بے ایمانی بہت کی ہے.....؟"

"نہ کرتے؟..... انہوں نے مال خرچہ ہوا تھا..... ہم اگر کسی پہلوان کو اپنے ملک میں بلائیں تو جیتنے دیتے ہیں اسے۔؟"

"یار سنا ہے کہ روس والے ادھر اپنی کھیلیں شروع کر رہے ہیں اس ہشتہ لپک کے مقابلے میں۔"

"آہو..... جس طرح امریکہ والوں نے صرف خود تمغے حاصل کرنے کے لئے ہم جیسے غریب غزبا کو بلایا ہوا تھا اسی طرح روس والے بھی کریں گے۔"

"یار یہ روس اور امریکہ کوئی ایسی لمپک کیوں نہیں کرتے جس میں اور کوئی نہ ہو وہ صرف یہ دونوں ہوں اور خود ہی آپس میں فیصلہ کر لیں۔"

"نہ نہ وہ کوئی بے وقوف ہیں..... جس طرح لیڈر لوگ مردادیتے ہیں ناں عام لوگوں کو اور خود بیٹھے رہتے ہیں ایک طرف اسی طرح یہ بھی کرتے ہیں..... پہلے دیت نام میں امریکہ نے لمپک کھیلی اور اب روس کھیل رہا ہے

افغانستان میں۔"

"یار اس لمپک میں لڑکیوں کا ہاکی کا میچ بھی پڑا تھا؟"

"ہاں پڑا تھا بالینڈ نے جیت لیا۔"

"تو پھر یہاں علی وڈین پر کیوں نہیں دکھایا گیا؟"

"وہ نیکیرس پہن کر جو کھیل رہی تھیں بے شرمی کے ساتھ؟"

"نیکیرس تو والی بال کھیلنے والیوں نے بھی پہن رکھی تھیں بالکٹ بال میں بھی یہی لباس تھا۔ دوڑنے والیوں نے بھی نیکیرس ہی پہن رکھی تھیں بلکہ کینز نے تو لگتا تھا کہ نیکیرس بھی نہیں پہنی ہوئیں..... اور وہ نہانے والیاں جو تھیں انہوں نے تو حد مکافی ہوئی تھی۔ پھر ہاکی کیوں نہیں دکھائی؟"

"یار مجھ سے کیا پوچھتا ہے مجھ سے تو پوچھ کہ بھائی چچی ہندوستان سے سمنگل شدہ پان کہاں سے ملتے ہیں۔؟"

"ہندوستان سے..... کیوں خریدتے ہو سمنگل شدہ پان؟"

"وہاں ٹیشن پر کھلے عام بکتے ہیں..... اور گاہک بھی یہی مانگتے ہیں..... پر آج تو صبح سے گاہک کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ ہاکی میچ دیکھنے کے بعد ابھی

تک پورا لاہور سویا ہوا ہے۔"

"ہم جب بھی کسی میدان میں جیتتے ہیں اس کے بعد سو جاتے ہیں۔"

اور اگلی مرتبہ ہار جاتے ہیں۔

”کیا — ہم اگلے لمپک میں ہاکی پیچ ہار جائیں گے؟“

”تجھے کیا پتہ۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ ہاکی ٹیم واپس آنے گی۔ تو ان کی تعریفیں کر کر کے ان کا دماغ شراب کر دیں گے عمران خاں کی تعریفیں کر کر کے اس کی تانگہ نہیں خراب کر دیں؛ کندھوں پر اٹھائے پھریں گے۔ اگلے چار سال ان کی دعوتیں کرتے رہیں گے۔۔۔۔۔ بس وہ بھی پھنسنے خاں ہو جائیں گے، کرکٹ والوں کی طرح“

”نہ تو ان کو شائباش نہ دیں واپسی پر۔۔۔۔۔“

”شائباش تو دیں پر ان کا دماغ نہ شراب کر دیں۔۔۔۔۔ ویسے آپس کی بات

سب ہاکی پیچ ہمارے کھادیوں نے تو جیتا ہی نہیں یہ تو برگینڈر عاطف کی مہربانی ہے کہ ہم جیت گئے۔“

”وہ بھی کھیل رہے تھے؟“

”بھئی جب پاکستان ایک گول سے جیت رہا تھا اگر عیسیٰ اس وقت عاطف صاحب اپنا بیگ اٹھا لیتے تو جرمنی والے بھی گول کر دیتے ان کی مہربانی کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ہم جیت گئے۔“

”یار بھولے یہ لمپک کبھی پاکستان میں بھی ہو سکتی ہیں؟“

”نہ۔“

”نہ کیا؟ سیدھی طرح جواب دو۔“

”کبھی نہیں ہو سکتیں۔“

”کیوں؟“

”اے ہم پوری لمپک کھیڈیں ٹیلی ویژن پر تو دکھا نہیں سکتے تو سچ مچ زندہ کیسے دکھا سکتے ہیں اور پھر اس کے لئے لمبے مال کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم

تو غریب ملک ہوئے۔“

”غریب ملک میں اتنی ٹیوٹا، اتنی ہونڈا ہوتی ہیں؟“

”بحث نہ کیا کر میرے ساتھ جا اپنے پان پیچ۔۔۔۔۔ آگیا لمپک پر بحث کرنے والا۔“

”اور تو۔۔۔۔۔ تو اپنے کھٹے آم پیچ۔۔۔۔۔ مجھ کو کیا پڑی ہے امریکہ اور روس کی۔۔۔۔۔“

”آخر بہشت دس روپے دس روپے۔۔۔۔۔ ثمر بہشت۔“

”ساجی کا پان کھاؤ گے باؤجی؟“

ازن اٹ لولی

کہا جاتا ہے کہ ہر ملک کا موسم وہاں کے باشندوں کے مزاج، عادات اور زندگی کرنے کے دیگر عوامل پر اثر انداز ہوتا ہے سرد اور بریلے موسم مزاج کو بھی برف کر دیتے ہیں، انسانوں کی رگوں میں خون کی بجائے برف دوڑتی ہے اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے ہنستے کھیتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ جہاں بارشیں زیادہ ہوں وہاں ان ڈور مگر مریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ گرم ممالک میں صحت اور عشق میں گرمی ملتی ہے..... دنیا کے بیشتر ممالک کے موسم گرم سرد یا بھیگے ہوئے ہوتے ہیں پاکستان کی طرح نہیں ہوتے کہ گرمی آئے تو صبحوں جائے، سردی آئے تو برف بنائے اور بارشیں آئیں تو بہا کر لے جائیں... یہاں ایک نہیں کئی موسم ہیں اور اسی طور ایک نہیں کئی مزاج ہیں..... لیکن اس کے باوجود ہم عام طور پر موسم کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے۔ اس کا حوالہ ضرور دیتے ہیں کہ بھئی آج تو بہت گرمی ہے۔ لیکن اسے ایک روگ نہیں بنا لیتے اہل انگلستان ہم سے قدرے مختلف ہیں۔ انگلستان میں آمد کے پہلے چند روز میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھے..... جو کمزور بن گراؤ کی رو سے اپنے تئیں درست انگریزی میں بولتا تھا وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جو خوراک ملتی تھی اسے دیکھ کر ہی ابکیاں آتی تھیں اور سب سے بڑی مصیبت موسم تھا..... سردی بہت لگتی تھی اور میں کمبل میں منہ چھپائے لیٹا رہتا جب ہمت کر کے انگلستان کے کوچہ بازار میں نکلا تو وہاں ایک اور پرالم ہو گئی..... اگر بس کنٹر سے بات ہوئی ہے کسی دکاندار سے کچھ پوچھا ہے کوئی کلاس فیلو یا میجر مل گیا ہے تو اس کا فقرہ "ازن اٹ لولی"

ہوتا اور یا پھر "اوہ اس آفل" کہہ کر بات شروع کرتا اب میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر "ازن اٹ لولی" کا ترجمہ اردو میں کیا تو معلوم ہوا کہ "کیا یہ خوبصورت نہیں؟" کہا جا رہا ہے اور دوسرے فقرے کا مطلب "اوہ یہ خوفناک ہے" قسم کا بنتا ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کونسی چیز ہے جس کے بارے میں ایک انگریز بابا مجھے کیا یہ خوبصورت نہیں؟ کہہ رہا ہے۔ اور فلوئڈی دیر بعد ایک ویٹرس "اوہ یہ خوفناک ہے" بتا رہی ہے۔

پہلے تو میں نے جانا کہ شاید میری شکل کے بارے میں اہل انگلستان میں بھی اختلاف رائے ہے لیکن دو تین روز کے بعد معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو موسم کے بارے میں رائے دی جا رہی ہے۔ چنانچہ ایک ہی وقت میں ایک انگریز موسم کو گالی دے گا اور دوسرا تعریف کرے گا البتہ یہ ہے کہ ذرا سی دھوپ نے اگر بادلوں اور بارش میں سے جھانک لیا تو پوری انگریز قوم "ازن اٹ لولی" گانے لگتی ہے۔ مجھے ایک اور دشواری یہ پیش آئی کہ اور کوٹ چڑھا رکھے ہیں اور سرد بریلی ہوا میں چہرے کو بچ کر رہی ہیں اور شاید بارش بھی ہے اور انگریز پھر بھی بڑے اعتماد سے "ازن اٹ لولی" کہتے جاتے ہیں۔

ان دنوں تو برطانیہ کے لارڈ میئر بھی پاکستانی ہونے لگے ہیں لیکن ان دنوں برطانوی عوام پاکستان کے بارے میں قدرے غافل تھے۔ مثلاً پاکستان کے موسم کے بارے میں کچھ اس قسم کی گفتگو ہوتی۔

"سنا ہے تمہارا ملک بہت گرم ہے اور خوب دھوپ چمکتی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"پھر تو سب مزے سے دریا اور سمندروں کے کنارے بیٹھ کر دھوپ سینکتے ہوں گے؟"

"گرمی کچھ زیادہ ہوتی ہے....."

یعنی سوٹ نہ پہنیں تو بھی گزارہ ہو جاتا ہے؟
”جی ہاں..... لیکن گرمی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے“

”اچھا اچھا یعنی شام کے وقت ایک ٹکے پھلکے سوٹر سے کام چل جاتا ہوگا؟“
ان لوگوں کے ذہن میں اس گرمی کا تصور آہی نہیں سکتا جو بھونتی ہے اور جلتی ہے۔
برطانوی موسم گرما کا آغاز مئی میں ہو جاتا چاہیے لیکن ہوتا جون جولائی میں ہے
اور کئی مرتبہ بالکل نہیں ہوتا، سردیوں کے بعد سردیاں ہی شروع ہو جاتی ہیں ہر حال
انہی دنوں میں ایک مرتبہ میرے کچھ کلاس فیلوز نے مجھے سمندر کے کنارے گرمیوں کی
شب کی سو منگ پارٹی پر مدعو کیا جس کے لئے مجھے ایک سو منگ کا بیٹوم خریدنا پڑا۔
رات نو بجے سب لوگ ساحل پر جمع ہوئے۔ کپڑے بدلے اور سمندر میں چھلانگ لگنے لگے
میں جب کہیں میں سے کا بیٹوم پہن کر باہر نکلا اور ہوا کی دھبے سے میرے گھٹے بھرنے
لگے اور تپتی میرے اختیار سے باہر ہو کر جلتی لگ بھانے لگی میں نے ڈکیاں لگاتی ایک
خاتون سے پوچھا کہ بی بی پانی کیسا ہے؟..... وہ کہنے لگی ”اواش لولی“ میں نے غضب
کیا اور خاتون کے کہنے پر اعتبار کرتے ہوئے سمندر میں چھلانگ لگا دی..... اس کے بعد ہر
قسم کے پراغوں بلبوں ٹیوبوں وغیرہ میں روشنی نہ رہی اور میں لگے تین روز مکمل پیسے ٹول شوں کرنا بار بار
کا پتہ رہا.....

دراصل موسم بھی ذہنی حالت اور خواہش کے اظہار کے طور پر سامنے آتے ہیں کیا ہوا اگر
موسم بے حد سرد ہے۔ آپ ازن اٹ لولی کہہ کر اپنے آپ کو خوش تو کر سکتے ہیں۔ اگر پانی بھر
مٹھنڈا ہے تو آپ اسے گرم خیال کیجئے کچھ فرق تو پڑے گا۔ صرف تاریک پہلو دیکھیں گے تو
بالآخر کچھ نظر نہیں آئے گا..... ہم ہمیشہ شکایتیں ہی کرتے رہے ہیں ”اواش لولی“ سے بات
شروع ہوتی ہے۔ کبھی کہنا ”تو ازن اٹ لولی“ بھی کہنا چاہیے..... ازن اٹ لولی؟.....

سانپوں کا ادبی حل

ایک محل میں ڈر، خوف، دہشت اور خوفناک چیزوں کے بارے میں گفتگو ہو
رہی تھی۔ جب یہ طے پا چکا کہ حاضرین محل سب سے زیادہ اپنی بیویوں سے ڈرتے
ہیں تو پھر دیگر اشیا اور واقعات بھی زیر بحث آنے لگے۔
کسی نے کہا کہ جناب آپ نے کبھی شیر دیکھا ہے؟ میں نے بھی نہیں دیکھا
لیکن سنا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ دہشت ناک ہا نور ایک شیر ہے۔ اور اس
سے زیادہ دہشت ناک دو شیر ہو سکتے ہیں۔

ایک صاحب نے بھوت پریت کے بارے میں چند چشم دید واقعات
بیان کئے اور اپنے سفید بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ”حضرات میں جب
بھی کسی بھوت وغیرہ کو بچشم خود دیکھتا ہوں تو میرا ایک بال سفید ہو جاتا ہے اب
آپ اندازہ کریجئے کہ ان بھوتوں کی تعداد کتنی ہوگی جو میں نے ان گنہ گار آنکھوں
سے ملاحظہ کیے۔“

ایک بزرگ نے بیان دیا کہ جناب! مجھے تو سب سے زیادہ خوف لاش
سے محسوس ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا کس کی لاش سے؟ کہنے لگے کوئی بھی مردہ ہو
اسے دیکھتے ہی میری کپکپی بندھ جاتی ہے۔

کسی اہل زبان نے اعتراض کیا کہ بزرگو! وہ گلگلی ہوتی ہے جو بندھ جاتی
ہے، کپکپی نہیں۔ بزرگ نے فرمایا کہ یہی تو مرے دربار بات ہے کہ مردے کو دیکھ کر

گھسی تو کھل جاتی ہے لیکن کپکپی بندھ جاتی ہے۔

اس پر حاضرین محفل میں سے کسی ایک نے ایک ”مردہ“ لطیفہ سنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ آزادی سے پیشتر میڈیکل کالج کے چند طالب علم اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ مردہ جسم سے خوف زدہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ بیشتر افراد نے یہ کہا کہ جناب ہم علم بدن کے طالب علم ہیں اور جانتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی جسم میں کچھ نہیں ہوتا۔ دو چار روز میں خاک ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ذبح شدہ بکرے سے خوف نہیں کھاتے تو ایک مردے سے خوف زدہ ہونا چہ معنی؟ لیکن وہاں کچھ نوجوان ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ جناب سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن مردہ پھر بھی مردہ ہوتا ہے، خوف تو آتا ہے؟ جب بحث تیز ہوئی تو کسی صاحب نے تجویز پیش کی کہ جو صاحب مردوں سے بالکل نہیں ڈرتے وہ آج رات مردہ خانے میں جا کر مردہ نمبر چھ کے اوپر ایک عدد لڈو رکھ کر واپس آجائیں۔ دوسری صبح ہم جا کر چیک کر لیں گے۔ ایک نوجوان نے فوراً اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ اسی شب ہاتھ میں ایک عدد لڈو پکڑے مردہ خانے میں داخل ہوا۔ وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے قریب جا کر ان کے بستر نمبر پڑھے اور پھر بستر نمبر چھ پر پڑے ہوئے مردے کے سینے پر لڈو رکھ دیا۔ اسی لمحے چادر ہٹا کر مردہ اٹھ بیٹھا اور بڑے مزے سے لڈو کھانے لگا۔ نوجوان موصوف نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے دوستوں میں سے کوئی ایک اس کے آنے سے پیشتر مردے کی جگہ چادر اوڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق اس نے لڈو کھاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ آج ہی آج تو مردوں کی عیش ہو گئی۔

اس ”مردہ“ لطیفے پر بہت کم لوگ ہنسے اور اس خدشے کا بھی اظہار کیا گیا کہ دراصل وہ سچ مچ کا مردہ ہی تھا جس نے لڈو کھانا شروع کر دیا۔ اور یہ صرف

داستان ہے کہ وہاں کوئی اور لیٹا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اور مزید یہ کہ اس لطیفے سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ مردے لڈو شوق سے کھاتے ہیں۔ اس محفل میں چونکہ میں بھی شریک تھا، اس لئے مجھ سے پوچھا گیا کہ تارڑ صاحب آپ تو بقول آپ کے جنگلوں اور صحراؤں میں تن تنہا گھومے ہوئے ہیں، آپ کو سب سے زیادہ کس چیز سے خوف آتا ہے۔ میں نے کہا، سانپ سے۔ اور پھر موقع غنیمت جان کر انہیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا۔..... میں شاید دوسری یا تیسری جماعت میں تھا ہم لوگ گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران گاؤں چلے گئے۔ اور چونکہ مجھے شروع سے ہی سونگ وغیرہ کا بہت شوق تھا اس لئے وہاں پہنچتے ہی میں نے مقامی چھپر میں نہانا شروع کر دیا۔ اس پر والد صاحب قبلہ نے ہلکی سی مروت کر دی کہ نالائق گندے پانی میں نہاتا ہے۔ خارش ہو جائے گی۔ اگر اتنا ہی شوق ہے تو جا اور کھیتوں میں وہاں کپاس کو پانی لگا رکھا ہے۔ وہاں نہالے۔ چنانچہ میں چھپر سے نکل کر اسی قدر ترقی حالت میں کپاس کے کھیت میں چلا گیا۔

اب وہاں یہ پراہم تھی کہ پانی میرے گھٹنوں تک بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے ڈبکی تو لگ نہیں سکتی تھی، میں نے چلو سے اپنے آپ کو گیلہ کرنے یا ڈبونے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ جوں جوں پانی خشک کھیت میں پھیلتا جاتا ہے توں توں اس کھیت میں کچھ ہلچل سی مچی جاتی ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ پانی آہستہ آہستہ جنگلی چوہوں کے بلوں میں داخل ہوتا جاتا تھا اور چوہے ہر اسان ہو کر باہر نکلتے اور درکی لگا دیتے۔ اب مجھے بھی ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ میں کسی سوراخ میں پانی ڈالتا جاتا اور پھر کیدم کوئی موٹا سا چوہا اس میں سے پھدک کر باہر نکلتا اور ہوا ہو جاتا۔ چند چوہوں کو ان کے آرام وہ گھروں سے نکال کر میں ایک اور سوراخ میں پانی ڈال رہا تھا کہ اس میں سے ایک ایسا چوہا نکلا جو

بہر حال یہ تذکرہ تو امریکی سانپوں کا ہے جو بہت اعلیٰ نسل کے ہوتے ہوں گے۔ لیکن ہمارے پاس حوالے کے لئے خالص پاکستانی بلکہ لاہوری سانپ بھی موجود ہیں تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، بابے نذیر کو اپنے آس پاس پایا ہے۔ بابے نذیر کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اگر کل کلاں، خدا نخواستہ کل کائنات کسی عالمی جنگ کی حماقت سے نیست و نابود ہو جائے اور صرف بابا نذیر زندہ بچ جائے تو ان تمام اشیاء کو پھر سے "اسجاد" کر لے گا جو اس زمین میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں، مثلاً وہ ایک گھر بنا سکتا ہے، کیونکہ وہ راج گیری میں شدہ بدھ رکھتا ہے۔ پھر زمین میں فصل اگا سکتا ہے کیونکہ کھیتی باڑی بھی اس کا پیشہ رہا ہے۔ کھیتی باڑی کے لئے اوزار بنا سکتا ہے۔ اگر کہیں سے دو پہیے مل جائیں تو سائیکل بنا سکتا ہے..... کھانا پکا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ..... بہر حال یہی بابا نذیر جو ہمہ وقت مسکراتا رہتا ہے اور اسے زندگی سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوتی، چند روز پیشتر یک دم سنجیدہ موڈ میں پایا گیا تو میں نے پوچھا "بابو! کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں" بابے نے سر جھکا کر کہا۔

"کچھ تو ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

"یار بتا دو کیا بات ہے؟ ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں؟"

"تم نہیں کر سکتے؟"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا..... تم بتاؤ تو سہی؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں! بتا دو"

نکلتا ہی چلا گیا۔ قابل فہم طور پر یہ ایک سانپ تھا اور چوہا نہیں تھا۔ میں نے بڑی مردانگی سے اسے گردن سے پکڑ لیا اور پھر بڑے آرام سے ایک پتھر کی مدد سے اسے کچل دیا۔ اور اس کے بعد اس کی دہشت سے مجھے بخار ہو گیا..... حاضرین محل اس خوفناک قصے کو سن کر بے حد خوف زدہ ہوئے اور ان سب نے اقرار کیا کہ واقعی دنیا کی سب سے دہشت انگ شے سانپ ہے..... ویسے تو یہ قصہ سو فی صد سچ ہے لیکن آپ کے سامنے یہ اقرار کرتا ہوں کہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے غمزدگی سی گپ لگائی تھی اور وہ بھی قصے کے آخر میں۔ یعنی میں ایک سو رخ میں پانی ڈال رہا تھا کہ اس میں سے کوئی شے باہر آنے لگی۔ میں نے سمجھا کہ سانپ ہے۔ چنانچہ یہ بندہ حقیر اسی حالت میں ننگ بہ ننگ گاؤں کی طرف بھاگ گیا اور اسی خوف کی شدت سے بخار ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ادھر سانپ وغیرہ بالکل نہیں ہوتے اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ ایک مونچھوں والا عام سا چوہا تھا۔ آج بارے سانپوں کے جو کچھ بیان ہو رہا ہے اس کا بھی ایک ہلکا سا پس منظر ہے۔ ایک تو امریکہ کے ایک چڑیا گھر کی خبر بھی جس میں آنے والے ایک تماشاچی نے شکایت کی کہ چڑیا گھر کی انتظامیہ اس کے ساتھ دھوکہ کرتی رہی ہے۔ کیونکہ جس سانپ کو سانپ بنا کر بٹھا یا گیا ہے وہ ہے تو سانپ، لیکن ربڑ کا بنا ہوا ہے انتظامیہ کا کہنا ہے کہ اس آب و ہوا میں سانپ زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے اس لئے ہم نے پہلک کو مایوس کرنے کی بجائے یہ مناسب جانا کہ سچ مج کے سانپ کی جگہ وہاں ربڑ کا سانپ رکھ دیا جائے... دراصل چڑیا گھر کی انتظامیہ کو یہ اُمید نہ تھی کہ کوئی تماشاچی باقاعدہ ان کے سانپ کو ٹٹولے گا اور جان جائے گا کہ یہ تو ربڑ ہے کیونکہ اس میں جان بھی جاسکتی تھی۔ اگر سانپ سچ چمکا ہوتا تو پھر وہ صاحب اسے ٹٹولتے تو ان کی قبر پر کچھ اس قسم کا کتبہ تحریر ہوتا "ان صاحب کا خیال تھا کہ سانپ ربڑ کا ہے۔"

”میرے گھر کی چھت سے سانپ نکلے ہیں؟“
”سانپ؟“

”ہاں..... مونٹے مونٹے بھورے رنگ کے..... چھت کے شہتیروں کے اندر رہتے ہیں اور صبح صبح شہتیروں کے ساتھ نکلے نکلے گتے ہیں۔“
”تمہیں یقین ہے کہ وہ سانپ سہی ہیں؟ میرا مطلب ہے سفید رنگ کے پرانے رستے وغیرہ تو نہیں؟“
”تم خود آکر دیکھ لو کسی وقت۔“

اب ظاہر ہے مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ میں اس کے گھر جا کر ان سانپوں کو ٹول ٹول کر دیکھیوں کہ سپرچرچ کے ہیں یا نہیں، لیکن بابا ان کے جھوٹے سے بے حد اپ سیٹ ہے۔ اس کا بیٹا اور ہوا اسی روز مکان چھوڑ کر چلے گئے جس روز سانپوں کی جوڑی نے اپنا پہلا درشن کروایا تھا۔ بابا اس مکان کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور اس میں رہتے ہوئے اسے خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔

”اب بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“

بابے کے اس سوال پر میں خاموش ہو گیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر کسی شخص کے گھر میں سانپ جھوٹے ہوں، اس کی آپ کیا مدد کر سکتے ہیں۔ اس دوران ذوالفقار تابش ادھر آگیا۔ اس سے پوچھا کہ بھئی تم بابے کے لئے کچھ کر سکتے ہو؟ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ تب بابے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تابش صاحب جب آتے ہو، چائے پلاتا ہوں، پکوڑے لاکر دیتا ہوں۔ تمہاری ہومیوپیتھک دوائیاں لاکر دیتا ہوں۔ میرا یہ کام ضرور کرو۔ تابش نے پوچھا، مثلاً میں کیا کر سکتا ہوں؟ بابا کہنے لگا تم میرے گھر جا کر ان سے بات تو کرو۔ ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہاں سے پلے جائیں۔ تابش کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ البتہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، تاراج ہیں

اس مسئلے کا ادبی حل ڈھونڈنا ہو گا۔

”ادبی حل؟ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔“

”ہاں“ تابش اپنے ادھر رنگے بالوں میں اُنکی چلاتے ہوئے بولا ”سانپوں کو بھگانے کے لئے ہم مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے ہیں۔“
”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ تم جا کر انہیں اپنا کوئی سفر نامہ سنا دو۔“

”یہ تجویز مجھے پسند نہیں۔“

”تو پھر احمد داؤد اور رشید امجد کو پنڈی سے بلا کر انہیں کوئی جدید افسانہ سنایا جائے۔“

”پنڈی سے آنے جانے پر خرچ بہت ہو گا۔“

”کشور ناہید کو کہتے ہیں وہ انہیں نثری نظم کے بارے میں پیکر دے۔“

”نہیں یار۔“

”تو پھر چچا انتظار حسین کو کہتے ہیں کہ وہ انہیں چند محاورے سنائے۔“

”نہیں بھائی، وہ اہل زبان نہیں ہیں۔“

”امجد اسلام امجد کو بلا کر بلا کر کہتے ہیں کہ لو بھئی! انہیں تم وہی والے لطفی سنا دو جو تم جہیں سناتے ہو۔“

”سانپوں میں حس مزاج بہت کم ہوتی ہے۔“

”اگر وزیر آسمان دونوں یہاں ہوں تو ان سے کوئی انشائیہ سنا دیا جائے۔“

”نہ۔“

”اعظم جاوید کو بلا لیں؟“

”سانپ مادہ نہیں ہیں۔“

”اصغر ندیم سید کو کہتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے اپنا کوئی ساڈرامہ پڑھے.....“

آکٹوپس کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟

”بیگم کیا میں کتا غور ہوں؟“

”ہیں ہیں کیا کہہ رہے ہو.....؟“ بیگم کی غصیلی آواز باورچی خانے میں سے آئی۔

”کہہ میں یہ رہا ہوں کہ کیا میں کتے کھاتا ہوں؟“

بیگم چائے کی پیالیاں اور ٹوسٹ ایک چھابے میں رکھے باورچی خانے میں سے باہر آئی اور مجھے چشمکین نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کہنے لگی ”صبح ناشتے کے وقت تو کوئی ہوش کی بات کیا کرو، کتوں کی بات تو نہ کیا کرو۔“

”بس تم مجھے یہ بتا دو کہ کیا میں کتے کھاتا ہوں؟“

”.....؟ ظاہر ہے کہ نہیں.....؟“

”تو پھر مجھے شرم نہیں آتی چاہیے.....؟ ٹھیک ہے ناں؟“

بیگم نے قدرے فکر مند ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر چینی چائے میں ڈال کر پیالی میرے آگے کر دی۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد بیگم نے انتہائی سنجیدگی سے میرے چہرے کا معائنہ کیا اور

پھر کہنے لگی ”یہ کیا بات کی تھی تم نے کہ تمہیں شرم نہیں آتی چاہیے؟“

”اوہ! میں نے اخبار پر سے نظریں اٹھائیں کتے کھانے والوں کو شرم آتی چاہیے

اور چونکہ میں کتے نہیں کھاتا اس لئے مجھے تو شرم نہیں آتی چاہیے.....؟ ٹھیک

ہے ناں؟.....؟“

اور.....؟

”ٹھہرو ٹھہرو بابا اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا یہ تم میرے سانپوں کے بارے میں کیا اوٹ پٹا ہنگ منصوبے بنا رہے ہو۔ کمال ہے۔ آخر وہ سانپ ہیں، فی ہاؤس کے ادیب تو نہیں کہ ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کی جائے.....؟ مجھے نہیں منظور تمہاری یہ تجویزیں.....؟ میں اپنے سانپوں پر یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتا.....؟ ٹھیک ہے لٹکتے رہیں شہتیروں کے ساتھ۔ مجھے کیا کہتے ہیں؟ یہ کہہ کر بابا واک آؤٹ کر گیا۔

اگر کسی صاحب کے پاس شہتیروں سے لٹکنے والے سانپوں کے بارے میں اس کے علاوہ کوئی اور تجویز ہو تو براہ کرم مجھے ارسال کر دیں۔ شکریہ!

اس پر بیگم نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا وہ پکار پکار کر خلق خدا سے کہہ رہی تھیں کہ میرے میاں کا کچھ کر لو یہ میٹر ہو گیا ہے.....

”ٹھیک تو ہے؟..... وہ کہنے لگی..... لیکن یہ خیال تمہیں آیا کیسے؟
تب میں نے اسے وہ خبر دکھائی جس کی سُرخ تھی کتے کھانے والوں کو شرم آنی چاہیے اور جس میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ فلپائن کے نائب وزیر دفاع کو امریکہ اور یورپ سے اسی ہزار کارڈ موصول ہوئے ہیں اور ان تمام کارڈوں پر ایک ہی تصویر بنی ہوئی ہے جس میں ایک کتا روٹ کیا جا رہا ہے۔ اور نیچے درج ہے کتوں کا قتل عام بند کرو چونکہ فلپائن میں کتے نہایت شوق سے کھاتے ہیں اس لئے یہ کارڈ یورپ اور امریکہ کے ڈولرز کی جانب سے احتجاج کے طور پر روانہ کیے گئے۔

”تم کبھی کبھی شاید کوئے کھا جاتے ہو کیونکہ باتیں بہت کرتے ہو لیکن کم از کم کتے نہیں کھاتے ہو؟ بیگم نے ہنس کر کہا اور یہ ایک نا درہنسی تھی کیونکہ بیگم ہنسے پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی سے پیشتر اس نے جتنا ہنسنا تھا ہنس لیا۔

”تو پھر مجھے شرم کیوں آرہی تھی۔ میں نے پوچھا..... میں مجرم کیوں محسوس کر رہا ہوں؟
بیگم چپ ہوئی۔ سوچا اور پوچھنے لگی ”تم پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھاتے ہے ہو اور سیاحت کے دوران پتہ نہیں کیا کیا بدلا کھاتے رہے ہو..... کہیں اس دوران.....
نہیں نہیں“ میں نے فوراً کہا ”میں نے زیادہ سے زیادہ گھوڑا کھایا ہے یا آکٹوپس اور وہ بھی غلطی سے رکنا ہرگز نہیں کھایا“

میری بیگم ناشتے کی میز سے اٹھی اور ابکائیاں لیتی ہوئی منہ پر ہتیلی رکھے باوجود چٹائی کی طرف بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور غصہ سے کہنے لگی ”غضب خدا کا گھوڑے کھاتے رہے ہو؟“

”گھوڑے نہیں صرف ایک گھوڑا اور وہ بھی پورا نہیں بلکہ درچار ماشے گھوڑا.....

ہوایوں بیگم کہ ایک مرتبہ جنیوا سوئٹزر لینڈ میں جھیل کنارے ایک رستوران میں گیا اور وہاں پلوں کی ایک ڈش منگائی جس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے چار پانچ ٹکڑے تھے..... میں نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا تو وہ قدرے سخت تھا اور اسی وقت مجھے کچھ شک ہوا کہ یہ گوشت کہیں غلط قسم کا گوشت نہ ہو..... ویٹر سے پوچھا تو اس نے فرانسیسی میں کچھ بتایا..... میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے رستوران کے سامنے ایک جیسے کی جانب اشارہ کیا جو گھوڑے پر سوار ایک ایسے صاحب کا تھا جن کا ایک ہاتھ تلوار پر کے دتے پر تھا اور دوسرا شاید مجھے ہی سلام کر رہا تھا۔

”یہ گھوڑے کا گوشت ہے؟ میں نے ہراساں ہو کر پوچھا اور ویٹر نے خوش ہو کر سر ہلادیا..... بس میں نے اتنا سا گھوڑا کھایا ہے آج تک“
بیگم پھر ابکائیاں لے رہی تھی اور ان کے دوران اس نے صرف تین لفظ کہے ”اور وہ آکٹوپس؟“

ہاں وہ میں نے خوش ہو کر کہا ”ہسپانیہ میں ایک مرتبہ بہر حال وہ بھی غلطی سے ہی کھایا تھا..... ویسے بھی سمندری جانور تو حلال ہوتا ہے.....“
”وہی نان..... ہزاروں ٹانگوں والا خوفناک.....“
”ہاں ہاں وہی..... میں نے مزید خوش ہو کر کہا۔

”گھوڑے کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟ بیگم نے ایک ابکائی لی، ایک مکہ میز پر مارا اور اٹھ کھڑی ہوئی ”اور آکٹوپس کھاتے ہو شرم نہیں آتی؟“
”بھئی پورا گھوڑا تو نہیں کھایا تھا قسم لے لو.....“

”مجھے نہیں معلوم تھا میرے ساتھ جس شخص کی شادی ہوئی ہے وہ گھوڑے کھاتا ہے ہائے میری قسمت.....“
نمبردار جو ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا

تو... تو بہ تو بہ آگے تو بہ... تو بہ تو بہ... گھوڑے کھانے والوں کو شرم آتی
چاہیے۔ یہ کہہ کر بگیم واک آؤت کر گئی...
”لوکتے کھانے والوں کو تو شرم نہیں آتی اور میں نے تو پندرہ برس پہلے ایک
دو ماشہ گھوڑا کھایا تھا... مجھے کیوں شرم آئے... میں نے ٹوسٹ منہ میں ڈالا
تو وہ ٹھنڈا ہو کر کتے کے گوشت کی طرح سخت ہو چکا تھا۔“

میرا بہترین دوست غلام رسول

یہ دو چار برس پہلے کی بات نہیں ہے تقریباً تیس برس پہلے کا قصہ ہے۔
سکول کا زمانہ تھا۔ گھر سے سکول جاتے ہوئے ایک ہلکے بخار کی کیفیت طاری
ہوتی تھی۔ اشیاء اور محسوسات کی نئی نئی پہچان ہو رہی تھی اور اگر اس روز گھر
کا کام مکمل نہیں ہوتا تھا ہلکے بخار کے ساتھ ساتھ ٹانگیں بھی کانپ رہی ہوتی
تھیں کیونکہ ”مولا بخش“ ان دنوں متروک نہیں ہوا تھا اور ماسٹر حضرات موقع محل
کی مناسبت سے یا اپنی من مرنی سے اس کا استعمال والہانہ طور پر کیا کرتے
تھے۔ انگریزی اور اردو کی پڑھائی میں ”جواب مضمون“ لکھنا بے حد اہمیت کا حامل
تھا۔ دوسرے سوالوں کی نسبت اس کے نمبر بھی زیادہ ہوتے تھے چنانچہ جس لڑکے
کو زیادہ سے زیادہ جواب مضمون یاد ہوتے تھے وہی لائق ترین ٹھہرتا تھا ان
جواب مضمونوں میں ”ریلوے سٹیشن“ ”ایک پکنک“ ”میرا بہترین دوست“ ایک
کرکٹ میچ“ ”میرا پسندیدہ استاد“ وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں
جواب مضمون ہی کہا جاتا تھا بعد میں یہ انشائیے بن گئے۔ ہم سب حسب مقتدر
ان جواب مضمونوں کے رٹے لگاتے اور اگر قسمت یا داری کرتی تو ہمارے یاد کیے
ہوئے ان انشائیوں میں سے کوئی ایک سالانہ امتحان میں آجاتا اور ہم بغیر حافیت
پاس ہو جاتے۔ ہمارے انگریزی کے ٹیچر مشتاق نامی ایک لڑکے سے بے حد عزیز
تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ وہ اسے جو بھی جواب مضمون لکھنے کو کہتے وہ کسی نہ کسی

نکال دیا۔

مشائق اور اس کے اگوتے جواب مضمون "میرا بہترین دوست" کی یاد آنے کا سبب شیخ غلام احمد گل صاحب کا ایک خط ہے جو دیر آباد سے مجھے وصول ہوا ہے۔ گل صاحب نے لکھا ہے..... محترم تارڑ صاحب..... آپ کا کالم "ہرفن مولا" کے حوالے سے پڑھا۔ جہاں آپ نے مختلف "مولوں" کی نشاندہی کی ہے وہاں آپ "رولوں" کو بالکل بھول گئے۔ ایک ہوتے ہیں "ہرفن مولا" اور ایک ہوتے ہیں "ہرفن رولا" یہ حضرات اپنے آپ کو دنیا کے ہر موضوع پر اختیار ٹی سمجھتے ہیں۔ اور جو بھی فن سامنے آئے اس میں رولا پادیتے ہیں.... مشائق بے چارہ بھی اپنے زمانے کا ایک چھوٹا سا "ہرفن رولا" تھا۔ اسے صرف ایک مضمون "میرا بہترین دوست" یاد تھا۔ جو وہ ہر مضمون میں فنٹ کر دیتا تھا اور مار کھاتا تھا۔ لیکن آج زندگی کے تمام شعبوں میں بے شمار ہرفن رولا موجود ہیں جنہیں صرف ایک "میرا بہترین دوست" یاد ہے اور وہ اسے پوری زندگی جلسوں، محفلوں اور مضامین میں سناتے رہتے ہیں اور پھر بھی مار نہیں کھاتے۔ ان میں ادیب سیاستدان اور سرکاری افسر سبھی شامل ہیں موضوع "علامہ اقبال اور خودی کا فلسفہ" ہو، مرغبانی میں مرغوں کا مقام" یا "معاشرے میں مذہبیات کی نصرت" وہ دو چار فقرے کہنے کے بعد اپنا "بہترین دوست" نکالتے ہیں اور فنٹ کر دیتے ہیں۔ البتہ ہر ایک کا "میرا بہترین دوست" مختلف ہوتا ہے..... میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں آج ایک نہایت بلند پائے کا کالم "ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی افادیت" کے عنوان سے لکھوں اور قارئین کو اپنی بصیرت اور وسیع مطالعہ کے زور پر متاثر کر لوں۔ تو جناب کالم ملاحظہ فرمائیے..... "ترقی پذیر ممالک میں تعلیم کی افادیت" ایک ایسا موضوع ہے جس پر اگر آج غور نہ کیا گیا تو ہماری آئندہ نسلیں بھی کبھی

طرح اس میں "میرا بہترین دوست" ضرور فنٹ کر دیتا کیونکہ یہ وہ واحد جواب مضمون تھا جو اسے فر فر یاد تھا۔ مثلاً اسے اگر کہا جاتا کہ "ریلوے سیشن پر" مضمون لکھو تو وہ کچھ یوں شروع ہوتا "میں اور میرے ماں باپ چھپو کی ملیاں جانے کے لئے ریلوے سیشن گئے وہاں گاڑی کھڑی تھی اور گاڑی میں میرا بہترین دوست غلام ہول بیٹھا تھا۔ غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں ہے۔ غلام رسول بہت اچھا لڑکا ہے..... غلام رسول...." اگر اسے "میرا پسندیدہ استاد" پر مضمون لکھنے کو کہا جاتا تو وہ کچھ یوں شروع ہوتا "....." ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں ان کے گھر گیا وہاں میرا بہترین دوست غلام رسول بیٹھا تھا غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس..... اور غلام رسول.... وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ جب کبھی "ایک کوکٹ پیج" یا "ایک پکنک" کی باری آتی تو غلام رسول وہاں بھی موجود ہوتا..... ایک روز تنگ آکر ماسٹر افتخار نے کہا "دیکھو مشائق یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر جگہ تمہارا دوست غلام رسول موجود ہو..... آج تم "ہوائی جہاز کا ایک سفر" پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ غلام رسول ہوائی جہاز میں نہیں ہے۔ دوسرے روز مشائق "ہوائی جہاز کا ایک سفر" پر جو مضمون لکھ کر لایا وہ کچھ اس طرح کا تھا..... میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایر پورٹ پر گیا وہاں جہاز کھڑا تھا۔ جہاز کے دوپرتے، ہم اس میں بیٹھ گئے۔ جہاز میں غلام رسول نہیں تھا..... پھر جہاز اڑنے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا تو میں نے دیکھا کہ زمین پر میرا بہترین دوست غلام رسول جا رہا ہے۔ غلام رسول میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس..... اور غلام رسول غلام رسول....." ماسٹر افتخار نے یہ مضمون پڑھ کر مولا بخش پکڑ لیا اور مشائق غریب کا جلوب

کا باڈی کا باڈی

آج اخبار میں ایک سرخی نظر آئی اور ناقابل یقین نظر آئی چنانچہ میں نے آنکھیں جھپک کر اسے دوبارہ پڑھا "پاکستان اور انگلینڈ کے مابین ۲۶ جون کو پہلا کبڈی ٹیسٹ کھیلا جائے گا"۔ میں نے سوچا ضرور کاتب کی غلطی ہے اس کا شین قاف درست نہیں ہے کرکٹ کو کبڈی لکھ گیا ہے کیونکہ دونوں کا آغاز ک سے ہوتا ہے لیکن سرخی کے نیچے خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ نہیں کاتب کا شین قاف تو درست ہے البتہ انگریزوں کی مت ماری گئی ہے اور وہ اپنے اوور کوٹ بھاری اوئی سویٹر جڑا ہیں اور برساتیاں وغیرہ اتار لنگوٹ پہن کبڈی کھیلنے کے لئے میدان میں اتر آئے ہیں اور ہمارے مقابل میں اتر آئے ہیں ظاہر ہے بری طرح مار کھائیں گے لیکن پھر خیال آیا کہ انگریز صاحب بہادر کوئی بھی کام بلا سوچے سمجھے نہیں کرتا اگر جلیا نواز باغ میں دو ہزار بھوسے باسٹروڈ کو بھون کر رکھ دیتا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے اور برطانوی عوام جنرل ڈائر کے لئے ہزاروں پاؤنڈ چندہ جمع کرتے ہیں اور اسے اپنا ہیرو قرار دیتے ہیں۔ تو پھر یہ گورے حضرات کبڈی کی طرف کیسے آگئے تو ہم سے جیتیں گے کیسے۔۔۔۔۔ اس کا جواب اس نکتے میں ہے کہ پہلا کبڈی ٹیسٹ پاکستان میں نہیں بلکہ انگلستان میں کھیلا جا رہا ہے۔ اور مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ماہ جون میں بھی انگلستان موسم بے حد گیلدا اور سرد ہو سکتا ہے چنانچہ ہمارے نوجوانوں کو کبچر بھرے میدانوں میں اتار دیا جائے گا اور وہ ان سرخ بستہ ہواؤں میں کانپنے لگیں گے اور کبڈی کبڈی کہنے کی بجائے "کب کب ڈی

معاف نہیں کریں گی، تعلیم میں افادیت سے کس کا فکرو انکار ہوگا، تعلیم ایک زیور ہے جس کی بہت افادیت ہے۔ اور افادیت وہ چیز ہے جو تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ تعلیم کی افادیت کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ ایک روز میں بازار میں جا رہا تھا کہ وہاں مجھے "میرا بہترین دوست" غلام رسول مل گیا۔۔۔۔۔ غلام رسول میرا کلاس فیلو تھا اس کے تین بھائی بہن ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں ہے۔ غلام رسول بہت اچھا لڑکا ہے۔۔۔۔۔ غلام رسول۔۔۔۔۔ غلام رسول۔۔۔۔۔

"میرا بہترین دوست۔۔۔۔۔ غلام رسول!"



ڈی ڈی "کرنے لگیں گے کیونکہ ان کے دانت بچ رہے ہوں گے۔

ادھر سے انگریز حضرات "کا باڈی کا باڈی" کے نعرے لگائیں گے..... اور یہ وہ نعرہ ہے جو انہوں نے شاہجہان کے عہد میں لگانے کی اجازت چاہی تھی کہ حضور ہم تو ادھر ڈراگھوٹے پھرنے اور کھیلنے آئے ہیں بس اجازت دینے کی دیر تھی وہ برصغیر کے ایک کونے سے "کا باڈی کا باڈی" کرتے دوڑے اور دوسرے سرے تک جا کر کہنے لگے کہ لوجی اب یہ علاقہ ہمارا ہے اور پھر وہ ۱۹۴۷ء تک تنہا اس میدان عظیم میں کا باڈی کھیلتے رہے اور جو کوئی بھی مقابلے میں اترتا اس کے لئے کوئی نہ کوئی جنرل ڈائریٹیاں رکھتے اس دوران یورپ کے میدان میں ہٹلر اتر آیا اور ڈاکٹر کو بوڈی "کے نعرے لگانے لگا..... امریکیوں، روسیوں اور انگریزوں نے مل کر اس نئے کوڈی شاہ کو اکھاڑے سے باہر کر دیا ہمارے دیہات میں کثرت اوقات کبڈی کے کسی اچھے کھلاڑی کا نام کوڈی شاہ پڑ جاتا ہے، دوسری جنگ عظیم میں انگریز ہٹلر جیتنے کے باوجود بڑی طرح "ہف" گئے اور ان کا سانس اکھڑنے لگا..... اور کبڈی میں پکے سانس کی ضرورت ہوتی ہے ادھر غلام قوموں کے سانس مضبوط ہو چکے تھے اور انہوں نے انگریز کوڈی شاہ کو اپنے اپنے ملکوں سے نکال باہر کیا..... اب ایک عرصے کے بعد انگریزوں کو کوڈی کھیلنے کا خیال آیا ہے ظاہر ہے وہ دن گئے جب وہ مد مقابل کے ہاتھ باندھ کر اس کے گرد ناچتے ہوئے "کا باڈی کا باڈی" کہا کرتے تھے اور اپنی فتح کا آپ ہی اعلان کیا کرتے تھے..... اب تو وہ میدان میں آئیں گے اور میرا کالا بے دلدار گوریال نوں پراں کر دو..... کے نعرے گونجیں گے بے شک وہ کیچر بھرے میدانوں میں ہمیں اتاریں اور سرد ہواؤں کے بیچ کھڑا کر دیں جیت ہماری ہی ہوگی کیونکہ ہمارا سانس زیادہ مضبوط ہے ہمارا بدن صحت مند اور جوان ہے اور انگریز کوڈی شاہ اب بوڑھا ہو چکا ہے..... کا باڈی، کا باڈی، کا باڈی۔

میں اوئی اللہ ہو گیا ہوں

مجھ میں جو کچھ بھی رونما ہوا ہے آج صبح ناشتے کے بعد ہوا ہے ناشتے سے قبل میں ایک نارمل پاکستانی تھا۔ اپنی بیوی اور اپنے حال پر صابر و شاکر..... البتہ مرد ہونے پر نازاں اور اس خیال کا اسیر کہ میں اپنی زندگی کے تمام فیصلے خود کرتا ہوں میری بیوی جو کہ صنف نازک ہے اپنی زندگی کے فیصلے کروانے کے لئے میری طرف دیکھتی ہے۔ بہر حال میں بالکل ٹھیک تھا اور نارمل تھا.....

ناشتے کے بعد مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ ایک تو انگریزائیاں بہت آنے لگیں میری بیوی کہنے لگی کہ یہ نئی شرٹ پہن کر آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ اس تعریف پر میں بڑی طرح شرمایا اور میرا چہرہ چند رُخ ہو گیا اور میں نے بجا کر کہا "ہتو جی مجھ سے مزاق نہ کیا کرو..... ہاں" مجھے اتنی شرم آئی کہ اگر مجھے کوئی دودھ مل جاتا تو اسے اوڑھ کر بیٹھ جاتا بلکہ ایک لمبا گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتا۔

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بھی میں نے دروازہ پہلے مقفل کر لیا۔ گھر سے باہر جانے لگی..... میرا مطلب ہے جانے لگا تو ذرا عرف سامحوس ہوا کہ ہائے کیلا جارہا ہوں۔ زمانہ بڑا خراب ہے..... سڑک پر آیا تو نظریں جھکا کر چلنے لگا اور ایک کھمبے سے ٹکراتا ٹکراتا بچا مارکیٹ میں پہنچا تو وہاں پان سگریٹ کی دکان سے ایک گانے کے بول بلند ہوئے نہ تم بے وفا ہو نہ ہم بے وفا ہیں..... یہ گانا سن کر جانے کیوں میں تو زرد ہو گئی..... میرا مطلب ہے ہو گیا اور سوچا کہ یہ دنیا اور یہ دنیا والے اتنے بے وفا کیوں ہوتے ہیں ہائے اتنے بے وفادار توڑ

دیتے ہیں اللہ قسم۔

بس سٹاپ پر پہنچا تو دیوار کے ساتھ چند خواتین بس کا انتظار کر رہی تھیں میں ان کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا کیونکہ دوسری طرف تو گلوڑے مرد کھڑے تھے اور ویدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ خواتین مجھے ویدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہیں اور ان میں سے ایک مائی کہنے لگی۔
”وے بھرا شرم نہیں آتی ادھر جا کر کھڑا ہو مر“..... چنانچہ میں مجبوراً ادھر کھڑا ہو مر گیا۔ بس آئی تو تقریباً خالی تھی۔ میں آرام سے ایک نشست پر بیٹھ گیا۔ اگلے سٹاپ پر ایک نوجوان بس کے اندر آیا اور کمینڈ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً اسے کہا آپ ادھر بیٹھو جی ہمارے ساتھ نہ بیٹھو..... وہ قدرے حیران تو ہوا لیکن اٹھ کر اگلی نشست پر جا بیٹھا میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میری آواز کچھ سرلی ہوئی جاتی ہے.... آپ کا کیا خیال ہے کہ میں مذاق کر رہا ہوں اور یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں ہوا..... اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ بالکل یہی واردات ہوئی ہے..... جب شہر پہنچا تو رش بہت تھا اور مجھے پچ بچا کے گزرنا پڑا پھر بھی ایک دو کندھے لگ گئے..... میوہسپتال کی دیوار کے ساتھ پرانے فرکوں اور دیگر نیم خیز ملبوسات کی فروخت جاری تھی۔ میں جانے کیوں خاصی دیرو ہیں کھڑا انہیں بے حد دلچسپی اور اپنا بیٹ سے دیکھتا رہا۔

دکان پر بھی حالات کچھ مختلف تھے مثلاً ایک چھوٹے سے چوہے کو دیکھ کر میں اچھل پڑا اور ”اوئی اللہ کہہ کر کرسی پر چڑھ گیا..... مجھے جب گرمی کی وجہ سے نیند آنے لگی تو جھائیوں کی بجائے انگڑائیاں لینے لگا..... جی ہاں آج سارا دن میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ان دنوں جو ناول لکھ رہا ہوں اس کا کوئی زمانہ کر دہ مجھ پر حاوی ہو رہا ہے لیکن جب میں نے بے اختیار ہوا میں اترتا جاؤں

لال دوپٹہ ملل کا..... ہو جی!..... قسم کا فلمی گانا گنگنا نا شروع کیا تو جان گیا کہ بقول شیکسپیر ”سم تھینگ از رائن ان دی سٹیٹ آف ڈنمارک“..... مجھے کچھ ہوا گیا ہے۔

مجھ میں کچھ تبدیل ہونے کو تھا کچھ رونما ہو رہا تھا..... لیکن کیا؟ ناشتے سے پیشتر میں ایک نارمل پاکستانی مرد تھا اور ناشتے کے بعد..... اب آپ سے کیا پرودہ رہا ہے اللہ کہ آج ناشتے کے دوران میں نے مندرجہ ذیل خبر پڑھی تھی.....
”رنگون سری لنکا کے ایک طبی ماہر نے اس قیاس کو لاطینی پر مبنی قرار دیا ہے کہ عورت صنف نازک ہوتی ہے ڈاکٹر ڈینس جے الوئیس نے ایک سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہر مرد اپنی زندگی کے ابتدائی بیس سال ماں کی نگرانی میں گزارتا ہے اس کے متعلق سارے فیصلے ماں کرتی ہے اور شادی کے بعد ان فیصلوں کا اختیار بیوی کے پاس چلا جاتا ہے یہ کام بیوی وہیں سے شروع کرتی ہے جہاں سے ماں چھوڑتی ہے، خلیج سے شائع ہونے والے ایک جریدے کے مطابق ڈاکٹر الوئیس نے کہا کہ بعد ازاں اس اختیار میں بیٹی بھی شریک ہو جاتی ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ عورت نہیں بلکہ مرد صنف نازک ہے“

اور تب سے میں اوئی اللہ اور بائے اللہ ہوا جا رہا تھا مجھ سے دھوکا ہوا فریب ہوا میں لٹ گیا لوگو..... مجھے یہی کہا جاتا رہا کہ عورت صنف نازک ہے اور آج اس عمر میں جب بال تیزی سے سفید ہو رہے ہیں مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ میں اوئی اللہ ہوں اور صنف نازک ہوں..... اف اللہ ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

دس ہزار کی کال

ان دنوں دس ہزار روپے کی ٹیلی فون کال "نامی خبر کی بڑی دھوم ہے۔ یہ خبر کچھ یوں ہے ہالینڈ میں مقیم ایک پاکستانی نے سمندری میں مقیم اپنے کسی عزیز سے گپ شپ لڑانے میں ٹیلی فون کال پر دس ہزار روپے سے زائد رقم خرچ کی یہ ٹیلی فون کال چار گھنٹے پانچ منٹ تک جاری رہی اس دوران فیصل آباد سے سمندر پار تمام ٹریفک معطل رہی ٹیلی فون اپریٹرنے کال ختم کرنے کے لئے بار بار درخواست کی اور بالآخر تنگ آکر خود ہی کال منقطع کر دی۔

پہلی دھوم اس بات کی ہے کہ وہ کونسا ایسا شیر دلیر امیر کبیر شخص ہے۔ جس نے اپنے کسی عزیز کے ساتھ صرف گپ شپ لگانے کے لئے دس ہزار روپے اڑا دیئے چونکہ غیر ملکی کالوں کا کچھ تجربہ اس ناپیز کے پاس بھی ہے اس لئے پہلی دھوم کی وجہ بیان کرتا ہوں..... ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے آپ ریسپونڈ اٹھاتے ہیں.....

"ہاں جی کی حال چال اسے؟"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"جی میں ٹمر قندی بول رہا ہوں"

"شکر قندی؟"

"نہیں ٹمر قندی..... بھٹی کمال ہے پہچان ہی نہیں رہے ہیں ایک مرتبہ

پاک ٹی باؤس میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"جی فرمائیے"

"فرمائیے کیا بس حال چال پوچھنا تھا..... میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا کہ ان دنوں باہر جانے کے چکر میں ہوں؟ اب مجھے کوئی ایک صاحب بخوڑے سے یاد آئے ہیں جو غالباً ٹمر قندی یا تاشقندی وغیرہ تھے۔

"جی جی یاد آگیا..... تو پھر آپ باہر گئے تھے؟"

"باہر گئے کیا میں تو باہر ہی ہوں..... نیویارک سے بول رہا ہوں کیا حال ہے؟"

"بس ٹھیک ہوں..... لیکن..... خیریت ہے ناں"

"بالکل خیریت ہے آپ سنائیں؟"

میں ان کو سناتا ہوں وہ پھر حال چال پوچھتے ہیں میں بتاتا ہوں اور بالآخر تقریباً آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد پوچھتا ہوں "ٹمر قندی صاحب..... آپ کو ٹیلی فون چار جز بہت پڑ رہے ہوں گے..... میں فون بند کر دوں؟"

"اجی نہیں جناب فکر نہ کریں ایک پارٹی پر آیا تھا..... فون دیکھ کر خیال آیا کہ پاکستان کے دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگائی جائے..... آپ بات کریں..... مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ سب شراب پی رہے ہیں اور کیا حال ہے؟ ایک روز ٹیلی فون کی گھنٹی بجی میں ریسپونڈ اٹھا کر "ہیلو" کہا تو دوسرے آواز آئی "باؤ علم دین ہے نا؟"

"میں نے کہا" باؤ علم دین؟ قبلہ آپ نے غلط نمبر پر فون کیا ہے؟"

"آپ کون بول رہے ہیں؟"

”میں باؤ مستنصر بول رہا ہوں“

”لاہور سے“

”جی ہاں“

”میں ناروے سے ماجھا ساٹھیں بول رہا ہوں لاہور کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ہے لیکن میں باؤ علم دین نہیں ہوں“

”اوجی کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے لاہور کا حال چال پوچھنا تھا آپ سے پوچھ

لیتے ہیں اور تو جی بڑی..... سردی پڑ رہی ہے برفاں ہی برفاں لاہور میں کیا حال ہے؟“

”یہاں بھی سردی ہے“

”گٹھڑ چھو لے بک رہے ہوں گے..... سری پائے اور علیاں“

”ہاں جی بک رہے ہیں“

”لاہور کی کیا بات ہے..... ہور کی حال چال اے؟“

ماجھا سائیں نے بھی کم از کم آدھ گھنٹہ مجھ سے بات کی اور ظاہر ہے کسی

نارویجین یا پاکستانی دوست کے ٹیلی فون سے۔

اس خبر کے بارے میں دھوم یہ ہے کہ آخر چار گھنٹے اور پانچ منٹ تک کیا گپ شپ ہو سکتی ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی بھی اتنا عرصہ صرف گپ شپ لڑاتا رہے..... لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ ”کا کا ہوا ہوگا“..... اور اس ”کا کا“ کی تفصیل کچھ یوں ہے..... ہمارے ایک دوست جو خیر سے ماہر معاشیات ہیں پورپ میں رہائش پذیر ہونے کے شوق میں ہالینڈ چلے گئے وہاں ایک طویل عرصہ بیکاری کاٹی پھر ٹیکسی چلائی اور بالآخر مترجم کے طور پر امیگریشن ڈیپارٹمنٹ

میں ملازم ہو گئے انہی دنوں ہالینڈ کے محکمہ پولیس نے ان کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہالینڈ میں ایک سکھ کے بارے میں انہیں شک تھا کہ وہ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے ان کے پاس اس سکھ کی ایک طویل گفتگو کا ٹیپ تھا جو اس نے امریکہ میں مقیم اپنے کسی دوست کے ساتھ ٹیلی فون پر کی اب ہالینڈ پولیس یہ چاہتی تھی کہ یہ ٹیپ جو کہ ظاہر ہے پنجابی زبان میں تھی ہمارے دوست سنیں اور انہیں بتائیں کہ منشیات کے کاروبار کے بارے میں کیا گفتگو ہوئی..... کتنے لاکھ ڈالر کا لین دین ہوا اور کون کون سے بین الاقوامی گروہوں کے نام اس میں آئے ہیں..... ہمارے دوست کے سامنے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا گیا گفتگو کچھ اس قسم تھی۔

”اوشے بنت سنگھ ہے؟“

”اوشے تو کون ہے؟“

”میں دسا کھی سنگھ ہوں“

”اچھا..... کیا بات ہے؟“

”نہ تو بنتا سنگھ ہی ہے ناں؟“

”آہو بول بول.....“

”اوشے میں ہالینڈ سے بول رہا ہوں تو امریکہ والا بنت سنگھ ہی ہے ناں“

اوشے تو تو ہمارا یار ہونا“

”آہو..... یہ بات ہے کہنے کی..... ہا اور کس کے یار ہیں“

”پر تو بنت سنگھ ہی ہے ناں؟“

”ہور کیا رنجیت سنگھ ہوں..... اوشے تو بول بول“

”یار کا کا جو ہے..... ہدھامیاں ہوں تجھے“

”ہیں..... ہو گیا ہے..... کیا کہا کیا ہو گیا ہے؟“

”اؤے کا کا ہو گیا ہے“

”پر کس کو ہو گیا ہے؟“

”اؤے تیری برہائیاں کو..... بدھائیاں ہوں تجھے“

”پر کونسی برہائی کو“

”یار تیری برہائی کو..... بدھائیاں ہوں تجھے“

”کا کا برہائی کے ہوا ہے اور بدھائیاں مجھے دے رہا ہے“

”تو اور کس کو دوں؟“

”با..... پر یار یہ کا کا ہوا کس کے ہے..... میرا مطلب ہے.....“

”مت ماری گئی ہے تیری..... اؤے میری بوہٹی کے کا کا ہوا ہے.....“

میرے بھی ہوا ہے“

”ہا تو اس طرح ناں کہ تیرے ہاں بھی ہوا ہے..... بدھائیاں ہوں تجھے“

”کا کے“ کے بارے میں یہ گفتگو پورے دو گھنٹے چلتی رہی اور جب ہالینڈ

پولیس کو میرے دوست نے بتایا کہ جناب یہ سردار صاحب بالکل بے گناہ ہیں اور انہوں

نے ٹیلی فون پر اپنے ایک عزیز دوست کو صرف یہ بتایا ہے کہ ان کے بیٹا تولد

ہوا ہے تو پولیس والوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ پورے دو گھنٹے میں ایک شخص

آخر کتنی مرتبہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس کے گھر کا کا ہوا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہالینڈ میں مقیم پاکستانی نے اپنے پاکستانی عزیز کو بھی چار گھنٹے

اور پانچ منٹ میں یہی بتایا ہو گا کہ اس کے گھر کا کا ہوا ہے بدھائیاں ہوں۔

گزارا نہیں ہوتا

”یار گزارا نہیں ہوتا“

”ہاں یار گزارا نہیں ہوتا“

شکیل میرا کلاس فیلو تھا۔ میں برس بعد راہ چلتے ملاقات ہو گئی۔ بلکہ صرف میری چلتے چلتے ملاقات ہو گئی کیونکہ میں پیدل چل رہا تھا اور وہ پوٹھی ایک سپورٹس کار میں وہاں سے گزر رہا تھا۔

اب ہم گھر کے ایک چینی رستوران میں چکن کارن سوپ دھیرے دھیرے

سپ کر رہے تھے۔ اور اپنی داستانِ حیات بیان کر رہے تھے۔ اور اس داستان کے

ہر دوسرے فقرے کے بعد وہ کہتا: ”یار گزارا نہیں ہوتا“ اور میں زور زور سے سر

ہلا کر اس کی تائید کرتا کہ ”ہاں یار گزارا نہیں ہوتا“ شکیل ہر پانچ منٹ کے بعد کسی

نئی اور انہونی سی چینی ڈش کا آرڈر دے دیتا۔ اور جو نہی وہ چنگی بجا کر وینر کو اپنی

جانب متوجہ کرتا میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کیونکہ یہ ابھی تک طے نہیں ہوا تھا کہ بل کون

ادا کرے گا۔ اگرچہ پُرانے دوستوں میں سودو سو روپے کا بل تو نہایت واجب سی رقم

ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یو نہی پیدل جا رہا تھا اور اس قسم کا بل ادا

کرنے کی میری ”تیاری“ نہ تھی۔ بس ایک دو نوٹ تھے میری جیب میں جو قدرے

معمولی نوعیت کے تھے۔ بہر حال ہم باتیں کرتے رہے اور کھاتے رہے اور مہنگائی

کا رونا روتے رہے۔

”یار گزارا نہیں ہوتا“ اس نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

میں نے حسب معمول سر ہلا کر کہا ”ہاں یار گزارا نہیں ہوتا دس کے نوٹ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔“

شکیل نے سراٹھایا۔ مجھے غور سے دیکھا اور ہنسنے لگا دس کا نوٹ؟..... کیا وہ ابھی تک سرکولیشن میں ہے؟

”ہاں..... ہے“ میں نے اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

اس نے چنگی بھائی اور ویش کو بلا کر ایک اور ڈش کا آرڈر دے دیا۔ میں نے پوچھا کہ ان ڈھیر ساری ڈشوں کا آخر ہم نے کرنا کیا ہے، کھا تو نہیں سکتے۔ وہ کہنے لگا، سبھی کو چکھتے ہیں جو مزیدار ہوگی وہ کھالیں گے۔

میں نے کہا تو باقی خوراک جو بچ جائے گی اس کا کیا ہوگا۔ وہ بولا بھی ہوئی غورک ریسٹوران کے کچھوڑے میں رکھے ڈرم میں پھینک دی جاتی ہے۔ اور اسے کتے اور بلیاں وغیرہ کھا لیتے ہیں ضائع نہیں جاتی۔

شکیل کا باپ سائیکل پنچر کا کاروبار کرتا تھا اور نسبت روڈ کے گندے نامے کے کنارے پر بیٹھ کر کرتا تھا شکیل ان دنوں چھپو تھا۔ اور اس کی غربت چھپانے نہیں چھپتی تھی۔ اور اب اس کی امارت مجھ ایسے مثل کلاس کے لئے انتہائی مرعوب کن تھی۔ وہ اتنا دولت مند اور خوشحال کیسے ہوا اور کیوں ہو گیا میں نے نہیں پوچھا۔ کیونکہ شاید اس طرح مجھے اپنی محرومیوں کا احساس تنگ کرتا گزارا تو میرا نہیں ہوتا تھا۔ پھر شکیل کیوں بار بار یہی فقرہ دہرائے چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ میں نے پوچھا یار شکیل تم تو تھیک تھا کہ ہو میرا مطلب ہے کہ..... تمہارا گزارا کیسے نہیں ہوتا۔ وہ ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا کہنے لگا میں بتاتا ہوں کیسے گزارا نہیں ہوتا۔ یہ سپورٹس گار ہے ناں، پونجی ایک..... آٹھ میل فی گیلن کرتی ہے۔ راولپنڈی آنے جانے میں

پندرہ سو روپے کا پٹرول خرچ ہو جاتا ہے۔ ریگیم کے پاس جو کار ہے وہ البتہ بہت معقول ہے۔ گیلن میں بیس میل کرتی ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں یورپ گئے تھے وہاں چار پانچ لاکھ خرچ ہو گیا یہاں گھر کا خرچہ ایک لاکھ سے کم نہیں بجلی بہت مہنگی ہے، چھ ایرکنڈیشنروں کا حساب کر لو پھر سو روپے فی ایرکنڈیشنز..... آمدن نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور تم پوچھتے ہو کہ کیسے گزارا نہیں ہوتا..... ملاقات کے اختتام پر شکیل نے بل اوکيا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ ان دنوں ہوتلوں میں کم از کم دس کا نوٹ سرکولیشن میں نہیں رہا۔

ہم باہر آئے اور شکیل دوبارہ ملنے کے وعدے کے ساتھ میری کمر پک مہینہ تپکی کے بعد چلا گیا۔

اسی شام فی باؤس میں ایک ادیب دوست سے ملاقات ہو گئی میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگا یار گزارا نہیں ہوتا۔ میں نے پوچھا اب بھی نہیں ہوتا پہلے تو کوئی معمولی سی ملازمت کرتے تھے اب لیکچرر ہو..... وہ کہنے لگا، چار ہزار تنخواہ ہے۔ چار ہزار کی تیوٹنیں کرتا ہوں اور پھر بھی گزارا نہیں ہوتا۔ میں سوچ میں پڑ گیا یا خدا گزارا تو مجھ ناتواں کا نہیں ہوتا اور وہائی یہ لوگ دے رہے ہیں۔

اگلے روز چھٹی تھی میں مکان کے باہر کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہا تھا اور دھند آلود خنک دھوپ میں سانس لے رہا تھا۔ ایک خمیدہ کمر لیکن مضبوط ہڈیوں کا بوڑھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر قریب آیا اور کہنے لگا۔ باؤجی روٹی مل جائے وہ شکل سے گدا گرد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے سوچا ایک شریف آدمی کو روٹی کھلانے سے ثواب نہیں ہوتا اس لئے میں نے ماتھے پر ہتھیلی جاکر کہا، بابا معاف کرو، وہ چلا گیا بلکہ چلنے لگا۔ میری بیوی جو گیت پر سے جھانک رہی تھی بولی۔ عجیب شخص ہو۔ کوئی روٹی مانگے تو کبھی انکار نہیں کرتے۔ میں نے کہا بچی ہوئی ہے کہنے لگی پکا

یہی ہوں تم بابے کو پکڑ لاؤ۔

بیگم نے دو موٹی موٹی روٹیاں پکائیں۔ فرج میں سے سالن نکالا اور گرم کر کے پلیٹ میں ڈال دیا۔ بابا روٹی کھا تا رہا اور میں اسے بغور دیکھتا رہا تاکہ وہ ہماری پلیٹ لے کر چمپت نہ ہو جائے میں نے پوچھا، بابا کہاں سے آ رہے ہو؟

کہنے لگا، رائے ونڈ سے آ رہا ہوں۔ فیصل آباد جانا ہے۔۔۔۔۔ صبح سویرے چلا تھا جیب میں لاہور سے فیصل آباد تک کا کرایہ تھا اس نے پیدل آ رہا ہوں اب یہاں سے بادامی باغ چلا جاؤں گا بسوں کے اڈے پر بھوک لگی۔ اور بندہ دس پنڈرہ میل پیدل چلے تو لگ جاتی ہے۔ باؤجی اگر بازار سے دو روپے کی روٹی کھا لیتا تو توچہ شہزادہ تک پیدل جانا پڑتا۔ کسی گھر سے روٹی مانگ لینا تو بڑی بات نہیں ہوتی گاؤں میں تو ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔۔۔۔۔

بابے نے روٹی ختم کی، مونچھیں صاف کیں اور دعائیں دیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا وہ جانے لگا تو میں نے اس سے پوچھا بابا تمہارا گزارا ہو جاتا ہے؟ پہلے تو وہ میرے سوال کو نہ سمجھا پھر میں نے قدرے تفصیل سے بتایا تو کہنے لگا، باؤجی گزارا ہوتا نہیں کرنا پڑتا ہے اللہ نے صحت دی ہے کبھی بھوکا نہیں رہا۔ بال بچے آباد ہیں بڑی موج ہے۔۔۔۔۔ بڑا سوہنا گزارا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ سلام لیکم!

(پاکستان ٹیلی ویژن سے ڈرامائی تشکیل ٹیلی کاسٹ کی گئی)